مولانا سلمان حسینی کے عقائد
جمہور اہلِ سنت کے میزان میں

مرتب
عرفان نصر فاروقی ندوی

مولانا سلمان حسینی کے عقائد
جمہور اہلِ سنت کے میزان میں

مرتب

عرفان نصر فاروقی ندوی

باہتمام

محمد طاہر احسان

Maulana Salman Husaini Ke Aqaid
Jamhoor Ahle Sunnat Ke Meezan Mein

Compiled by:
Irfan Nasr Farooqui Nadvi

Edition : **2019**
Pages : **320**

گزارش: ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ کتاب میں کوئی غلطی باقی نہ رہے پھر بھی اگر کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرمائیں، تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاکم اللہ

ناشر

504/119, Tagore Marg, Daliganj, Lucknow-20 (U.P.)
Ph. : 0522-2742842 M. : 9793118234, 9335982413
E-mail : maktabaahsan1@gmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف اولیں

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نہایت برگزیدہ گروہ اور محترم جماعت ہے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت کا شرف حاصل ہوا ہے، ان کی عدالت وثقاہت، اخلاص و بے لوثی، امانت ودیانت اور صدق وراستی پر امت کا اجماع ہے، یہ وہ مقدس گروہ ہے جس کی تقدیس وتعظیم امت کا سرمایۂ افتخار اور باعثِ نجات ہے، یہ طائفہ مبارک ہر قسم کی تنقید وتبصروں سے بالاتر ہے، علمائے امت نے ہمیشہ ہر زمانہ میں دین وشریعت کے باب میں ان کو لائق اعتماد گردانا ہے، شرفِ صحابیت کے ثبوت وتحقق کے بعد ان کی تقدیس وتنزیہ کو جزء ایمان قرار دیا ہے اور ان کو نقد وتمحیص کی کسوٹی سے بالاتر قرار دیا ہے، خود قرآن کریم ان کی عظمت ووثقاہت کا گواہ ہے، رسول انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جا بجا ان کی ثنا خوانیاں کی ہے۔

لیکن افسوس کہ امت مسلمہ کے اہلِ تشیع کے طبقہ کی جانب سے ان پاکیزہ ہستیوں کو ہر زمانہ میں متہم کرنے اور ان کی سیرت وکردار پر کیچڑ اچھالنے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں، اور علمائے امت نے بہت خوش اسلوبی سے ان کوششوں کو ناکام بنایا ہے اور مخالف فتنوں کی سرکوبی بہت جوش وحمیت کے ساتھ کی ہے، ہر اشکال کا دنداں شکن جواب دیا ہے، ان کی نگارشات وکتابیں اس امر کی شاہد عدل ہیں۔

استاد محترم مولانا سید سلمان حسینی ندوی صاحب کی کتابیں اور تحریریں جو ابھی حال ہی میں طبع ہوئی ہیں، بلا شبہ شیعی فکر وعقیدہ کی ترجمان ہیں، ان کتابوں نے اس احساس کو اور تازگی عطا کی ہے کہ اس موضوع پر کوئی مفصل اور علمی رد ہونا چاہئے، اور صحابہ کرام کے عظمت ومقام سے امت کو واقف کرانا ضروری ہے، مبادا امت مسلمہ فتنوں سے دوچار ہوجائے، کیونکہ مولانا محترم نے اپنی تحریر وتقریر کے ذریعہ اسی قبائے عظمت کو تار تار کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے، جس کی امت نے صدیوں سے حفاظت کی ہے، اور جس کی وجہ سے بادِ سموم کے مخالف تھپیڑوں میں بھی اپنے ایمان وعقیدہ اور اسلامی شریعت کی حفاظت کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے، واقعہ یہ ہے مولانا محترم کی بیس صفحات پر مشتمل تحریر جو ''ازالہ کے ازالہ،، کے نام شائع ہوئی ہے، نہایت تشکیکی

اور فتنہ پرور کتاب ہے، اس کتاب میں انہوں نے صدیوں کا زہر کشید کر کے رکھ دیا ہے۔

ہماری یہ کتاب اسی احساس کا مظہر ہے، اور شیعی زہر کا تریاق ہے، اس کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ امت مسلمہ صحابہ کرام پر ہونے والے ہمہ جہت اعتراضات، اور ان کے جوابات سے واقف ہو، ان کے مقام و مرتبہ پر علی وجہ البصیرۃ ایمان رکھے، اور عقلی وجذباتی طور پر اہل ایمان کا دل صحابہ کرام کی عظمتوں کا اعتراف کرے، یہ کتاب اگرچہ مولانا سید سلمان حسینی ندوی کی غلط بیانیوں اور تلبیسات وتدلیسات کے جواب کے طور پر لکھی گئی ہے، لیکن اس کا مقصود اظہار علم وفضل نہیں اور نہ ہی کسی مخاصمت اور ذاتی نزاعِ کی غرض سے تحریر کی گئی ہے، بلکہ ان کے افکار ونظریات کو صحیح سمت دینے کی ایک ادنی کاوش ہے، یہ ایک سنجیدہ علمی مجادلہ ہے جس میں دلائل وشواہد کے اعتبار سے کسی کوتاہی کا رہ جانا قرین قیاس ہے حتی الامکان اس بات کی کوشش کی گئی ہے زبان وبیان میں ادب واخلاق کا دامن نہ چھوٹنے پائے، مولانا محترم کی سیرت وکردار کے حوالہ سے کوئی نازیبا تبصرہ نہ درآنے پائے، اس سب کے باوجود اگر قاری کو کہیں اس بات کا احساس کو ہو کہ انداز واسلوب میں رکاکت ہے، یا لب ولہجہ میں دھیمہ پن ووقار باقی نہیں رہا، یا اسلوبِ بیان میں ادب وشائستگی کا دامن ہاتھ سے جاتا رہا ہے، تو اس کا سبب یقیناً اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کہ صحابہ کرامؓ پر الزامات ایسے سنگین عائد کئے گئے ہیں جس میں حدِ ادب کو برقرار رکھ پانا ہمارے لیے مشکل ہو گیا ہوگا، پھر بھی ہمیں مطلع کیا جائے انشاء اللہ آئندہ اڈیشن میں اس کی اصلاح کر لی جائے گی۔

اخیر میں استاد محترم مخدومنا مفتی عتیق صاحب قاسمی بستوی استاد فقہ اسلامی دار العلوم ندوۃ العلماء کے ہم نہایت شکر گذار ہیں کہ انہوں نے کتاب کے مندرجات پر نگاہ کرم فرمائی، اور حوصلہ افزائی کے کلمات پر مشتمل ایک بیش قیمت تحریر سپردِ قلم فرمائی، واقعہ یہ ہے کہ یہ تحریر مجھ جیسے کوتاہ علم وہنر کیلئے ایک سند اور اعزار کی بات ہے، اسی طرح ہم نہایت شکر گذار ہیں مخدومنا مفتی عبید اللہ اسعدی شیخ الحدیث جامعہ عربیہ ہتورا باندہ کے کہ انہوں نے اپنے بیش قیمت مقدمہ اور اس موضوع پر محیط ایک جامع تحریر سے ہمیں نوازا، جو اس کتاب کے ضمیمہ کے طور پر شامل ہے، اللہ رب العزت ان دونوں بزرگوں کے ساتھ ساتھ تمام اساتذہ کرام، بزرگان دین کا سایہ عاطفت تادیر ہم پر قائم رکھے، اور ان کے علم وفضل اور تجربات سے کسبِ فیض کرنے کی سعادت نصیب فرمائے۔ آمین۔

عرفان نصر فاروقی ندوی

تقریظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على محمد ن المصطفى خاتم النبين وعلى آله و أصحابه أجمعين، أما بعد

خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کا مقام ومرتبہ قرآن وسنت ہے دو دو چار کی طرح واضح فرمادیا ہے، کتاب وسنت جو دین کے دو بنیادی ماخذ ہیں انہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر سمجھ کر اور یاد کر کے اگلی نسلوں تک منتقل کرنے کا عظیم کام جماعت صحابہ نے انجام دیا، حضرت عبداللہ ابن سعود رضی اللہ عنہ جو خود جماعت صحابہ کے ایک ممتاز فرد تھے انہوں نے صحابہ کی خصوصیات پر اختصار اور بلاغت کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا ہے:

من كان مستناً قليستن بمن قد مات فإن الحيّ لاتومن عليه الفتنة، أولئك أصحاب محمد كانوا أفضل هذه الأمة، أبرها قلوبًا و أعمقها علمًا و أقلها تكلفًا، اختارهم الله لصحبة نبيه ولإقامة دينه، فاعرفوا لهم فضلهم واتبعوهم على اثرهم وتمسكوا بما استطعتم من أخلاقهم و سيرهم فإنهم كانوا على الهدى المستقيم۔ (جامع الأصول فى أحاديث الرسول ج١ ص:٢٩٢، و جمع الفوائد١ ص٢٨)

جو کسی کی پیروی کرنا چاہتے ہیں وہ ان لوگوں کی پیروی کریں جو وفات پا چکے، کیونکہ زندہ شخص کے بارے میں فتنہ کا ڈر ہے۔ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ہیں، اس امت میں سب سے افضل ہیں سب سے زیادہ نیک دل، سب سے زیادہ گہرا علم رکھنے والے، سب سے کم تکلف والے، انھیں اللہ جل شانہ نے اپنے نبی کی صحبت کے لئے اور اپنے دین کو قائم کرنے کے لئے منتخب فرمایا، ان کی فضیلت پہچانو، ان کے نشان راہ کی پیروی کرو، جہاں تک ہو سکے ان کے

اخلاق وسیرت کو اپناؤ، کیونکہ وہ لوگ سیدھے راستے پر تھے۔

خود قرآن کریم میں متعدد مقامات پر صحابہ کے مقام وفضیلت کو بڑے واشگاف انداز میں بیان فرمایا گیا ہے، سورۂ فتح میں ارشاد خداوندی ہے:

"محمد رسول الله والذين آمنوا معه أشداء على الكفار رحماء بينهم تراهم ركعا سجداً يبتغون فضلا من ربهم ورضوانًا سيماهم فى وجوههم من أثرا السجود. ذلك مثلهم فى التوراة ومثلهم فى الإنجيل كزرع أخرج شطأه فأزره فاستغلظ فاستوى عل سوقه يعجب الزراع ليغيظ بهم الكفار. وعدالله الذين آمنوا وعملوا الصالحات منهم مغفرة وأجرا عظيمًا۔ (آیت:۲۹)

محمد اللہ کے پیغمبر ہیں، اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ تیز ہیں کافروں کے مقابلہ میں (اور) مہربان ہیں آپس میں، تو انہیں دیکھے گا (اے مخاطب) کہ (کبھی) رکوع کر رہے ہیں (کبھی) سجدہ کر رہے ہیں، اللہ کے فضل اور رضا مندی کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں، ان کے آثار سجدہ کی تاثیر ان کے چہروں پر نمایاں ہیں، یہ ان کے اوصاف توریت میں ہیں، اور انجیل میں، ان کا وصف یہ ہے کہ وہ جیسے کھیتی کہ اس نے اپنی سوئی نکالی، پھر اس نے اپنی سوئی کو قوی کیا، پھر وہ موٹی ہوئی، پھر اپنے تنے پر سیدھی کھڑی ہوگئی، کہ کسانوں کو بھلی معلوم ہونے لگی، (یہ نشوونما صحابہ کو اس لئے دیا) تاکہ کافروں کو ان سے جلائے، اور اللہ نے وعدہ کر رکھا ہے ان سے جو ایمان لائے ہیں، اور (جنہوں نے) نیک کام کئے، مغفرت اور اجرعظیم کا۔

محدثین اور ناقدین رجال نے بالاتفاق تمام صحابہ کو عادل قرار دیا ہے، صحابہ کرام برح وتنقید سے بالاتر جب کسی راوی کے بارے میں یہ معلوم ہوگیا کہ وہ صحابی رسول ہیں تو زبانیں خاموش ہوجاتی ہیں، کیونکہ صحابہ کی عدالت وثقاہت پر امت مسلمہ کا اجماع ہے۔

صحابۂ کرام انبیاء وملائکہ کی طرح معصوم تو نہیں ہیں کہ ان سے کوئی گناہ سرزد نہ ہوسکے لیکن اللہ جل سانہ نے عموماً انہیں گناہوں سے محفوظ رکھا، اور اگر کبھی گناہ سرزد ہوجاتا تو وہ بے چین ہوجاتے، اور گناہ کے اثرات سے اپنے کو محفوظ کرنے کے لئے اتنا توبۂ واستغفار کرتے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کی طرف متوجہ ہوجاتی، اور گناہ پر ان کی بے چینی نیز توبۂ واستغفار کی کثرت

تقرب الی اللہ کا ذریعہ بن جاتی، اس لئے امت مسلمہ من حیث المجموع انہیں عادل وثقہ دین وایمان کے لئے مخلص اور مقام بلند پر فائز مانتی ہے، کسی صحابی کی تنقیص اور سب وشتم انتہائی سنگین گناہ قرار دیا جاتا ہے، مشہور محدث امام ابوزرعہ رازی نے جمہور اہل سنت کے موقف کی ترجمانی کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:

إذا رأيت الرجل ينتقص أحداً من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم فاعلم أنه زنديق لأن الرسول صلى الله عليه وسلم عندنا حق، والقرآن حق، و إنما أدى إلينا هذا القرآن والسنن أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم، و إنما يريدون أن يجرحوا شهودنا ليبطلوا الكتاب والسنة، الجرح بهم أولى، فهم زنادقه۔ (الكفاية في علم الرواية للخطيب البغدادي ص:۴۹، ط كتب علميه ۱۴۰۹)

جب تم کسی آدمی کو دیکھو کہ کسی صحابی رسول کی توہین کررہا ہے تو جان لو کہ وہ زندیق ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے نزدیک برحق ہے، اور قرآن برحق ہے اور ہم تک یہ قرآن اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے ذریعہ پہنچی ہیں، یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہمارے گواہوں مجروں کردیں، تاکہ کتاب وسنت کو باطل کرسکیں، اور خود ان کو مجروح کرنا زیادہ بہتر ہے، کیونکہ یہ زندیق ہیں۔

صحابہ کرام کے درمیان ہونے والے والے سنگین اختلافات اور باہمی جنگوں (جنگ وجمل اور جنگ صفین) کے بارے میں ائمہ تابعین محدثین وفقہاء کا مجموعی طرز عمل ہی رہا کہ حتی الامکان ان بحثوں میں پڑنے سے اپنے آپ کو روکا جائے، اور کہیں اگر اس پر گفتگو کرنی پڑے تو اس طرح گفتگو کی جائے کہ دونوں جماعتوں کے لئے حسن ظن اور تاویل کا راستہ اختیار کیا جائے، ان مشاجرات کے بارے میں کسی فریق کو متہم کرنا اور اس کی نیت اور ارادے پر حملہ کرنا بالکل ناجائز ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فتح الباری میں لکھتے ہیں:

واتفق أهل السنة على وجوب منع الطعن على أحد من الصحابة بسبب ما وقع لهم من ذلك، ولو عرف المحق منهم، لأنهم لم يقاتلوا في تلك الحروب إلا عن اجتهاد وقد عفا الله تعالىٰ عن المخطي في الاجتهاد، بل ثبت أنه يؤجر أجراً

واحداً، وأن المصيب يؤجر أجرين۔ (فتح الباری ج۱۳ ص:۳۴)

اہل سنت اس بات پر متفق ہیں کہ صحابہ کے درمیان جو مشاجرات ہوئے ان کی وجہ سے کسی پر طعن کرنا ممنوع ہے، اگر چہ یہ جان لیا جائے کہ ان میں سے حق پر کون تھا، چونکہ صحابہ نے وہ جنگیں اجتہاد کی بنیاد پر کیں، اور اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو معاف کیا ہے جس سے اجتہاد میں خطا ہو جائے، بلکہ یہ ثابت ہے کہ اس کو ایک اجر ملے گا، اور درست اجتہاد کرنے والا دوہرے اجر کا مستحق ہوگا۔

☆☆☆☆

چند مہینے پہلے یہ افسوسناک حادثہ پیش آیا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مؤقر استاد مولانا سید سلمان حسینی ندوی نے بعض جلیل القدر صحابہ کے بارے میں ایسی تقریریں کیں، تحریریں لکھیں اور انہیں سوشل میڈیا پر جاری کیا، جن میں بعض جلیل القدر صحابہ مثلاً حضرت عثمان بن عفان اور حضرت معاویہ بن ابوسفیان وغیرھما رضی اللہ عنھم پر کھلی ہوئی تنقید تھی، اور ان پر بے بنیاد اتہامات عائد کئے گئے تھے، اور مولانا موصوف پر اس موضوع کا اتنا غلبہ تھا کہ وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی درسگاہ میں فضیلت کے طلباء کے سامنے ان مباحث کو پیش کرتے تھے، اور طلباء کو اپنے منحرف افکار ونظریات سے متاثر کرنے کی کوشش کرتے تھے، اور سوشل میڈیا کے ذریعہ پورے ملک بلکہ پوری دنیا میں ان کی یہ منحرف افکار نشر ہو رہے تھے۔

احقر نے یہ بات محسوس کی کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کچھ طلباء بھی ان باطل افکار سے متاثر ہونے لگے، اور صحابہ کرام کے بارے میں ان کے دل ودماغ میں شبہات کے کانٹے چبھنے لگے ہیں۔ خصوصاً جب مولانا موصوف نے چند صفحات کا ایک رسالہ صحابہ کے موضوع پر شائع کیا، جس کا نام تھا ''لفظ صحابہ کے بارے میں غلط فہمیاں'' اس میں موصوف نے صحابہ کرام کے بارے میں اپنے گمراہ کن افکار ونظریات کا خلاصہ پیش کر دیا تھا، اور صحابی کی جو تعریف اہل سنت کے یہاں متفق علیہ ہے اسے بھی کنڈم کرنے کی کوشش کی تھی، یہ رسالہ طلبہ میں تقسیم ہوا اور فروخت ہوا، اس سے ندوہ کے ماحول میں بے چینی پیدا ہوئی، اور یہ خطرہ محسوس کیا جانے لگا کہ کہیں نوجوان طلباء جن کا مطالعہ ادھورا اور ذہن ناپختہ ہے ان منحرف افکار کا اثر نہ قبول کرنے لگیں۔

احقر نے اپنا دینی فریضہ سمجھتے ہوئے اسی صفحات کا ایک رسال اس نام سے ''صحابی کی تعریف اور صحابہ کے مقام ومرتبہ کے بارے میں غلط فہمیاں کا ازالہ'' شائع کیا، اور سوشل میڈیا میں بھی بعض احباب نے ڈال دیا، کتاب کی اشاعت کے بعد میرا بیرون ملک کا سفر ہوگیا، میں نے کتاب میں نہ تو مولانا سید سلمان حسینی ندوی کا نام لیا اور نہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا اور بڑے ہی نرم اور سنجیدہ انداز سے ان افکار کا ناقدانہ جائزہ لے کر مولانا موصوف کے سامنے چار سوالات پیش کئے تھے۔

میری کتاب کی اشاعت کے دو تین بعد ہی مولانا موصوف کے قلم سے میری کتاب کا جواب سوشل میڈیا میں اس عنوان سے آ گیا ''مفتی عتیق بستوی کے ازالہ کا ازالہ''۔

اس کا جواب میں نے اپنی کتاب ''عظمت صحابہ'' میں اختصار کے ساتھ دیا، جو شائع ہو چکی ہے، اس کی تمہید میں میں نے لکھا تھا:

''مولانا موصوف نے میرے رسالہ کی تردید میں بیس صفحے کا جو رسالہ تحریر فرمایا ہے، اس کے پڑھنے سے ایک بات ہر ایک محسوس کر سکتا ہے کہ انھوں نے انتہائی غیض وغضب کی حالت میں بڑی عجلت میں وہ رسالہ لکھا ہے، رسالہ کی سطر سطر سے کبر ونخوت ہویدا ہے، کاش کہ انھوں نے میرا رسالہ کے بارے میں اپنے دل ودماغ کو کچھ غور وفکر کا موقع دیا ہوتا، کم از کم رسالہ لکھنے کے بعد دل ودماغ کے اعتدال کی حالت میں اپنی لکھی ہوئی تحریر کو غور وفکر سے پڑھ لیا ہوتا تو وہ اتنے اندوہناک حادثہ کے شکار نہ ہوتے، میری حقیر ذات کے بارے میں انھوں نے جن ''کرم فرمائیوں'' کا مظاہرہ کیا ہے ان کی کیا شکایت کی جائے، افسوس یہ ہے کہ کبار صحابہ حتی کہ حضرات شیخین (حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ) بھی ان کے ناوک قلم سے محفوظ نہ رہے اور شیعہ حضرات ان کے بارے میں جو سوالات اور اعتراضات متفرق طور پر دہراتے رہتے ہیں ان سب کو مولانا موصوف نے اپنے رسالہ میں جمع کر دیا ہے اور عموماً صحابہ کا ذکر کسی سابقہ (حضرت) اور لاحقہ (رضی اللہ عنہ) کے بغیر کیا ہے، ایسے میں اس حقیر فقیر کے لئے ''مولوی'' کا خطاب کسی بڑے اعزاز سے کم نہیں ہے۔۔ (عظمت صحابہ، ص:۱۹-۲۰)

مولانا موصوف نے اگر میرے سوالات کا جواب دیا ہوتا تب تو انھیں کوئی سوال کرنے کا

حق پہنچتا تھا، لیکن ان سوالوں سے مکمل گریز کرنے کی صورت میں انھیں کوئی سوال کرنے کا حق نہیں، پھران کے تمام سوالات وہ ہیں جو شیعوں کی طرف سے اہل سنت سے کئے جاتے ہیں، اور ان کے تحقیقی جوابات اہل سنت کی ان قدیم وجدید کتابوں التفصیل سے موجود ہیں جو اہل تشیع کے رد میں لکھی گئی ہیں، مثلا حافظ ابن تیمیہ میں کی منہاج النبویہ، شاہ عبدالعزیز دہلوی کی تحفۂ اثنا عشریہ ''نواب محسن الملک کی آیات بنیات، علامہ شبلی کی الفاروق، مولانا سعید اکبرآبادی کی صدیق اکبر، نیز امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات ورسائل، جن سوالات کو مولانا موصوف نے پیش کیا ہے اگر خدانخواستہ ان کے دل ودماغ میں وہ کانٹے کی طرح چبھ رہے ہیں تو ان کے ازالہ کے لئے مذکورہ کتابوں کا مطالعہ کافی ہوگا۔

(عظمت صحابہ ص:۲۰-۲۱)

☆☆☆☆

مولانا سید سلمان حسینی ندوی صاحب نے ۳۴ سوالات قائم کئے تھے جو تمام تر شیعی سوالات واشکالات تھے، اپنی تحریروں اور تقریروں میں انہیں دہراتے رہتے تھے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی درسگاہ میں بھی بار بار پوری قوت سے انھیں پیش کررہے تھے، سوشل میڈیا میں بھی ان کی چیزیں مسلسل آرہیں تھیں۔ جس سے بہت سے حضرات متاثر ہورہے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کی عظمت وتقدس کے بارے میں شبہات کے کانٹے بہت سے ذہنوں میں پرورش پارہے تھے، کیونکہ مولانا موصوف کے شاگردوں، مداحوں اور عقیدت مندوں کا بڑا حلقہ ملک وبیرون ملک موجود ہے جو ان کی بعض خصوصیات خصوصا سحر خطابت اور گرمئ گفتار سے خاصا متأثر ہے، اس لئے اس کی ضرورت تھی کہ ان شیعی سوالات واشکالات کا تعاقب کیا جائے اور علم عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر ان سوالات واشکالات کا اطمینان بخش جائزہ لیا جائے۔

اللہ جل شانہ نے اس عظیم خدمت کی توفیق دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ایک ہونہار فاضل مولانا عرفان نصر فاروقی سلمہ اللہ (مکتبۂ احسان لکھنؤ) کو عطا فرمائی، انھوں نے سوشل میڈیا میں مولانا موصوف کے ایک ایک سوال واشکال کو لے کر اس کا تفصیلی جواب دیا دو تین قسطیں پڑھنے کے بعد ہی اندازہ ہوا کہ مواد اور زبان دونوں اعتبار سے ان کا قسطوار مضمون بڑا فکر انگیز

اور معلومات افزا ہے اور شبہات کی جڑوں کو ختم کرنے والا ہے، ملک و بیرون ملک کے علماء اور اہل قلم نے اس مضمون کو بے حد پسند کیا اور اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کی مضمون نگار سے خواہش کی۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر اس موضوع پر میں خود لکھنا چاہتا تو غالباً اس سے بہتر نہ لکھ پاتا، مولانا عرفان فاروقی نے ہر سوال واشکال کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کی کوشش کی ہے اور تمام دستیاب مراجع سے بڑی مہارت اور سلیقہ مندی سے استفادہ کیا ہے، قلم میں بڑی ادبیت اور سلاست ہے اور موضوع میں ڈوب کر لکھنے کا حق ادا کر دیا ہے۔

موصوف کی یہ پہلی باقاعدہ تصنیفی خدمت ہے جو اس میدان میں ان کے روشن مستقبل کی نشاندہی کرتی ہے، میر دعا ہے کہ اللہ جل شانہ ان کی اس تصنیف کو دنیا وآخرت میں قبولیت سے نوازیں اور جس مقصد کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے اس میں کامیابی عطا فرمائیں۔

(مفتی) عتیق احمد بستوی
استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
۷/ مارچ ۲۰۱۹ء

مقدمہ

مفتی محمد عبید اللہ الاسعدی

شیخ الحدیث جامعہ عربیہ ہتھورا، باندہ، یوپی

حق تو حق ہی ہے جس کا حق اظہار و بیان کے لئے بھی کچھ حقوق و حدود متعین ہیں ان کا لحاظ رکھتے ہوئے اگر حق کا بیان ہو تو اس کی حقانیت وحلاوت نمایاں طور پر سامنے آتی ہے اور مفید ہوتی ہے، اور نہ اس کی حقانیت کڑواہٹ سے بدل کر نقصان وفساد کا باعث بنا کرتی ہے۔

حق کے اظہار و بیان کے لئے ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ جذبہ حق ہو، موقع حق ہو، لفظ بھی حق ہو اور انداز بھی حق ہو۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر ایک فریضہ اور اہم فریضہ ہے مگر اس فریضہ کے لئے بھی کچھ حدود متعین ہیں جیسے شریعت کے دیگر فرائض کے لئے حدود متعین ہیں، کسی بھی فریضہ کی ادائیگی کے لئے اس کے حق میں مقرر کردہ حدود کا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے، ورنہ نماز وروزہ وغیرہ ارکان اسلام بھی رد وغیر معتبر ہو جاتے ہیں اور امر ونہی بھی اپنا کام کرنے کے بجائے کچھ اور کرتا ہے، ہر جگہ، ہر حال میں، ہر ایک کے لئے یہ کام مناسب کیا جائز ودرست بھی نہیں ہوتا۔

ہر حق بات کہنے کی نہیں ہوتی اور بسا اوقات ایک سے دوسرے یا تیسرے تک بھی پہنچانے کی نہیں ہوتی، کبھی مطلقاً، ہر حال میں اور کبھی کم از کم ایک زمانہ اور ایک وقت تک۔

ہر سوال قابل جواب نہیں ہوتا اور نہ ہر اعتراض لائق دفاع ہوتا ہے، ایک سوال کا جواب دیا جاتا ہے اور دوسرا اذا مروا باللغو مروا کراما (لغو باتوں کے پاس سے جب وہ لوگ گذرتے ہیں تو شرافت سے (خاموش وصرف نظر کر کے) گذر جاتے ہیں اور خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما (اور جاہل لوگ جب ان سے تعرض کرتے ہیں تو وہ سلام کر کے نکل جاتے ہیں) کے تحت چلا جاتا ہے۔

ایک اعتراض واشکال کے ازالہ کے لیے اتنا اہتمام کیا جاتا ہے کہ متعلقہ لوگوں کو جمع کیا جاتا ہے اور بات کو ان سے سمجھا جاتا ہے اور پھر ان کی تسلی کا سامان ایسا کیا جاتا ہے کہ وہ پہلے سے زیادہ خوش ومنشرح ہوجاتے ہیں اور دوسرے اشکال کو سن کر صرف نظر کیا جاتا ہے اور بسا اوقات ایک لفظ زبان سے نہیں نکلتا یا نکلتا ہے تو صرف نظر کا۔

حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اپنے بلند ترین مقامات اور عظمتوں کے باوجود انبیاء کی طرح معصوم نہیں تھے، اگر چہ محفوظ ضرور تھے، ان سے کچھ ایسی باتیں ضرور ہوئیں جو ان کے شایان شان نہیں تھیں اور ان چیزوں میں بھی بڑی حکمتیں رہیں کہ ان سے امت کو بہت سے احکام بھی ملے، لیکن حضرات صحابہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دین لے کر آگے بڑھانے کی جو ذمہ داری تھی اور انہوں نے اس ذمہ داری کو جس طرح پورا کیا علماء امت نے اس کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا کہ حضرات صحابہ سے صادر ہونے والے ایسی چیزوں کا تذکرہ نہ کیا جائے کسی بھی عنوان و بہانے سے اور یہ اس لئے کہ ان کے شایان شان احترام وعظمت امت کے دلوں میں قائم و برقرار رہے جیسے انبیاء کو عصمت کا مقام دے کر اس سے بڑھ کر ان کے احترام وعظمت کو محفوظ فرمایا ہے۔

اب اگر صحابہ کی کمزوریوں کو کسی بھی عنوان سے تحقیقی ہو یا کچھ اور تحریر وتقریر کا موضوع بنایا جائے گا اور اس کا برملا اظہار کیا جائے گا، کتابوں میں، رسالوں میں، جلسوں میں اور آج کے دور میں جب کہ نشر واشاعت کے ادارے وذرائع آج ہر ہاتھ میں ہیں تو یہ باتیں عوام کے درمیان پہنچ کر امت کو کیا پیغام دیں گی۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ آج عوام میں وہ پڑھے لکھے وہ ذی شعور لوگ بھی داخل ہیں جو دین کے بنیادی مسائل واحکام کا مضبوط اور تفصیلی وتحقیقی علم نہں رکھتے، انگریزی تعلیم یافتہ ہوں یا آج کے عام فضلاء مدارس جو عموماً ناپختہ ہوتے ہیں اور جو معروف علماء واساتذہ کو بڑی عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کی باتوں پر اعتماد کرتے ہیں۔

ایسی باتیں کوئی اچھا پیغام نہیں دیتیں، بلکہ فتنہ کا باعث ہوتی ہیں، عوام کا دین وایمان خراب ہوتا ہے، اپنے مقتداؤں سے ان کا اعتماد اٹھتا ہے۔

عجیب بات ہے کہ لوگ مختلف عناوین سے حضرات صحابہ کی ان باتوں کو نقل کرتے ہیں جو ان سے بشریت کے تحت کسی وقت صادر ہو گئیں اور کہتے ہیں کہ وہ ایسے تھے اور یہ کرتے تھے، جس میں یہ بھی شامل ہے کہ بعض عربی الفاظ کے ایک خاص مفہوم میں جو برا سمجھا جاتا ہے زیادہ استعمال ہونے کی وجہ سے اس کی نسبت ان کی طرف کرتے ہیں مثلاً بعض روایات میں صحابہ کی آپس کی گفتگو میں کذب اور کذبت کا لفظ آ گیا اور سمجھا گیا کہ اس کے معنی بس وہ ہیں جس کو ہم جھوٹ کہتے ہیں تو بے تکلف کہہ دیا کہ صحابہ بھی جھوٹ بولتے تھے یا ایک دوسرے کی تکذیب کرتے تھے، جب کہ اس لفظ کے معنی متعین پر جھوٹ بولنے کے نہیں یا وہ نہیں جس کو ہم جھوٹ کہتے ہیں۔

بلکہ اس کے معنی ہیں ''خلاف واقعہ بات کا زبان سے نکالنا'' جس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ آدمی کی زبان سے کوئی بات خلاف واقعہ زبان سے نکلے لیکن قصداً نہیں بلکہ کسی غلط فہمی وغیرہ کی بنا پر، ایسی صورت میں ''کذب'' کا ترجمہ ''غلط بولنا اور غلط کہنا'' وغیرہ سے کیا جاتا ہے۔

اور دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی قصداً جان بوجھ کر خلاف واقع کوئی بات اپنی زبان سے نکالتا ہے، اس کو جھوٹ کہتے ہیں جس کی شریعت میں بڑی مذمت آئی ہے۔

صحابہ کی نسبت سے تو اس کا تصور ہی نہیں کہ ان کی عدالت ایک مسلمہ ہے جس میں جھوٹ کی کوئی گنجائش نہیں اور صحابہ نے خود فرمایا ہے:

''کوئی صحابی رسول۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں جھوٹ نہیں بول سکتا''

(ترمذی۔ کتاب المناقب۔ مناقب ابی ھریرۃ۔ جامع الاصول الحدیث ٦٦٤٣)

اور جو چیز واقعۃً بری تھی اور ان سے صادر ہوئی اس کے بعد ان کا کیا حال ہوتا تھا جو روایتوں میں انہیں کے واقعات کے ساتھ محفوظ و منقول ہے اس کی طرف یہ سب نقل کرنے والوں کی توجہ نہیں ہوتی۔

اس تحریر کا پس منظر یہ ہے کہ آج بے اعتدالی بہت آ گئی ہے، تحریر و تقریر میں بے تکلف ایسی باتیں ذکر کی جاتی ہیں جو انتشار و فساد کا باعث بنتی ہیں، بات صرف نوجوان فضلاء کی نہیں کہ جو ناپختہ اور ناتجربہ کار ہوتے نہیں، تعجب و افسوس تو ہوتا ہے اس وقت جب کہ ایسی باتیں ان

لوگوں کی طرف سے آئیں جو تجربہ وقار اور اعتبار رکھتے ہیں۔

ایسی صورت حال میں کچھ کہنا وتبصرہ کرنا بھی مشکل ہوتا ہے، مگر بات جب عوام کے درمیان آجائے اور اندیشہ سے آگے بڑھ جائے تو مجبوراً کچھ نہ کچھ قدم اٹھانا ہی پڑتا ہے۔

ادھر ایسا ہو رہا ہے کہ بعض عنوانات کے تحت حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ذات کو نشانہ بنایا جاتا ہے اور عوام تو بے چارے عوام ہیں تو عمر فضلاء اور ناپختہ اہل علم بھی ان کو ذکر کرنا شروع کر دیتے ہیں، اس لئے اس قسم کی باتیں سامنے آنے پر تحریر وتقریر میں کچھ وضاحتیں لائی گئی ہیں۔

اسی سلسلہ کی ایک اہم ووقیع کڑی برادرم مولانا محمد عرفان نصر فاروقی ندوی صاحب کی وہ تحریر ہے جو انھوں نے برادر محترم مولانا محمد سلمان صاحب حسینی کی تحریر وتقریر میں آنے والی بعض باتوں کے جائزہ کے طور پر مرتب کی ہے، اور حق یہ ہے کہ اس کے لئے انھوں نے محنت کی ہے، اور اعتدال کی دائرہ میں لاکر وہ لائق اشاعت اور نہایت مفید ہے، اب وہ تحریر کتابی شکل میں شائع ہو رہی ہے، جس کے ساتھ بطور افادہ وتمہید انھوں نے میری اس تحریر کو شامل وشائع کرنا پسند کیا ہے، حق تعالیٰ ان کی اور میری دونوں کاوشوں کو نفع بخش بنائے اور دفاع کی نسبت سے قبول فرمائے۔

فقط

محمد عبید اللہ الاسعدی

جامعہ عربیہ ہتورا باندہ یوپی

۱۵/۶/۱۴۰۴ھ

پیش لفظ

از: عرفان نصر فاروقی ندوی

اس تحریر کا محرک وپس منظر یہ ہے کہ مولانا سید سلمان حسینی ندوی دامت برکاتہم نے تقریبا ایک مہینہ قبل ایک حساس موضوع یعنی مشاجرات صحابہ کے بارے میں بعض ایسی آراء کا تذکرہ فرمایا تھا جو خالصتا اہل تشیع کا عقیدہ و مذہب ہیں اور اہلسنت اور اہل تشیع کے درمیان ما بہ الامتیاز کا درجہ رکھتی ہیں مولانا نے ابتداء ان آراء سے اپنی موافقت اور تائید کا اظہار دار العلوم ندوۃ العلما میں اپنے طلبہ کے درمیان فرمایا اور پھر طلبہ اور مولانا کے درمیان تبادلہء خیالات اور رد وقدح کا سلسلہ تین چار روز تک چلتا رہا اس کے بعد مولانا محترم نے اہل بیت اطہار سے اپنی عقیدت ومحبت کے اظہار کی خاطر اپنے گھر کے قریب سبیل لگانے کا بھی اہتمام فرمایا اور پھر اس کے بعد رائے بریلی کے ایک سفر کے دوران مدرسہ ضیاء العلوم کے طلبہ کے سامنے بہت ہی پر جوش لب ولہجہ میں صحابی کی تعریف اور حضرات صحابہ کے بارے میں بعض ایسی آرا اور عقائد کا ذکر فرمایا جو یقینا اہل سنت کے متعینہ اور واضح موقف کے خلاف اور اہل تشیع کی حمایت وتائید کی آئینہ دار تھیں، مولانا کی تقریر خود ان کے اہل خانہ، ان کے فرزندوں اور ان کے متعلقین نے بہت اہتمام سے ارسال کیں، اور پھر مولانا کی ایک شارٹ کلپ سوشل میڈیا میں گردش کرتی ہوئی نظر آئی جس میں صراحتاً حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو صاف لفظوں میں باغی کہا گیا، ظاہر ہے اتنا سب ہونے بعد ہنگامہ تو ہونا تھا اور ہونا بھی چاہئے تھا اس لئے کہ یہ محض علمی نہیں خالص عقیدہ کا مسئلہ تھا، اسلام کی بنیادوں پر تیشہ چلایا گیا تھا اور سرے سے صحابہ کرام ہی ایک ملزم کی طرح کٹگھرے میں کھڑے کر دئے گئے تھے، اس بیان کے بعد مولانا عبد العلیم صاحب فاروقی کی پیشوائی میں جب کوشش ہوئی تو ندوہ کے ارباب حل وعقد نے مولانا کے بیان سے اپنا دامن جھاڑ لیا اور اسے ان کا ذاتی بیان قرار دیا گیا، اور اظہار براءت کا اعلان جاری کیا گیا تب مولانا نے ایک دو کتابچے اسی موضوع پر سپرد قرطاس کئے، اور پڑھنے والوں نے ان کو

پڑھا، طلبہ میں انتشار اور بے چینی اور شکوک وشبہات کے پیش نظر حضرت مفتی عتیق صاحب بستوی نے ایک کتاب جمہور اہل سنت کے موقف کی تائید میں لکھی تا کہ جمہور اہل سنت کا موقف ان شبہات کے درمیان شمس مستنیر بن کر سامنے آسکے، اور مسلمات کے خلاف جو شبہات اٹھائے گئے تھے ان کی حقیقت واضح ہو جائے، پھر کیا تھا مولانا حسینی صاحب گویا آپے سے باہر ہو گئے اور ایک کتابچہ ان کا پھر منظر عام آیا جس کی ہر ہر سطر سے ان کی انانیت اور کبر و غرور ہویدا تھا اس کتاب ''ازالہ کا ازالہ'' میں مولانا بستوی کے نہ تو سوالوں کا جواب ہے اور نہ ہی علمی انداز و تحقیقی متانت کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے بلکہ صرف اپنی قابلیت اور مہارت کا اظہار کیا گیا ہے، اور پھر کتاب کے آخری حصہ میں مفتی صاحب کے سوالات کا تشفی بخش جواب دئے بغیر مفتی صاحب اور ان کے ہمنوا جمہور کے خلاف سوالنامہ کی ایک لسٹ جاری کی گئی ہے گویا سوال کرنے کا حق صرف مولانا کو حاصل ہے اور پوری امت بلکہ خاص طور پر جمہور اہل سنت جوابدہ ہیں، وہ سوال کا حق نہیں رکھتے، اس کے بعد ممکن تھا مفتی صاحب یا کسی اور کی جانب سے جواب آتا لیکن مولانا محترم نے کمالِ مہارت سے کام لیتے ہوئے ایک وضاحت جاری کی کہ چونکہ امت اس وقت بہت زبوں حالی اور نت نئے مسائل کا شکار ہے لہذا میں اب اس بحث کو دفن کر دینا چاہتا ہوں''۔ یقینا یہ مباحث ایسے ہیں کہ ان دفن کر دینا چاہئے ان کو ایسی صورتحال میں دوبارہ زندہ نہیں کرنا چاہئے لیکن سوال یہ ہے کہ اس کی ابتدا کس نے کی؟ اور اب مولانا کے وہ غالی معتقدین جن کے اذہان مسموم ہو چکے ہیں اور جو مولانا کی ہر بات پر ''آمنا وصدقنا'' کہتے نظر آتے ہیں اور جن کے خیال خام کے مطابق مولانا محترم نے اہل سنت کی چولیں ہلا دی ہیں، کسی سے مولانا کے قائم کردہ سوالوں کا جواب ممکن نہیں اور صورتحال یہ ہے کہ طلباء تذبذب تردد اور کشمکش کا شکار ہیں ان کے ذہنوں میں صحابہ جیسے گروہ مقدس کے بارے میں شکوک ہیں، وہ عجیب نفسیاتی کشمکش اور شش و پنج کا شکار ہیں کہ جب سیدنا ابوبکر وعمر وعثمان اور خالد ومعاویہ مغیرہ ابن شعبہ، ماعز اسلمی اور حضرت بسر بن ارطاۃ رضی اللہ عنہم پر اس قدر الزامات ہیں کہ ان کے مقامِ صحابیت پر بھی سوالیہ نشان لگ چکا ہے تو کس کا اعتبار کیا جائے؟ اور کس دین پر عمل کیا جائے؟ اور جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کی ہمنوا جماعت باغیوں کی جماعت ٹھہری تو مکثرین صحابہ ابوہریرہ وابن عمر ام المؤمنین عائشہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین کی بیان کردہ احادیث کو کیونکر

پڑھااور پڑھایا جائے؟ کیونکہ دین کے اولین ناقل وشارح وترجمان توان حضرات صحابہ ہی کی ذات ہے اور جب جمہور اہل سنت کی جماعت میں بہت سے چھپے ناصبی ہیں تو بھلا ان کی تحقیقات وتعلیقات اورتشریحات کیسے معتبر ہوسکتی ہیں؟-العیاذ باللہ-

خیر یہ تو تھا پس منظر جو قدرے طویل ہو گیا اب ایسی صورتحال میں اس سوالنامہ کا جواب نہ دیا جانا گویا اس بات کی دلیل ہے کہ جمہور اہلِ سنت کا موقف کمزور ہے، اور اگر جواب دیا جائے تو احباب یہ سوال کریں گے کہ اب یہ مسئلہ کیوں چھیڑا گیا جبکہ مولانا کی جانب سے اس کو دفن کر دیا گیا ہے تو عرض ہے کہ یہ تحریر طلباء کی تشفی اور ان کی اطمئنان کی خاطر لکھی گئی ہے اسی لئے یومیہ ایک سوال کا جواب تحریر کیا جائے گا اور چونکہ اس قضیہ نامرضیہ کے لیے سوشل میڈیا کا اسٹیج استعمال کیا گیا اس لئے سوشل میڈیا ہی کے ذریعہ ان تمام سوالوں کا یومیہ جواب دیا جائے گا تا کہ طلباء کے دل ودماغ میں جمہور اہل سنت کا موقف اور ان کے دلائل مستحضر رہیں، اس تحریر کے مخاطب قطعا مولانا محترم نہیں ہیں (اور ناچیز کا مولانا کی ذات گرامی سے حسنِ ظن بلکہ یقین ہے کہ مولانا خود ان تمام سوالوں کے جوابات سے واقف ہیں، اور بذات خود بہتر انداز میں جمہور اہل سنت کے موقف کی ترجمانی کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں جیسے کہ ماضی میں دیتے رہے ہیں اور دیگر معاصرین کبار علما کے مقابلہ میں زیادہ مدلل ومنقح انداز میں ان کی وکالت کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ہم مولانا سے بصد ادب درخواست کرتے ہیں اپنے قلم سے ان سوالوں کا وہ جواب جو جمہور اہل سنت کا موقف ہے تحریر فرمادیں تا کہ جمہور اہلِ سنَّت کے ساتھ ساتھ آپ کا صحیح اور صریح موقف عام طور پر امت کے سامنے آسکے اور خاص طور پر ہم طلباء کی تشفی کا سامان ہو سکے) بلکہ وہ تمام نام نہاد علما ہیں جو مولانا کی جا و بیجا حمایت کی مدعی ہیں اور جن کا خیال ہے کہ مولانا کے سوالات کے جوابات ناممکن ہیں، اور جن کا یہ مطالبہ ہے کہ ان سوالوں کا علمی جواب دیا جانا چاہیئے، مولانا موصوف کی بعد کی تحریروں (ملک عضوض وغیرہ) سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اس طرح کے شیعی اعتراضات اورسوالات خود ان کے دل ودماغ میں جگہ پاچکے ہیں، اللہ تعالی انہیں ہدایت دے، اور صراط مستقیم پر لائے، لہذا یہ پہلے سوال کا جواب اور پہلی قسط پیشِ خدمت ہے۔

مولانا سید سلمان حسینی دامت فیوضہم کے جمہور اہلِ سنت سے سوالات اور ان کے جوابات

قسط نمبر-۱

سوال (1): کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں ابوبکر وعمر وعثمان وعلی رضی اللہ عنہم کی خلافت کا تذکرہ فرمایا تھا، وہاں یوں نہیں فرمایا تھا: إن تولوا أبابکر، وإن تولوا عمر وإن تولوا عثمان تو ان تینوں کی انفرادی خصوصیات ذکر فرمائی تھیں اور جب إن تو لوا علیا فرمایا تھا تو فرمایا تھا کہ تجدوہ ھادیا مھدیا یھدیکم إلی الصراط المستقیم"۔

(دیکھئے إزالۃ الخفاء اور مراجع حدیث مسند أحمد حدیث نمبر ۸۵۹)

جواب: جناب مولانا سلمان حسینی صاحب نے جو سوال قائم فرمایا ہے اس میں ان کا مدعی ثابت نہیں کہ آیا وہ حضرات شیخین ابوبکر وعمر پر حضرت علی کی افضلیت کے قائل ہیں یا وہ خلافت کے باب میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خلیفہء اول تسلیم کرتے ہیں؟ کیونکہ حدیث مذکور میں خلفائے راشدین کے فضائل ومناقب بیان ہوئے ہیں بلا شبہ اس حدیث سے جہاں حضراتِ شیخین ابوبکرؓ وعمرؓ کے مقام ومرتبہ کا علم ہوتا ہے وہیں حضرت علیؓ کے بارے میں زبانِ نبوت سے بلند وبالا اوصاف بیان ہوئے ہیں اور ان کی بلندئ درجات کا علم ہوتا ہے، یعنی حضرت ابوبکر کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ وہ امانت دار دنیا سے بے رغبت اور آخرت کی فکر کرنے والے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بنیادی صفت یہ ہے کہ وہ طاقتور ہیں، راہ خدا میں کسی کی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بنیادی صفت یہ ہے کہ وہ خود حق پر قائم اور حق کی جانب رہنمائی کرنے والے ہیں، وہ تمہیں راہ مستقیم کی رہنمائی کریں گے، مذکورہ بالا روایت سے ان دونوں میں سے (حضرت علیؓ کا حضرات شیخینؓ سے افضل ہونا یا حضرت علیؓ کا خلیفۂ بلافصل

ہونا) کسی معاملہ پر استدلال نہیں ہوسکتا اور نہ ہی یہ روایت خلفائے ثلاثہ کے مقام ومرتبہ کی درجہ بندی کرتی ہے اور نہ حضرت علی کی خلفائے ثلاثہ کے مقابلہ میں افضل ہونے کی دلیل ہے اب مولانا محترم کا مدعی اور ان کا استدلال اس حدیث سے کیا ہے؟ یہ تو وہی سمجھ سکتے ہیں البتہ اس روایت کی مختصر اتخریج اور اس کی وہ شرح جو علمائے اہل سنت کے یہاں معروف ہے، ذیل میں ذکر کی جاتی ہے یہ پوری روایت حدیث کی کتابوں میں کچھ اس طرح ہے:

عن علی رضی اللہ عنہ قال یارسول اللہ من نؤمرك بعدك؟ قال: إن تؤمروا أبابکر تجدوہ أمینا زاھدا فی الدنیا راغبا فی الآخرۃ وإن تؤمروا عمر تجدوہ قویا أمینا لا تأخذہ فی اللہ لومۃ لائم، وإن تؤمروا علیاً ولا أراکم فاعلین تجدوہ ھادیا مھدیا یأخذ بکم الطریق المستقیم"۔

مذکورہ بالا حدیث حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حوالہ سے مسند احمد، مسند ابن حبان، مستدرک علی الصحیحین، مسند بزار، المعجم الأوسط للطبرانی، تاریخ ابن عساکر، نیز فضائل صحابہ از امام احمد بن حنبل میں الفاظ کی معمولی تبدیلی کے ساتھ ذکر کی گئی ہے اور قابل ذکر بات یہ ہے جہاں إن تؤمروا علیا مذکور ہے وہیں زیادہ تر ولا أراکم فاعلین اور یا ولا أراھم فاعلین یا ولا أراھم یفعلون، ولا أظنکم فاعلین اور مسند بزار میں تو یہ کلمات ہیں۔ قالوا ألا تستخلف علیا قال: إن تستخلفوہ ولن تفعلوہ یسلك بکم الطریق المستقیم وتجدوہ ھادیا مھدیا"۔

علامہ ہیثمی نے بھی صواعق محرقہ جلد نمبر ۱ رصفحہ نمبر ۱۵۵ میں یہ حدیث ذکر کی ہے، مسند بزار کی روایت صحیح درجہ کی ہے علامہ ابنِ حجر اور امام بیہقی نے بھی اس روایت کی تصحیح فرمائی ہے۔ البتہ ابن حبان کی روایت اور علامہ ذہبی کی میزان الاعتدال میں اس روایت پر معمولی کلام موجود ہے۔

علامہ طیبیؒ نے اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرمایا ہے: اے امت محمد یہ یہ معاملہ (امر خلافت) تمہارے سپرد کیا گیا اس وجہ سے کہ تم امانت دار ہو، اور اس معاملہ میں تم اجتہاد کی مجاز ہو اور تمہارا اجتہاد صحیح ہوگا، اور حقیقی حق پر ہی تمہارا اتحاد واتفاق ہوسکے گا، جن حضرات کا اس حدیث میں تذکرہ ہے (خلفائے ثلاثہ ابوبکرؓ وعمرؓ وعلیؓ) ان کی حیثیت جداگانہ کڑیوں کی ہے، یہ نہیں کہا جا

سکتا کہ ان میں (اس حدیث کے مطابق) امرِ خلافت کے باب میں افضل کون ہے؟۔

اس روایت میں حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کے حضرت علیؓ سے پہلے خلیفہ ہونے کا جہاں اشارہ ملتا ہے وہیں ولا أراکم فاعلین سے حضرت عثمانؓ کے خلیفۂ ثالث ہونے کا اشارہ بھی موجود ہے، اورقرین قیاس یہ ہیکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے تقدم کا اشارہ فرمایا ہے، یہ الگ بات ہے کہ صراحتا تذکرہ نہیں، دوسری اہم ترین قابل غور بات یہ ہے کہ خود زبانِ حق ترجمان نے گویا صاف اشارہ فرمایا دیا تھا کہ ابوبکر وعمر کے بعد حضرت علی خلیفہ نہیں ہوں گے اور یہ پیشین گوئی خود زبانِ نبوت سے ثابت ہے، اور بعد کے حالات نے اس کی تصدیق بھی کی، اور یہ پیشینگوئی ایک تاریخی حقیقت بن کرامت کے سامنے آج موجود ہے، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گویا یہ بشارت تھی حضرت علیؓ کے حق میں کہ وہ خلفائے ثلاثہ سے زیادہ عمر کے حامل ہوں گے اور اگر حضرت علیؓ کو خلیفہ بنادیا جاتا تو حضراتِ شیخینؓ اور حضرت عثمانؓ کی خلافت وقوع پذیر ہی نہ ہوتی۔

بہرحال اس حدیث سے نہ تو حضرت علی کا پہلا خلیفہ ہونا ثابت ہوتا ہے اور نہ ہی خلفائے ثلاثہ کا خلافت کو غصب کرنا ثابت ہوتا ہے، اور نہ یہ کہ حضرت علی خلفائے ثلاثہ سے مقام ومرتبہ میں افضل ہیں یہ ثابت ہوتا ہے۔ مولانا محترم کا جمہور علما کے خلاف اس حدیث سے کیا استدلال ہے واضح نہیں البتہ مولانا کا ایک ادنی شاگرد یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ اس روایت کو ذکر کرتے ہوئے (جیسا کہ ہم نے ذکر کیا کہ اکثر جگہوں میں جہاں ولا أراکم فاعلین وغیرہ کی الفاظ مذکور ہیں) ان کلمات یعنی ولا أراکم فاعلین وغیرہ کلمات کیوں ذکر نہیں کئے جبکہ یہ الفاظ مفہومِ حدیث کی تعیین میں کافی اہم حیثیت رکھتے ہیں، مولانا کی جانب سے آیا یہ تغافل ہے؟ یا تساہل ہے؟ یا بالقصد اور بالارادہ مولانا نے اس کے ذکر سے گریز برتا ہے، اس کا علم خود مولانا ہی ذات کو یا خدائے علیم وخبیر کو ہے اور وہی روزِ حساب کا مالک ہے۔

مولانا نے اپنے سوالنامہ میں فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ خلفاء کی خلافت کا تذکرہ فرمایا تو ان کی انفرادی خصوصیت کا تذکرہ فرمایا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا تذکرہ فرمایا تو مذکورہ کلمات یعنی تجدوہ هادیا مهدیا یأخذ بکم الطریق المستقیم جیسے بلند وبالا کلمات فرمائے، مولانا ہی بہتر سمجھ سکتے ہیں کہ کسی صحابی کی کوئی خوبی اگر

انفرادی نوعیت کی ہوتو وہ خلافت کی اہلیت یا عدم اہلیت کی دلیل نہیں ہوتی اوراسی طرح اگر کسی صحابی کی اجتماعی خوبی کا تذکرہ زبانِ نبوت سے ہوتو وہ بھی خلافت کی اہلیت یا عدم اہلیت کی دلیل نہیں، اگر مولانا اس امر کو دلیل سمجھتے ہیں تو اس کی صراحت ہونی چاہئے تھی مزید یہ کہ اس حدیث کی روسے حضرات شیخین کی تقدیم تو بہر حال نص خفی سے ثابت ہے جبکہ حضرت علیؓ کی ان پر تقدیم ثابت نہیں ہوتی۔

بفرضِ محال اگر تسلیم کرلیا جائے کہ اتنے بلند وبالا توصیفی کلمات جو زبانِ نبوت سے حضرت علیؓ کی بابت ارشاد فرمائے گئے تو ان کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ خلیفہء اول ہوتے یا حضراتِ شیخین سے ان کو برتر تسلیم کیا جانا چاہئے تو پھر اس دعا کا کیا جواب دیا جائیگا جو زبان نبوت سے سیدنا حضرتِ معاویہؓ کے حق میں مروی ہے کہ اللهم اجعله هاديا مهديا واهدبه" (ترمذی، حدیث نمبر ۳۸۴۲، وقال هذا حديث حسن غريب)۔(اے اللہ معاویہ کو راہ ہدایت پر قائم رکھ اور لوگوں کو ہدایت کرنے والا بنا اور ان کے ذریعہ سے ہدایت کو عام فرما) اور جمہورِ اہل سنت کا عقیدہ ہیکہ رسول اللہؐ کی مذکورہ دعا ٹھیک اسی طرح قبول ہوگئی ہے جیسے سیدنا عباسؓ اور ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حق میں بارگاہِ خداوندی میں مقبول ہوئی ہے کہ اللهم اغفر للعباس وولده مغفرة ظاهرة وباطنة لا تغادر ذنبا"۔ (ترمذی حدیث نمبر ۳۷۶۲، وقال الترمذی هذا حديث حسن غريب)۔

(ترجمہ: اے اللہ عباس اور اس کے فرزند کی مغفرت ظاہری اور باطنی ایسی مغفرت فرما کہ کوئی گناہ باقی نہ رہے)۔

اگر مولانا محترم کے دعوی کے مطابق یہ حدیث حضرت علیؓ کی افضلیت اور ان کے خلیفہء اول ہونے یا حضراتِ شیخینؓ سے برتر ہونے کی دلیل ہے تو بلاشبہ یہ افضلیت وتقدم حضرت معاویہ کے حق میں بھی ثابت ہوتا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق بھی تقریبا یہی دعا فرمائی تھی اور یہ دعا بارگاہِ حق میں مقبول ہوچکی ہے اور اگر مولانا کا جواب یہ ہے کہ مقبول نہیں ہوئی تو حضرت عباسؓ اور ان کے جلیل القدر فرزند ابن عباسؓ کے حق میں بھی شاید قبول نہ ہوئی ہو اور ظاہر ہیکہ مولانا اس امر کے مدعی نہیں ہوں گے۔

اخیر میں مولانا محترم سے ایک سوال یہ ہے کہ مولانا نے مذکورہ حدیث کے حوالہ میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی مشہور کتاب ''ازالۃ الخفاء'' کا حوالہ درج کیا ہے، اور شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے تو حضراتِ شیخین اور حضرتِ عثمانؓ کی خلافت ترتیب وار رؤیائے نبوت سے ثابت کرتے ہوئے اسے جزوِنبوت تسلیم کیا ہے تو کیا مولانا محترم (جن کی شہرت اکابر واصاغر میں شاہ ولی اللہ کے ایک مداح اور ان کے افکار کے شارح وترجمان کی ہے) ان کی اس رائے کو لائق اعتنا نہیں سمجھتے؟۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ازالۃ الخفاء، جلد اول، صفحہ ۱۶۵، تحقیق ڈاکٹر تقی الدین ندوی)

قسط نمبر۔ ۲

مولانا محترم کا سوال (2): ''حجۃ الوداع سے واپسی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۸ ذی الحجہ بروز اتوار غدیر خم کے میدان میں جو اجلاس فرمایا، وہ ہزار ہا ہزار کے مجمع میں تھا، ویسے ہی جیسے حجۃ الوداع کے خطابات تھے۔تقریباً ۲۵ صحابہ کی روایتوں کا حافظ ابن حجر نے اس سلسلہ میں تذکرہ کیا ہے اور انہوں نے، امام ذہبی نے، سیوطی نے، عجلونی نے، البانی نے اور دیگر محدثین نے اس حدیث کو متواتر قرار دیا گیا اس پر طبری، ابن عقدہ اور ذہبی کی کتابیں ہیں، میرے رسالہ ''مختصر سیرۃ سیدنا علیؓ'' میں اس کی تخریج موجود ہے۔اس میں قرآن کی طرح قطعی اور متواتر حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا "إنه قد دنا أجلي وإني أوصيكم پھر فرمایا تھا تركت فيكم ثقلين لن تضلوا اما تمسكتم بهما كتاب الله وعترتي" (میں تمھارے درمیان دو امانتیں چھوڑ رہا ہوں ایک قرآن اور دوسرے میرے اہل بیت)۔**اس قطعی ہدایت پر عمل کیوں نہیں ہوا؟**

مولانا کا اسی سے متصل ایک سوال اور ہے وہ یہ کہ

''عترتی سے کیا مراد ہے اور قرآن اور عترتی کو مضبوطی سے تھامنے کے کیا معنی ہیں''؟

جواب: مولانا محترم کے سوال کے جواب سے پہلے یہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ پہلے اس روایت کی تخریج و تحقیق نقد حدیث کے معیار پر کر لی جائے تا کہ قاری کو معلوم ہو جائے مولانا محترم کی دلیل کا وزن کیا ہے؟ اور اس سے جو غیر واضح نتیجہ خیزی کی کوشش کی گئی ہے اس کے پس پردہ مقاصد کیا ہیں؟

اس مسئلہ کے تین بنیادی نکات ہیں (۱) حدیث کے الفاظ کی تخریج و تحقیق اور ناقدینِ حدیث کے یہاں اس کا معیار صحت (۲) علمائے اہلِ سنت کا یہاں اس کا مفہوم و مطلب (۳) رافضی شیعوں کا استدلالِ باطل

(۱) الفاظ کی تحقیق وتخریج اور ناقدین حدیث کے یہاں اس کا مقام

"کتاب اللہ وعترتی وأھل بیتی"

اس حدیث کو حدیث الثقلین کہتے ہیں، اس روایت کو متعدد صحابہ کرامؓ نے بیان کیا ہے جن میں حضرت علیؓ، ابوسعید خدریؓ، جابر بن عبداللہؓ، جبیر بن مطعمؓ، حذیفہ بن أسیدؓ، زید بن أرقمؓ، زید بن ثابتؓ، عبداللہ بن حنطبؓ، نبیط بن شریط رضی اللہ عنہم ہیں، لیکن روایتِ الفاظ میں باہم اختلاف ہے، بعض روایات میں یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ بیان ہوئی ہے "**کتاب اللہ وسنتی** اور بعض جگہ **وسنۃ نبیہ**" ان الفاظ کو بھی متعدد صحابہ کرام نے نقل کیا ہے، جن میں حضرت عمر بن خطابؓ، ابوسعید خدریؓ، انس بن مالکؓ، عبداللہ بن أبی نجیحؓ، عروۃ بن زبیرؓ، عمرو بن عوف المزنیؓ، موسیٰ بن عقبہؓ، ناجیۃ بن جندبؓ، عبد بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ حضرات صحابہ کی ایک تعداد ہے، البتہ یہ دونوں روایتیں صحیحین یعنی بخاری ومسلم میں موجود نہیں، ہاں مسلم شریف کی ایک روایت ان الفاظ کے ساتھ موجود ہے، روایت حسب ذیل ہے:

"أنا تارك فیکم ثقلین: أولھما کتاب اللہ فیه الھدیٰ والنور فخذوا بکتاب اللہ واستمسکوا به، فحث علی کتاب اللہ ورغب فیه، ثم قال وأھل بیتی، أذکرکم اللہ فی أھل بیتی، أذکرکم اللہ فی أھل بیتی أذکرکم اللہ فی أھل بیتی"۔

حدیث "کتاب اللہ وعترتی" کے الفاظ اور محدثین کا نقد

"کتاب اللہ وعترتی" حضرت علیؓ حضرت زید بن ثابتؓ، زید بن أرقمؓ" حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم کی روایات میں کتاب اللہ کے ساتھ وعترتی کے الفاظ ذکر کئے گئے ہیں۔

(۱) حضرت علی کی روایت بوصیری کی "اتحاف الخیرۃ" ۲۱۰/۷، ابن حجر کی "المطالب العالیۃ" ۲۵۲/۴، اور طحاوی کی "شرح مشکل الآثار" ۱۷۶۰، میں اسحاق بن راہویہ کے حوالہ سے موجود ہے، اس روایت کی سند میں کثیر بن زید ہے، امام نسائی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے، ابوجعفر طبری کا قول ہے: **و کثیر بن زید عندھم ممن لا یحتج بنقله**۔ ابن حبان کا بیان

ہے: کان کثیر الخطأ علی قلة روایته لا یعجبنی الاحتجاج به إذا انفرد"۔ ابن حجر کہتے ہیں صدوق یخطئی۔ (الجرح والتعدیل ۱۸۴۱، الضعفاء والمتروکین ۵۰۵، المجروحین ۸۹۴، تقریب التہذیب: ۵۶۱۱، تہذیب التہذیب: ۵۴۷ اس روایت کو ابن حجر نے المطالب العالیۃ میں صحیح قرار دیا ہے)۔

(۲) حضرت زید بن ثابتؓ کی روایت مسند عبد بن حمید میں موجود ہے، اور سنداً ضعیف ہے، اس کی سند میں یحی بن عبداللہ الحمانی ہیں جن پر کذب اور سرقہ کی تہمت ہے۔(تفصیل کے لیے دیکھئے تہذیب التہذیب: ۳۹۹ تقریب التہذیب: ۷۵۹۱ از حافظ ابن حجر)

(۳) حضرت زید بن أرقم کی روایت صحیح ترمذی، علامہ شجری کی ''ترتیب الأمالی'' اور فسوی کی ''المعرفۃ والتاریخ'' میں موجود ہے، ترمذی نے اس روایت پر ''حسن غریب'' کا حکم لگایا ہے، اس کی سند میں علی بن منذر کوفی ہیں، امام نسائی نے اسے خالص شیعہ کہا ہے، اس کی سند میں ایک دوسرے راوی محمد بن فضیل ہیں، امام احمدؒ نے اس پر تشیع کا حکم لگایا ہے، ابن حبان نے کتاب الثقات میں اس کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے: کان یغلو فی التشیع، امام ابوداؤد کا قول ہے: کان شیعیا محترقا"۔ امام احمد نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے علامہ ابن تیمیہ نے منہاج السنۃ میں تحریر فرمایا ہے: سئل عنه أحمد بن حنبل، فضعفه، وضعفه غیر واحد من أهل العلم، وقالوا لا یصح"۔ (منہاج السنۃ: ۳۹۴/۷)۔

حضرت زید بن أرقم کی دوسری روایت کی تخریج حاکم نے، اور شجری نے ترتیب الأمالی میں کی ہے، یہ حدیث بھی ضعیف ہے اس کی سند میں محمد بن سلمہ ہیں بن کہیل ہیں ان کے بارے میں محدثین نے ''واہ'' یعنی کمزور راوی کا حکم لگایا ہے۔(دیکھئے ابن حبان کی کتاب الثقات: ۱۰۵۰۵ اور ذہبی کی میزان الاعتدال: ۷۶۱۴)

(۴) اسی طرح حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت بھی ضعیف ہے، یہ روایت ترمذی، طبرانی کی ''المعجم الکبیر'' اور ''المعجم الأوسط'' میں مذکور ہے، علامہ ابوحاتم نے اس روایت کے ایک راوی زید بن الحسن پر کلام کرتے ہوئے اسے منکر الحدیث کہا ہے، اور فرمایا کہ: یہ روایت جعفر بن محمد کے طریق سے صرف زید بن الحسن ہی سے مروی ہے، علامہ ذہبی اور ابن حجر نے بھی اس کی

تضعیف کی ہے۔ (تقریب التہذیب: ۲۱۲۷، الجرح والتعدیل لابن حاتم: ۲۵۳۳، کاشف للذہبی: ۱۷۳۱)

(۵) حضرت ابو سعید خدری کی روایت مسند احمد، ابن عاصم کی ''السنۃ'' میں، طبرانی کی ''المعجم الکبیر'' میں علامہ بغوی کی ''شرح السنۃ'' میں منقول ہے، یہ روایت بھی محدثین کے یہاں ضعیف ہے، اس روایت کی سند میں عطیہ العوفی ہے، امام احمد کے نزدیک وہ ضعیف ہے، ابوحاتم رازی نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے، ابن حبان کا فیصلہ یہ ہے: لا یحل الاحتجاج به ولا کتابة حدیثه إلا علی جهة التعجب (اس سے استدلال کرنا یا اس کی حدیث بیان کرنا دونوں جائز نہیں، اِلا یہ کہ بطور تعجب ذکر کیا جائے)، **ابن حجر کا فیصلہ ہے و کان شیعیا مدلسا**''۔

حضرت ابو سعید خدری سے مروی دوسری روایت بھی ضعیف ہے، یہ روایت امام أحمد کی فضائل صحابہ میں موجود ہے، اس روایت میں اسماعیل بن موسی بن بنت السدی ہیں، علامہ ابن عدی کا قول ہے کہ محدثین کے یہاں اس پر غلو فی التشیع کا حکم ہے۔ (الکامل فی الضعفاء لابن عدی ۱/ ۵۲۹)۔ اسی طرح اس روایت کا ایک روای ابوالجحاف داؤد بن أبی عوف ہے ابن حجر نے اسے صدوق شیعی تسلیم کیا ہے، اور کہا ہے ''وربما أخطأ''۔ (تقریب التہذیب ۱۸۱۱)

حضرت ابو سعید خدری کی روایت کا تیسرا سلسلہ طریق بھی ضعف سے خالی نہیں ترمذی نے ''حسن غریب'' کہا ہے، اس سند میں بھی عطیہ عوفی ہیں، ان پر کلام ماقبل میں گذر چکا ہے۔

خلاصہ:

خلاصہ یہ کہ حدیث ثقلین میں جہاں بھی ''کتاب اللہ وعترتی'' کے الفاظ ہیں، اس کے اکثر طرق ضعف سے خالی نہیں، اس صورتحال میں مولانا محترم کا اس قدر اصرار اور ایسا مبالغہ آمیز دعوی، دعوئ بیجا اور بلا دلیل نہیں تو اور کیا ہے؟ مولانا کا دعوی ہے کہ:

''تقریبا ۲۵ صحابہ کی روایتوں کا حافظ ابن حجر نے اس سلسلہ میں تذکرہ کیا ہے اور انہوں نے، امام ذہبی نے، سیوطی نے، عجلونی نے، البانی نے اور دیگر محدثین نے اس حدیث کو متواتر قرار دیا گیا، اس پر طبری، ابن عقدہ اور ذہبی کی کتابیں ہیں میرے رسالہ ''مختصر سیرۃ سیدنا

علی‘‘ میں اس کی تخریج موجود ہے۔اس میں قرآن کی طرح قطعی اور متواتر حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا"إنه قد دنا أجلي وإني أوصيكم پھر فرمایا تھا ترکت فیکم ثقلین لن تضلوا ما تمسکتم بھما کتاب الله وعترتي" (میں تمھارے درمیان دو امانتیں چھوڑ رہا ہوں ایک قرآن اور دوسرے میرے اہل بیت)۔اس قطعی ہدایت پر عمل کیوں نہیں ہوا؟‘‘۔

آخر وہ ۲۵ روایات کہاں ہیں؟ جن میں أھل بیت کے ساتھ وعترتی کے کلمات موجود ہوں اور ابن حجر نے اس کی تصحیح کی ہو؟ مولانا کا یہ دعوی دلائل سے عاری وخالی ہے، کتاب اللہ وعترتی والی روایت سندا یا توضعیف ہے اور علی سبیل التنزیل اس کے متابعات وشواہد کی بنیاد پر اگر حسن یا حسن لغیرہ مان لی جائے تو بھی مولانا محترم کا مقصد پورا نہیں ہوتا، جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے۔(مسند احمد، حدیث نمبر ۱۱۲۱۱، اس پر مسند احمد کے محققین نے تفصیلی کلام کیا ہے، اور لکھا ہے کہ حدیث صحیح بشواہدہ)

مولانا کا ایک دعوی بلا دلیل:

مولانا محترم نے دعوی کیا ہے: (اس حدیث کے تواتر پر) ’’طبری ابن عقدہ اور ذہبی کی کتابیں ہیں‘‘، لیکن کسی ایک کتاب کا نام نہیں درج کیا، جبکہ اس حدیث کی تخریج کے دوران ہم نے ذہبی اور ابن حجر وغیرہ کے اقوال نقل کئے ہیں جن سے اس حدیث کی تضعیف ہی معلوم ہوتی ہے، مولانا محترم سے درخواست ہیکہ اس کی دلیلِ تواتر حوالوں کے ساتھ نقل فرمائیں اور ان علماء کی کتابوں کا نام تحریر فرمائیں، ورنہ یہ دعوی، ادعائے محض کی قبیل سے ہوگا اور علمی دنیا میں اس کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔

مولانا کا دوسرا غیر واضح دعوی:

مولانا محترم نے غالبا جوشِ خطابت میں اس حدیث کو قرآن کریم کی طرح ’’قطعی اور متواتر‘‘ بتایا ہے، خدا کا لاکھ شکر واحسان ہے کہ مولانا نے اسے قطعی الدلالۃ نہیں کہا، اور یہ کہنے کی

جرأت بھی کوئی حق پرست کیسے کرسکتا ہے، جبکہ ان الفاظ کے پہلو بہ پہلو وعترتی اَہل بیتی کے علاوہ اکثر روایات میں دوسرے کلمات بھی مذکور ہیں اوران کلمات کا مفہوم وعترتی سے کہیں زیادہ واضح اور مؤید بالشواہد القطعیہ ہے، خیر، غالباً مولانا کی مراد ''قطعی النقل والثبوت'' ہو، اگر مولانا اسے قطعی الثبوت تسلیم کرتے ہیں اور وہ بھی قرآن کی طرح، تو ظاہر ہے وہ حدیث جوشواہد ومتابعات کے سہارے حسن یاحسن لغیرہ یاصحیح لغیرہ کے مقام تک مشکل سے پہنچ رہی ہواس کے بارے میں قطعی کا دعوی کردینا اور وہ بھی قرآن کی طرح قطعی، کتنی جسارت اور حقیقت کومسخ کرنے کی بات ہے، خیرعرض یہ کرنا تھا کہ قطعی سے مراد مولانا کے نزدیک آخرکیا ہے؟ قطعی الدلالۃ یاقطعی الثبوت والنقل؟ امید ہے اس کی وضاحت کی جائے گی۔

حدیث ثقلین کوجیسا کہ بعض علماے محدثین نے شواہد ومتابعات کی وجہ سے صحیح، اور حسن وغیرہ کے درجہ میں رکھا ہے، اسے اگرصحیح تسلیم بھی کرلیا جائے تو جمہور اہل سنت کے موقف کے خلاف نہیں ہے، اس حدیث کا مطلب یہ قطعا نہیں کہ اہل بیت (یعنی حضرت علی وفاطمۃ اور حضرات حسنین وامہات المؤمنین وغیرہم) قرآن کی طرح حجت ہیں، اوران کی اتباع واجب ہے، اور وہی نجاتِ اخروی کا سامان ہیں اوران کی اتباع کے بغیراسلام معتبر نہیں۔

جمہورم علمائے اہل سنت کے نزدیک ''وعترتی'' کا مفہوم

بلکہ جمہورمحدثین وعلمائے اہل سنت نے اسے اہل بیت سے محبت وعقیدت رکھنے پرمحمول کیا ہے، امام قرطبی، ابن کثیر، ملاعلی قاری، امام نووی علامہ ابن تیمیہ وغیرہ نے اس کا یہی مفہوم متعین کیا ہے، اوران کا یہ دعوی بلا دلیل نہیں ہے، اس کی دلیل قرآن وحدیث دونوں جگہ موجود ہے اور ان سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔

سورہ شوری کی ایک آیت ہے "قل لا أسألكم عليه أجراً إلا المودة فی القربی" (الشوری:۲۳) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل بیت اطہار سے محبت وعقیدت واجب ہے۔ اس آیت سے صرف محبت وعقیدت رکھنے کا حکم ہی ثابت ہوتا ہے ''وجوبِ اتباعِ اہل بیت ثابت نہیں ہوتا۔

قرآن کریم میں اس کے علاوہ متعدد مقامات پر اطاعتِ الٰہی اور اور اطاعتِ رسول کا حکم موجود ہے کہیں صراحتاً وکنایتاً اتباعِ اہلِ بیت کا حکم موجود نہیں۔

اسی طرح مسلم شریف کی روایت سے بھی وجوب اتباع اہل بیت کا ثبوت نہیں ہوتا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں کتاب اللہ کا تذکرہ فرمایا وہاں اس کے بعد "تمسکوا به" کے کلمات بھی فرمائے، یعنی تمسک بالکتاب کا حکم موجود ہے اور اس کی ترغیب بھی ہے لیکن وہاں اہلِ بیت کی اتباع کا حکم موجود نہیں، بلکہ یہ فرمایا گیا "أذكركم الله في أهل بيتي، أذكركم الله في أهل بيتي، أذكركم الله في أهل بيتي" یعنی اہلِ بیت سے محبت کا حکم دیا ہے کہ ان کا خیال رکھا جائے ان کا اکرام کیا جائے، ان سے عقیدتمندانہ معاملہ کیا جائے، ان کو ستایا نہ جائے، ان کو اذیت نہ دی جائے، جمہور اہل سنت کی پوری تاریخ اہل بیت کی محبت وعقیدت سے معمور ہے، اہل بیت کی محبت میں ہر قسم کی اذیتیں اور تکلیفیں جمہور اہل سنت نے برداشت کیں، ان کی خاطر جانثاری اور فدائیت کی تاریخ رقم کی جس کی مثال نہیں ملتی، اہل بیت کی محبت کا کوئی منکر نہیں، اور بھلا اہل بیت سے محبت کا منکر کوئی صاحب ایمان کیسے ہوسکتا ہے؟ مولانا کو شاید کسی نے غلط خبر کردی کہ جمہور اہلِ سنت، اہل بیت کی محبت وعقیدت کے منکر ہیں اس لئے وہ شمشیر بے نیام، اور اہلِ بیت کی جانب سے تیغِ براں بن گئے، مولانا کی تضاد بیانی یہ ہے کہ ایک طرف مولانا کا دعوی ہے کہ اس قطعی ہدایت پر عمل کیوں نہیں ہوا؟ دوسری طرف ارشاد ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد سب کتاب الله وعترتي أهل بيتي کے نہ صرف قائل تھے بلکہ اس کے تقاضوں پر عامل تھے، اسی لیے انھوں نے اہل بیت کے لیے کوڑے کھائے اور امام ابوحنیفہ کی اسی جرم میں شہادت ہوئی۔

بفرض محال اگر مان بھی لیا جائے "أهل بيتي وعترتي" کا مفہوم وجوبِ اتباع اہل بیت و"عترة" ہے، تو عترة کے عموم میں تو بنو ہاشم بنو عباس، اولاد علیؓ، بنو حارث بن عبد المطلب، اور ابوطالب کی سب اولاد شامل ہوں گی، اور قرآن وحدیث کے دلائل کی بنیاد پر ازواج مطہرات تو بدرجہ اولی اس میں شامل سمجھی جائیں گی، اور پھر اس مفہوم کی رو سے حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت عائشہ بدرجہ اولی اس حکم میں شامل ہوں گی، اس مفہوم کے اعتبار سے بھی "حضرت علی

وفاطمہ بنت الرسول وحضرات حسنین کی تخصیص ثابت نہیں ہوتی، اور شاید اس حدیث سے یہ استدلال، اور اس کا یہ مفہوم مولانا اور ان کے ہمنواؤں کو پسند نہ آئیگا۔

مولانا کو وجوب اِتباعِ اہلِ بیت (حضرت علی وفاطمہ اور حضرات حسنین) پر اس قدر اصرار ہے کہ وہ اس کی ایک ضعیف روایت کو صحیح اور متواتر اور قطعی اور قرآن کی مانند قرار دینے پر تلے ہوئے ہیں، جیسے کہ کوئی بہت بڑی دلیل ہاتھ لگ گئی ہو اور اس سے ایوانِ ''جمہور علماء'' میں کوئی زلزلہ برپا ہوجائیگا، اور دلیل بھی کیسی؟ جس سے ان کا مفہوم ومدعی صراحتا ثابت نہیں ہوتا۔

آخران روایات کے بارے میں مولانا کا جواب کیا ہوگا جہاں خلفاے راشدین: ابوبکر وعمر وعثمان وعلی رضی اللہ عنہم کے حق میں صراحتا اتباع کا حکم موجود ہے؟ عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين عضوا عليها بالنواجذ. (ابوداؤد: ۴۶۰۷، ترمذی: ۲۶۷۶، وقال هذا حديث حسن صحيح) اور حدیث صحیح ہے "عن حذيفة قال: كنا جلوساً عند النبي صلى الله عليه وسلم فقال: "إني لا أدري ما قدر بقائي فيكم فاقتدوا باللذين من بعدي، وأشار إلى أبي بكر وعمر" (الحديث رواه الترمذي: ۳۷۹۹، وقال هذا حديث حسن، واضح رہے کہ یہ حدیث آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری وقت کی ہے)۔

شیعوں کا مغالطہ اور ان کی افترا پردازیاں

مذکورہ حدیث سے اہل تشیع نے اہل بیت کی اتباع کو قرآن کریم کی طرح حجت تسلیم کیا ہے، اور ان کی اطاعت کو واجب قرار دیا ہے، اور عدم اطاعت کو معصیت وگمراہی کا نام دیتے ہیں، قارئین کرام نے ملاحظہ کیا کہ اہل تشیع اور ان کے ہمنواؤں کا یہ عقیدہ قرآن وحدیث کے خلاف ہے اور عقلا ونقلا، درایۃ وروایۃ کسی طرح بھی اس حدیث سے اس عقیدہ پر استدلال نہیں کیا جاسکتا۔

مولانا محترم کا ارشاد ہے ''اس قطعی ہدایت پر عمل کیوں نہیں ہوا''؟

عرض ہے کہ یہ ہدایت اولا تو قطعی نہیں، اور قطعی ہے تو آپ اس کی نوعیت واضح فرمائیں، اور علماے اہل سنت نے اس حدیث کا جو مفہوم بیان کیا ہے اس پر ان کا عمل بھی ہے، اور اگر آپ کو اس کے خلاف کوئی اطلاع ملی ہے تو خاطر بجار کھئے ایسا ہرگز نہیں ہے۔

مولانا محترم کے نزدیک آخراس حدیث کا مفہوم کیا ہے؟ اوران کے نزدیک اس ''قطعی ہدایت پرعمل'' کی کیا صورتیں ہیں؟ خودآنجناب کے قلم گوہر بار سے اگراس کی وضاحت ہوجاتی توہم طلبا کی نجاتِ اخروی کا کافی کچھ سامان ہوسکتا ہے، امید ہے جناب والا اس درخواست کو لائق اعتنا سمجھیں گے۔

ازالہ صفحہ نمبر ۶۵/ پر مفتی صاحب نے یہ سوال قائم کیا تھا کہ'' اس سلسلہ میں بڑا بنیادی سوال یہ ہے کہ اہلِ بیت کے حجت ہونے کا کیا مطلب ہے؟ کیا قرآن وحدیث کی طرح اہلِ بیت بھی شرعی حجت ہیں؟ بہت سی روایات میں کتاب اللہ وسنتی ہے، کتاب وسنت کا مأخذ دین ہونا اور دین میں حجت ہونا ایک اتفاقی مسئلہ ہے،لیکن اہلِ بیت کا حجت ہونا بہت تحقیق طلب ہے اوران کے حجت ہونے سے کیا مراد ہے؟ دوسری بات یہ ہے کہ کتاب اللہ وعترتی والی حدیث کو کیا ہم متواتر قرار دے سکتے ہیں؟۔

مولانا محترم!

یہ نہایت ضروری تھا کہ آپ اس کا سنجیدہ علمی جواب عنایت فرماتے اوراپنا موقف مدلل انداز میں پیش فرماتے،آپ سے یہ تو نہ ہوسکا بلکہ اس کے بجائے آپ تبرابازی پراترآئے۔

نوٹ!

حدیث ثقلین پر علما نے متعدد رسالے لکھے ہیں تفصیل کیلئے ان کا مطالعہ کرنا چاہئے ، اردو میں حدیث ثقلین از مولانا محمد نافع بہت عمدہ اور مفید کتاب ہے، انہوں نے ہر سند پر تفصیلی کلام کرکے اس حدیث کا غیر معتبر ہونا واضح فرمایا ہے۔

عربی زبان میں طرق'' حدیث ثقلین لابن طاہر مقدسی، بحث فی حدیث الثقلین للأمیر الصنعانی، إسعاد الدارین فی شرح حدیث الثقلین لمحمود شکری الأ لوسی اور حدیث الثقلین وفقہہ از علی بن أحمد سالوس کا مطالعہ مفید رہے گا۔

قسط نمبر۔ ۳

مولانا محترم کا سوال (3): ''اسی موقعہ پر تمام موجود مسلمانوں کے سامنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" کہیں یہ کہ "علی ولی المؤمنین من بعدی"۔ بتائیں ''ولی'' کے قرآن حدیث میں کیا معنی ہوتے ہیں؟ حضور جن کے ولی ہیں علی ان کے ولی ہیں، کیا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نہیں کہا تھا "أنا ولی رسول الله" کیا خلافت کی پہلی تقریر میں انہوں نے نہیں کہا تھا "لقد ولیت علیکم" کیا حضرت عمر نے نہیں کہا تھا "أنا ولی ولی رسول الله صلی الله علیه وسلم"؟۔ براہِ کرم ولی کے تفصیلی معنی بیان کریں''۔

جواب: قرآن وحدیث میں ولی کا استعمال اوراس کا مفہوم:

قرآن کریم میں متعدد جگہ ''ولی'' اوراس کے مشتقات کا استعمال ہے، اور محل استعمال کے اعتبار سے معانی بھی مختلف ومتنوع ہیں، لفظ ولایت کا اسلامی عقیدہ سے بڑا گہرا اور مضبوط تعلق ہے، اسلامی عقیدہ اور خاص طور پر جمہور اہلِ سنت کے عقیدہ کے مطابق ولایت اور موالاتِ حقیقی کا عقیدہ صرف ذاتِ برحق کے ساتھ خاص ہے، اس میں کسی کی شرکت از روئے عقیدہ اسلامی درست نہیں، قرآن کریم کا ارشاد ہے: "هنالك الولاية لله الحق"۔

قرآن کریم میں ولی کا لفظ زیادہ تر ''حامی وناصر'' اور حلیف ودوست کے معنی میں مستعمل ہے ذیل کی آیات میں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) إنهم اتخذوا الشياطين أولياء من دون الله۔ (الأعراف:۳)

امام المفسرین علامہ طبری اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں: "إنما ضلوا عن سبيل الله، وجاروا عن قصد المحجة، باتخاذهم الشياطين نصراء من دون الله"۔

(۲) "إنما وليكم الله ورسوله"۔ (المائدة: ۵۵)۔

(۳) "الله ولي الذين آمنوا" (البقرة:۲۵۷)۔

(۴) وإذا أراد الله بقوم سوءا فلا مرد له وما له من دونه من وال" (الرعد:۱۱)

(۵) فاعلموا أن الله مولاكم، نعم المولى ونعم النصير" (الأنفال:۴۰)

(٦) "ألا إن أولياء الله لا خوف عليهم ولا هم يحزنون"۔ حضرت عبداللہ بن مسعود وعبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے" ولی وہ ہے، جن کی زیارت سے خدا یاد آتا ہو" (السلسلۃ الصحیحۃ: ۳۱۱/۴، حدیث حسن) حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ارشاد ہے "عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم ويرويه النبي صلى الله عليه وسلم عن ربه تبارك وتعالى: من عادى لي وليا فقد آذنته بالحرب، وما تقرب إلى عبدي بشئي أحب إلي مما افترضت عليه، وما يزال يتقرب إلي بالنوافل حتى أحبه، فإذا أحببته كنت سمعه الذي يسمع به، وبصره الذي يبصر به، ويده التي يبطش بها، ورجله التي يمشي بها..... إلى آخره۔ (بخاري: ٦٥٠٢) یہاں اولیاء اور ولی کے مفہوم میں وہ شخص شامل ہے جس کو خدا کی معرفت حاصل ہو، اس کی نازل کردہ شریعت کا متبع ہو، اور جس کی عبادتوں میں اخلاص ہو" یعنی وہ شخص جو ایمان وتقوی کے معیار پر کھرا اترے"۔

ولی کا لفظ قرآن کریم میں رب اور معبود کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جیسا کہ آیت حسب ذیل ہے:

(۱) قل أغير الله أتخذ وليا۔ (الأنعام:۱۴)

ولی قرآن کریم میں ولد یعنی بیٹے کے معنی بھی مستعمل ہے، حضرت زکریا کی دعا ہے:

(۲) "فهب لي من لدنك وليا" (مریم: ۵) اور اس کی دلیل خود قرآن کریم کی اسی سے متصل آیت ہے "يرثني ويرث من آل يعقوب واجعله رب رضيا"۔ (مريم: ٦)

ولی کے ایک معنی بت اور صنم ووثن کے بھی ہیں اور قرآن میں اس معنی بھی استعمال ہے:

(۱) "أم اتخذوا من دونه أولياء" (الشوری:۹)

(۲) مثل الذين اتخذوا من دون الله أولياء"۔ (العنکبوت:۴۱)

(۳) والذين اتخذوا من دونه أولياء"۔ (الزمر:۳)

ولی کے ایک معنی قریبی رشتہ دار کے ہیں، اور اس معنی میں بھی قرآن کا استعمال ہے، قرآن کریم میں ہے:

(۱) یوم لا یغنی مولی عن مولی شئیاً (الدخان: ۴۱) ابن کثیر نے اس کے معنی کی تحدید کرتے ہوئے اسی آیت کے ضمن میں کہا ہے: "لا ینفع قریب قریباً"۔

ولی کے ایک معنی وارث کے بھی ہیں قرآن کریم میں حضرت زکریا کی زبانی ذکر کیا گیا ہے:

(۱) وإنی خفت الموالی من ورائی (مریم: ۳) حضرت ابوصرمہ کی ایک روایت میں ہے قال: الموالی العصبة (کتاب العلل ۲/ ۲۰۲)

(۲) ولکل جعلنا موالی مما ترك الوالدان والأقربون" (النساء: ۳۳)۔ امام طبری کا قول ہے: والعرب تسمی "ابن العم" مولی"۔

آزاد کردہ غلام کے معنی میں یہ لفظ قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے:

(۱) أدعوهم لآبائهم هو أقسط عند الله فإن لم تعلموا آبائهم فإخوانكم فی الدین وموالیکم"۔ (الأحزاب: ۵)

ولی کے معنی لغت میں:

علامہ جزریؒ نہایہ فی غریب الحدیث والأثر میں رقمطراز ہیں کہ: مولی کا لفظ حدیث نبوی میں متعدد معانی میں استعمال ہوا ہے، جن میں اہم معنی یہ ہیں، ''رب، مالک، سید، منعم، معتق، ناصر، محب، تابع، ہمسایہ، چچازاد بھائی، حلیف، عقید، صہر، عبد، آزاد کردہ غلام، اور وہ جس کے ساتھ احسان واکرام کا معاملہ کیا جائے، حدیث کے سیاق وسباق اور اس کے مضاف الیہ کے اعتبار سے ان کے معانی کی تخصیص ہوگی''۔

خلاصہ یہ کہ لغوی اعتبار سے ولی اور ولایت کے معنی قربت، محبت اور نصرت کے ہیں، اور ولایت کا شرعی مفہوم اللہ ورسول اور اس کے دین وشریعت کی محبت و پاسداری، اور حفاظت ونصرت اور اسی طرح اللہ، اس کے رسول اور اس کے دین پر قائم جماعت مؤمنین کی نصرت وحمایت ہے، اور اسی مفہوم کی ضد کے طور پر براء، اور برائت کا لفظ قرآن وحدیث میں استعمال

ہوا ہے۔

قرآن وحدیث کے استعمال اوراس کے متنوع معانی کے تذکرہ کے بعد ہم استاذ محترم سے سوال کرتے ہیں کہ وہ اس بات کی وضاحت فرمادیں کہ ان میں سے کونسا معنی ان کے مفہوم ومطلوب کا مؤید ہے؟، اورکس معنی سے ان کی مطلب برآری ہوسکتی ہے؟ یہ سوال اس لئے ہے کہ انہوں نے سوال تو کیا تھا کہ ’’قرآن وحدیث میں اس کے معنی کیا ہیں؟ لیکن مولانا محترم کے نزدیک خود کیا معنی زیادہ معتبر ہیں؟ اوراس معنی ومفہوم کے دلائل وشواہد کیا ہیں؟ اوراس کی وجہِ ترجیح وتخصیص کیا ہیں؟۔اس کا انھوں نے تذکرہ نہیں کیا۔ بصدادب عرض ہے یہاں بھی آنجناب کا سوال واضح نہیں، البتہ آپ کی عبارت کے بین السطور سے جس شیعی فکر وعقیدہ کا ترشح ہورہا ہے اس کا جواب ہم آئندہ سطروں میں پیش کریں گے، سرِدست جوروایت اس کی بنیاد ہے، اس کا مفہوم ومدعی اوراس کا پس منظر ذہن میں تازہ کرلیجئے۔

’’من کنت مولاہ فعلی مولاہ‘‘ کی تحقیق وتخریج اس کا مفہوم اور پس منظر

یہ روایت خود مولانا محترم کے بیان کے مطابق حجۃ الوداع سے واپسی پر غدیرخم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی، آپ کا یہ حج آخری حج ہے، اوراسی حج کے بعد ماہ ربیع الأول میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا سے رحلت فرماگئے، یعنی تقریبا ۷۰/۷۵ دن بعد۔

یہ حدیث ترمذی ۱۳/۳، ابن ماجہ ۱۲۱، اورمسند احمد وغیرہ میں منقول ہے، علامہ زیلعی نے نصب الرایہ فی تخریج الھدایۃ میں :۱۸۹۱، میں کہتے ہیں: وکم من حدیث کثرت رواتہ وتعددت طرقہ وھو حدیث ضعیف کحدیث ’’من کنت مولاہ فعلی مولاہ‘‘۔

علامہ ابن تیمیہ منہاج السنۃ ۷/۳۱۹، میں رقمطراز ہیں: ’’یہ روایت صحاح میں موجود نہیں، لیکن دیگر کتب حدیث میں علمانے اسے روایت کیا ہے، اس کی صحت اورعدمِ صحت کے بارے میں ناقدینِ حدیث کے مابین اختلاف ہے، امام بخاری ابراہیم حربی وغیرہ نے اس پر کلام کیا ہے، البتہ اس روایت پر جو اضافہ ہے یعنی اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ‘‘ تو بلاشبہ یہ کذب بیانی ہے‘‘۔ البتہ علامہ البانی نے اس حدیث کو السلسلۃ الصحیحۃ ۱۷۵۰ میں صحیح کہا ہے)

خلاصہ یہ کہ روایت صحیح ہے۔

اس حدیث کا مفہوم بیان کرنے سے قبل اس کی وجہ ذہن میں رکھنی ضروری ہے، جس سے مفہومِ صحیح کو سمجھنے میں آسانی ہوگی، ہم اختصار کے ساتھ وہ روایت ذکر کرتے ہیں:

"عن عباس عن بریدة الأسلمی رضی الله عنه قال: خرجت مع علی ابن أبی طالب رضی الله عنه إلی الیمن فرأیت منه جفوة، فقدمت علی النبی صلی الله علیه وسلم، فذکرت علیا فتنقصته، فجعل رسول الله صلی الله علیه وسلم یتغیر وجهه، فقال: یا بریدة ألست أولی بالمؤمنین من أنفسهم، قلت: بلی یارسول الله، قال من کنت مولاه فعلی مولاه"۔

یہ روایت نسائی ۸۱۴۵، ۸۴۶۶، ۸۴۶۷، اور مسند احمد میں ۲۲۹۴۵، مسند بزار ۴۳۵۲، ۴۳۵۳، مستدرک حاکم: ۴۵۷۸، میں مروی ہے، حاکم نے علی شرط مسلم کہا ہے، اور علامہ البانی اسے علی شرط الشیخین کہا ہے اور حاکم کے قول "صحیح علی شرط مسلم" پر نقد بھی کیا ہے (السلسلة الصحیحة: ۱۷۵۰)۔ یہ روایت اختلاف الفاظ کے ساتھ کہیں اختصاراً تو کہیں تفصیل سے متعدد جگہ موجود ہے (تفصیل کے لیے دیکھئے: طحاوی کی مشکل الآثار: ۸/۵۸، ابن عساکر کی تاریخ دمشق ۱۹۵/۴۲، یہ روایت حسن درجہ کی ہے، اس کی اصل صحیح بخاری وغیرہ میں بھی ہے)۔

بخاری میں حضرت بریدہ کے یہ الفاظ ہیں "بعث النبی صلی الله علیا إلی خالد لیقبض الخمس، و کنت أبغض علیا. بخاری میں مختصراً واقعہ بھی موجود ہے، اس کے علاوہ مسند احمد، فضائل صحابہ وغیرہ میں اس روایت کے شواہد ومتابعات موجود ہیں، پورا قصہ ابن عساکر کی تاریخ میں ۴۲/۱۹۹-۲۰۰، پر ملاحظہ فرمائیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ بعض صحابہ کو حضرت علی سے شکایت تھی اور خاص طور پر حضرت بریدہ اسلمیؓ، حضرت عمرو بن شاسؓ (صحابی ہیں، حدیبیہ میں شریک تھے) اور خود حضرت ابوسعید خدری کو حضرت علیؓ سے سفرِ یمن میں (جبکہ حضرت علی ان کے ساتھ تھے) بعض معاملات کی وجہ سے شکایت ہوگئی تھی (حضرت بریدہ کا بیان ہے وہ حضرت علی کو پسند نہیں فرماتے) حضرت ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی سے کہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے واپس جا کر شکایت

کروں گا لیکن حضرت علی ان سے پہلے وہاں پہنچ گئے، اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ حج میں شریک رہے، (اور یہ حضرات غدیر خم میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملے) لوگوں نے جب شکایت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "من کنت مولاہ فعلی مولاہ"۔ اور ابوسعید خدری کی روایت میں ہے "اشتکی الناس علیا رضوان الله علیه، فقام رسول الله ﷺ فینا خطیبا فسمعته یقول: أیها الناس لا تشکوا علیا، فو الله لأخشن فی ذات الله أو سبیل الله من أن یشکی"۔ اب بتائیں کہ کسی حدیث کو اس کے سیاق وسباق سے الگ کر کے اس سے کسی ایسے مفہوم کو اخذ کرنا جو اس حدیث کے خلاف ہے، تحریف معنوی نہیں؟ اور کیا تحقیق وریسرچ کے نام پر تلفیق وافترا کی کاشت کی کوشش نہیں ہے؟ اور دین وشریعت کی رو سے اسے غیر دیانت داری کے سوا اور کچھ کہا جا سکتا ہے؟ یہ صریح تلبیس نہیں تو پھر تلبیس کس کا نام ہے؟

ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حضرت اسامہ نے حضرت علی سے کہا تھا: لست مولای، إنما مولای رسول الله ﷺ"۔ (کذا فی تحفة الأحوذی)

حدیث کا مفہوم ومطلب:

حدیث غدیر کے اس ٹکڑے کا مطلب جمہور اہلِ سنت کے یہاں یہ ہے کہ "میں جس کا محبوب ہوں علی بھی اس کے محبوب ہیں، اے اللہ علی سے جو محبت رکھے تو اس سے محبت رکھ" اور جو اس سے دشمنی رکھے تو اس سے دشمنی رکھ"۔

ابن اثیر نے نہایہ میں نقل کیا ہیکہ امام شافعی فرماتے ہیں کہ اس سے مراد "ولاء الإسلام" ہے جیسے کہ قرآن کریم میں ہے: ذلك بأن الله مولى الذين أمنوا وأن الکافرین لا مولی لهم۔ (محمد:۱۱)

یہ وہ موقع ہے کہ ایک طرف بعض حضرات صحابہ کو حضرت علی سے شکایت ہے اور دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عامۂ مسلمین کو آخری وصیت فرما رہے ہیں، اہل بیت، اور اولاد وازواج کے مقام ومرتبہ کی تذکیر کرنی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کے حق میں یہ کلمات بیان فرمائے تا کہ عامۂ مسلمین اور وہ صحابہ جن کو حضرت علی سے شکایت ہے وہ حضرت علی

کے مقام بلند سے واقف ہوسکیں، اوراس کی ایک دلیل خود حدیث عترۃ ہے جو مولانا کے نزدیک **متواتر اور قرآن کی طرح قطعی ہے**، جس میں آپ میں فرمایا تھا کہ کتاب اللہ وعترتی'' اور اُذکرکم اللہ فی أھل بیتی أذکرکم اللہ فی أھل بیتی، ہم نے ماقبل میں اس حدیث کے ضمن میں تحریر کیا ہے اس کا مطلب اہلِ بیت سے محبت وعقیدت اور خاص طور پر حضرت علی سے محبت وعقیدت کا بیان ہے، یہاں حضرت علی یا حضرات حسنین یا اہلِ بیت میں سے کسی کی ولایت وامامت وخلافت پر استدلال نہیں ہوسکتا، علامہ طیبیؒ اس حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"لا یستقیم أن تحمل الولایة علی الإمامة التی هی التصرف فی أمور المسلمین، لأن المتصرف فی حیاته صلی الله علیه وسلم هو هولا غیره، فیجب أن تحمل علی المحبة وولاء الإسلام ونحوهما۔ (عن تحفة الأحوذی شرح الترمذی بتصرف یسیر حدیث: ۳۷۱۳)۔

مولانا کی تحقیقِ انیق (جو شیعی کی فکر ترجمانی پر مبنی ہے) کے مطابق اگر یہ مان لیا جائے کہ اس سے مراد امامت کا اعلان ہے، اور مولی یہاں امام کے ہم معنی ہے تو مولانا کو چاہئے کہ بجائے سوالات وجوابات کرنے کے، قرآن وحدیث سے اس کے دلائل فراہم کرتے، اور صاف لفظوں میں حضرت علی کے خلیفۂ بلا فصل اور وصی رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ماننے کا اعلان کرتے، اور یہ کہہ دیتے امرِ خلافت کے باب میں میرا عقیدہ جمہور اہلِ سنت کے عقیدہ کے خلاف ہے، اور اس باب میں میرا عقیدہ شیعوں کے فرقۂ امامیہ کے مطابق ہے، یہ کیا ہے ''صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں''۔

مولانا محترم کا یہ اشکال کتنا طفلانہ ہے کہ '' کیا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نہیں کہا تھا "أنا ولی رسول الله" کیا خلافت کی پہلی تقریر میں انہوں نے نہیں کہا تھا "لقد ولیت علیکم" کیا حضرت عمر نے نہیں کہا تھا: أنا ولی ولی رسول الله صلی الله علیه وسلم؟۔

جی ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے یہ کہا تھا اور یقینا کہا تھا، اور یہ یہاں ''امارت'' کے معنی میں ہے، کیونکہ سیاق اسی مفہوم کا مؤید ہے، اور ظاہر ہے جب کوئی لفظ متعدد ومتضاد معانی میں مستعمل ہو تو اس کے مفہوم کی تحدید سیاق وسباق سے ہی ہوتی ہے، اور سیاق ہی اس کی سب سے بڑی سند ہوتا ہے، علامہ جزری کا قول ہم ماقبل میں بطور سند ذکر کر چکے ہیں، یہ رویہ اہلِ علم کے یہاں

معروف ومتداول ہے، مولانا محترم بھی اس سے واقف ہیں، اس تجاہلِ عارفانہ کی وجہ کیا ہے؟ یہ وہی بتائیں گے۔

مولانا کے نظریہ اور فکر کے مطابق اور سیاق وسباق کو نظر انداز کر کے اگر شریعت کی تفہیم وتشریح کا سلسلہ شروع ہو گیا تو پھر دین وشریعت کا خدا ہی حافظ ہے۔

مولانا کا قائم کردہ مفروضہ جو عبارت کے بین السطور سے واضح ہے مان لیجئے اور غور فرمایئے، پھر بتایئے کہ یہ حدیث ''غدیرخم'' کی ہے، ہزار ہا ہزار کی تعداد صحابہ کی موجود ہے، حضرت علیؓ کی خلافت کا اعلان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا دیا ہے، اور تقریبا ۷۰/ ۷۵ روز بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا سے رحلت فرما گئے، ہزار ہا ہزار صحابہ کی تعداد جن کے ذریعہ امت کو شریعت ملی، دین منتقل ہوا، جو احادیث وآثار کے ناقل ہیں، صرف چند روز اپنے نبی کی وصیت نہ محفوظ رکھ سکے، کیا ایسی جماعت پر دین وشریعت کے بارے اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ اور اگر اس تعداد نے یاد تو رکھا لیکن اس کے خلاف عمل کیا تو کیا کتمانِ وصیت کے جرم کے مرتکب نہیں؟ اور کیا (نعوذ باللہ) ہزار ہا ہزار صحابہ کی تعداد مرتد ہو گئی تھی جنہوں نے حضرت ابو بکر وعمر وعثمان کے ہاتھ پر بیعت کی؟ اور خود حضرت علی بھی ان بیعت کرنے والوں میں شامل تھے تو ان کے بارے میں مولانا محترم کی رائے کیا ہے؟۔ اور کیا حضرت علی نے ''تقیہ'' فرمایا تھا؟ اور کیا مولانا شیعیوں کے عقیدہ ''تقیہ'' کے بھی قائل ہیں؟۔

حضرت علیؓ نے پوری زندگی (دورِ صدیقی، دورِ فاروقی، دورِ عثمانی بلکہ وفات تک) میں کبھی اس حدیث سے استدلال نہیں کیا کہ میں امیر ہوں، اور میں ہزار ہا ہزار ہا صحابہ کی موجودگی میں امیر مقرر ہوا ہوں حتی کہ تب بھی نہیں جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے مرض الوفات میں حضرت علی سے فرمایا تھا "إنی لأعرف وجوه بنی عبد المطلب عند الموت فاذهب بنا إلى رسول الله ﷺ فلنسألنه فيمن هذا الأمر إن كان فينا علمنا ذلك، وإن كان فی غيرنا علمناه، فأوص بنا" (حضرت عباسؓ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ میں موت کے وقت بنو عبد المطلب کے چہرہ پہچانتا ہوں، آؤ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جا کر اس امر (خلافت) کے بارے میں دریافت کریں کہ آپ کے بعد کون خلیفہ ہوگا؟ اگر آپ نے ہم کو خلافت دی تو

معلوم ہوجائیگا اور اگر آپ نے کسی دوسرے کو خلافت سپرد کی تو بھی معلوم ہوجائیگا تو (ہم کہیں گے کہ) ہمارے بارے میں (اسے) حسن سلوک کی وصیت فرما دیجئے) تو حضرت علی نے ارشاد فرمایا تھا "إنا والله لئن سألناها رسول الله ﷺ فمنعناها لا يعطيناها الناس بعده وإني والله لا أسألها رسول الله ﷺ" (بخاری: ۴۴۴۷)۔ (حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اللہ کی قسم! اگر ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس امر کے متعلق دریافت کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرما دیا تو آپ کے بعد لوگ کبھی ہمیں خلافت نہ دیں گے، اللہ کی قسم! میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خلافت کے متعلق کبھی سوال نہ کروں گا)۔

حضرت علیؓ نے یہاں یہ کیوں نہیں فرمایا کہ چچا جان آپ پریشان مت ہوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غدیر خم میں میری امامت وخلافت کا اعلان فرما دیا ہے کہ "من كنت مولاه فعلي مولاه، اللهم وال من والاه وعاد من عاداه" اور اس کی گواہ صحابہ کی ہزارہا ہزار کی تعداد ہے!

اور نہ اس واقعہ کے بعد حضرت عمر بن خطاب اور حضرت عثمان کے خلافت کے موقع پر کبھی آپ نے امارت کے سلسلہ میں کسی وصیت کا تذکرہ فرمایا، اگر حضور والا کے پاس کوئی دلیل ہے تو پیش کریں صرف قرائن لغویہ سے اتنا بڑا دعوی ثابت نہیں ہوسکے گا۔

حد تو یہ ہے کہ خود علی رضی اللہ عنہ اس پروپیگنڈہ سے سخت پریشان ہیں جسے عبداللہ بن سبأ اور اس کے ہمنواؤں نے بڑی شدت کے ساتھ عرب میں پھیلایا تھا کہ حضرت علیؓ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی خاص وصیت ہے اور حضرت علی کو بار بار اس کی تردید کرنی پڑی، دیکھئے مسلم شریف کی روایت:

"عن يزيد بن شريك رضي الله عنه قال: رأيت عليا على المنبر يخطب يقول: لا والله، ما عندنا كتاب نقرأه إلا كتاب الله، وما في هذه الصحيفة فنشرها فإذا فيها أسنان الإبل وأشياء من الجراحات، وفيها قال رسول الله ﷺ ذمة المسلمين واحدة يسعى بها أدناهم فمن أخفر مسلما فعليه لعنة الله والملائكة والناس أجمعين، لا يقبل الله يوم القيامة عدلا ولا صرفاً"۔ (مسلم شریف ۸۹)۔

مسلم ہی ایک دوسری روایت حضرت علی سے مروی ہے: قال علی رضی اللہ عنہ: من زعم أن عندنا شئی نقرأہ إلا کتاب اللہ فقد کذب"۔ (مسلم شریف: ۱۳۷۰) اس قسم کی تصریحات صرف مسلم شریف میں نہیں، بخاری میں: ۷۳۰۰، سننِ ابوداؤد میں: ۴۶۶۲، الدرر السنیۃ میں ۱۸۷۰۰۰، نعیم ابن حماد کی کتاب الفتن ۱۷۴، وغیرہ میں موجود ہیں۔ (مسند احمد: ۹۲۱، میں حضرت علی سے روایت ہے "إن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یعھد إلینا عھداً نأخذ بہ فی أمارۃ"۔ (حضرت علی فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خلافت کے بارے میں ہمیں کوئی وصیت نہیں کی)

کیا حضرت علی کی اس قدر واضح صراحت کے بعد بھی کسی انکار کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟ قابل غور بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آخر یہ وصیت (امارت وخلافت) حجۃ الوداع کے موقع پر میدان عرفات میں کیوں نہیں کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ سے فرمایا تھا "أنت أخونا ومولانا"۔ (بخاری حدیث نمبر ۲۶۹۹)۔ آپ کے منطق کے اعتبار سے تو حضرت زیدؓ، حضرت علیؓ سے بھی افضل ہونگے؟ بلکہ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی افضل ہونا ثابت کر سکتے ہیں۔ معاذ اللہ۔

قسط نمبر - ۴

مولانا محترم کا سوال (4): کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مرض الوفات میں جمعرات کے دن ۸ ربیع الاول کو ظہر کی نماز میں نہیں فرمایا تھا کہ "قلم اور کاغذ لاؤ میں وصیت لکھوا دوں" تو ایسا کیا ہوا کہ گھر میں جھگڑا ہونے لگا، اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ناراضگی میں فرمایا کہ **قوموا عنی فإنه لا ینبغی عند النبی التنازع** (میرے پاس سے جاؤ، نبی کے پاس جھگڑا نہیں ہونا چاہئے)۔ کیا نہیں گیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سخت بیمار ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تو ہر بات ہر وقت حجت ہوتی ہے، بیماری میں تو اور زیادہ حجت ہوتی ہے پھر رکاوٹ کیوں ہوئی؟ اور کبار صحابہ میں جھگڑا کیوں ہوا؟ کیا عبداللہ بن عباس حسبِ روایت بخاری جمعرات کے اس دن کو یاد کر کے روتے نہیں تھے؟ (یہ بخاری کے طلبہ کے سوالات ہیں، براہ کرم جواب دیں)۔

جواب: مولانا محترم نے مرض الوفات کی جو منظر کشی کی ہے اس سے سو فیصد اتفاق بھی کر لیا جائے تو بھی ناچیز یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ آخر مولانا کا اشکال کس امر پر ہے؟ اور موردِ طعن وتنقید اب کس صحابی کی ذات گرامی ہے؟ اور مولانا کو شکایت آخر کس کے عمل سے ہے؟ یہاں بھی مولانا نے واضح انداز میں اپنا موقف نہیں رکھا، رہی بات بخاری کے طلبہ کی کہ ان کی جانب سے اس قسم کے اشکالات ہوتے ہیں اور ہونے بھی چاہئیں یہ تو خوشی کی بات ہے کہ طلبہ میں علمی ذوق ہے اور وہ حقائق کی تہوں میں پہونچنا چاہتے ہیں، اس سے ہراساں ہونے کی قطعا کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ پورے عالمِ اسلام اور خاص طور پر برصغیر میں جب سے بخاری کا صحیح تعارف ہوا اور علمی دنیا اسکے مقام وفضل سے آشنا ہوئی تب سے جمہور اہلِ سنت کے مدارس وجامعات میں داخلِ نصاب ہے اور اہلِ علم اس کی تدریس کا فریضہ نہایت اہتمام وتندہی انجام دے رہے ہیں، نہ صرف تدریس بلکہ تحقیق وتعلیق اور شرح وتسہیل کا سلسلہ بھی جاری ہے اور آنجناب کے علم میں ہے کہ خصوصا بخاری پر جمہور اہلِ سنت کا اتنا کام موجود ہے کہ پوری ایک لائبریری تیار ہو سکتی ہے،

اس کے ہر مشکل مقام پر اہل علم کی بیش قیمت علمی نگارشات اور تحقیقات موجود ہیں جن سے ہر قسم کے اشکالات کا ازالہ ہو جاتا ہے، بس شرط یہ ہے کہ تعصب و تنگ نظری اور متشککانہ نقطۂ نظر نہ اختیار کیا جائے، بلکہ جمہور اہلِ سنت کے قائم کردہ خطوط اور معتدل شاہراہ علمِ و تحقیق کے مطابق دیانتدارانہ و عالمانہ روش اختیار کی جائے۔

مشاجراتِ صحابہ کے باب میں جمہور کا منہجِ تحقیق:

جمہور کی تحقیقی و علمی روش کا بنیادی اصول ناقلینِ روایت اور خاص طور پر صحابہ کرام اور بالأخص آسمانِ اسلام کے مہر و ماہ ابوبکرؓ و عمرؓ اور اہلِ بیت اطہار سے حسنِ ظن و عقیدت کے ساتھ ساتھ نصوصِ صریحہ کی پیروی ہے، اور یہ مزاج نہ صرف جمہورِ اہلسنت کا بلکہ خالص اسلامی مزاج ہے، جس کی بنیادیں قرآن و سنت میں جابجا موجود ہیں، یہ مباحث جب ہی پریشاں خاطری اور اضطراب ذہنی کا سبب بنتے ہیں جب عصبیت و تنگ نظری اور صحابہ جیسے گروہ مقدس سے بدظنی کے نظریہ سے زیرِ مطالعہ رکھے جائیں، اور تاریخ و تجربہ شاہد ہے کہ متعصب و بدظن انسان کبھی حقائق و مسلمات اور شواہد و دلائل قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا حتی کہ بسا اوقات قرآنی شواہد و نبوی تصریحات کو بھی خاطر میں نہیں لاتا، اس کی تحقیق کا قصرِ فلک بوس تشکیک و ارتیاب کی کھچیوں پر کھڑا ہوتا ہے، وہ حقائق و مسلمات سے منہ چراتا ہے، منصوصات کی تشریح میں غیر عقلی اور بدگمانی پر مبنی تاویلات کا سہارا لیتا ہے، بطور مثال تمام فرقِ باطلہ اور خصوصاً فکرِ شیعی کے تمام مستدلات کا ایک تحلیلی جائزہ لیجئے یہی حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آئیگی۔

اس تمہیدِ طولانی کا مقصد یہ تھا کہ جویائے علم کا نشانِ منزل اور تحقیق کی پرخار وادیوں میں دلیلِ راہ منصوصات و تصریحات ہونی چاہئیں نہ کہ شک و ارتیاب اور تلبیسات و بدگمانیوں میں ڈوبی ہوئی ذہنیت، ذہن میں کوئی خاص نظریہ رچا بسا کر تحقیق کا سفر نہ کرنا چاہئے، بلکہ احترام و عظمت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے یک گونہ آزادروی اور حقائق و تصریحات کو قبول کرنے کے جذبات سے معمور قلب و دماغ لئے ہوئے سفرِ تحقیق جاری رکھنا چاہئے، یہ طریقہ لغزشوں سے محفوظ و مأمون اور نجاتِ دنیوی و اخروی کا ضامن ہے یہی جمہور اہلِ سنت کی روش اور میدانِ علم

وتحقیق میں ان کا وطیرہ رہا ہے۔

اب مولانا کے سوال کا جواب صحابۂ کرام کی عظمت وتقدس سے معمور دل ودماغ کے ساتھ اور حقیقت پسندی کی عینک لگا کر ملاحظہ کیجئے:

تو ایسا کیا ہوا کہ گھر میں جھگڑا ہونے لگا؟

تو پھر (کتابتِ قرطاس میں) رکاوٹ کیوں ہوئی؟

کبار صحابہ میں جھگڑا کیوں ہوا؟

یہ واقعہ ''واقعۂ قرطاس'' کے نام سے مشہور ومعروف ہے، اور تمام اصحابِ سیر نے اسے بیان کیا ہے، حدیث کی کتابوں میں جہاں بھی یہ واقعہ موجود ہے محدثین نے اس کی شرح وبسط سے کافی ووافی اور تشفی بخش تشریح فرمائی ہے، اور سرخیوں میں موجود ان **سنسنی خیز سوالات** کے عادلانہ ومنصفانہ جواب بھی دیئے ہیں، جو منصوصات کے مطابق بھی ہیں اور قرائنِ عقلیہ سے بھی ان کی تائید ہوتی ہے اور اس واقعہ کے وقت موجود تمام کبار صحابہ کا دامن بھی بدگمانیوں سے پاک رہتا ہے۔ ذیل میں مختصراً واقعۂ قرطاس اور اس پر عصبیت زدہ ذہنیت کے اعتراضات اور ان کے جوابات حاضر ہیں:

''وفات سے چار یوم پیشتر بروز پنجشنبہ جب مرض میں شدت ہوئی تو جو لوگ حجرۂ نبوی میں حاضر تھے بروایت مسند احمد: ۱/۹۰، ان حاضرین میں حضرت علی بھی ہیں) ان سے فرمایا ''کاغذ قلم دوات لاؤ تاکہ تمہارے لئے ایک وصیت نامہ لکھوادوں اس کے بعد گمراہ نہیں ہوگے، یہ سن کر اہلِ مجلس میں ''اختلافِ رائے'' ہوگیا، حضرت عمرؓ نے کہا آپ ﷺ بیمار ہیں ایسی حالت میں تکلیف دینا مناسب نہیں، کتاب اللہ ہمارے پاس ہے (جو ہم کو گمراہی سے بچانے کے لیے) کافی ہے بعض حضرات نے حضرت عمر کی تائید کی، اور بعض نے کہا کہ دوات وقلم لاکر لکھوا لینا چاہئے، اور یہ کہا کہ **أهجر استفهموه**'' کیا آپ ﷺ نے بیماری کی شدت اور غفلت وبیہوشی میں کوئی لغو اور ہذیان والی بات کہی ہے؟ خود آپ ﷺ سے دریافت کرلو۔۔۔۔۔ الی آخرہ''۔

حق وانصاف کی نگاہوں سے دیکھا جائے تو اس میں کوئی قابلِ اشکال بات نہیں ہے، رائے کا اختلاف ہر جگہ ہر حلقہ اور ہر مقدس جماعت میں ہوتا رہا ہے اس موقع پر بھی ہوا، اور صحابہ کے

معاشرہ میں اس کی دسیوں مثالیں ہیں لیکن بغیر تصریح و دلیل ان پر دنیوی مفادات اور سیاست واقتدار کے حصول کا بھوکا ہونے کا الزام لگا دینا بہت گندی ذہنیت ہے، اہلِ تشیع نے ایسا ہی کیا ہے، اور یہ روش قرآنی بیانات کے خلاف ہے، ہمارا عقیدہ ہے کہ تمام صحابہ مخلص تھے، دنیوی مفادات کے مقابلہ میں (۱) اسلام کے مقاصد (۲) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت وعظمت ان پر غالب تھی، یہ صحابہ کی تیئں ہماری اندھی عقیدت نہیں بلکہ اس کی دلیل، قرآنی شواہد اور خود ان کی پاکیزہ زندگیاں ہیں جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، اس موقع پر صحابہ کے درمیان اختلاف رائے ہوا، اس وقت کبارِ صحابہ میں بعض حضرت عمرؓ کی رائے مؤید تھے تو بعض ان کے مخالف، یعنی جن کے پیش نظر "اسلامی مقاصد" کی تحقیق وتکمیل تھی وہ حضرت عمر کی رائے کے خلاف تھے، ان کے پیشِ نظر یہ مقصد تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر جملہ میزانِ وحی میں تولا ہوا ہوتا ہے، اوران کی زبان مبارک، زبانِ حق ترجمان ہے، خود ذاتِ باری اس کی رقیب ہے لہذا جو اس زبان سے نکلے گا وہ حق ہوگا لہذا اسے لکھا جانا چاہئے، دوسری طرف حضرت عمرؓ اوران کے مؤیدین تھے جن کے پیشِ نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت ومحبت اور ان کا آرام وراحت تھا، انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بیماری کے خیال سے، اور شدتِ تکلیف اور غفلت وبیہوشی کی وجہ سے اسے مناسب نہیں سمجھا، حضرت عمر جن کی اسلام فہمی اور موافقِ مشیتِ خداوندی مزاج کی تائید میں ۱۷ آیات نازل ہوئیں، ان کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس جملہ (اس کے بعد گمراہ نہیں ہوگے،) سے غالباً یہ استنباط تھا کہ اس وقت کوئی نئی تعلیم مقصود نہیں ہے بلکہ سابقہ تعلیماتِ اسلامیہ کا بطور تاکید اعادہ ہے، اس مقصد کی خاطر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تکلیف دینا مناسب نہیں"۔

خلاصہ یہ کہ واقعۂ قرطاس میں کبارِ صحابہ کرام کی دو مختلف الآراء جماعتیں تھیں اور دونوں میں اجتہادِ رائے کا اختلاف تھا، اور دونوں حق وصواب پر قائم ودائم تھیں، اوراس کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عدمِ نکیر ہے (اور مولانا محترم تو اصولِ حدیث کی تدریس کا طویل تجربہ رکھتے ہیں ان کو معلوم ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی میں اگر کوئی عمل ہوا ہو اور اس پر نکیر موجود نہ ہو تو علمائے محدثین کی یہاں وہ عمل نہ صرف یہ مؤید من الرسول ہے بلکہ اس سے استدلال کرنا بھی درست ہے، اور وہ عمل قابلِ حجت ہے) ٹھیک اسی طرح جیسے "لا يصلين أحد كم العصر

إلا في بني قريظة" والی حدیث میں صحابۂ کرام کے درمیان اختلافِ رائے ہونے پر کسی کی نکیر زبانِ نبوت سے منقول نہیں، یہاں بھی فریقین میں سے کسی کے خلاف کوئی نکیر موجود نہیں ہے، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خود مولانا محترم کے بیان کے مطابق "کیا پھر اسی دن یہ ثابت کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ایسے بیمار نہیں ہیں ظہر کی نماز میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مسجد تشریف نہیں لے گئے؟ یعنی اسی واقعہ کے تھوڑی دیر بعد، اور نہ صرف یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نماز پڑھی بلکہ ظہر کی نماز کے بعد تقریر بھی کی، اور اسامہ بن زید کی قیادت پر تنقید کرنے والوں پر سخت نکیر فرمائی۔۔۔۔"

مولانا محترم سے ہمارا سوال یہ ہے کہ "اسامہ بن زید کی قیادت پر تنقید کرنے والوں پر سخت نکیر فرمائی" کیا ان کے ساتھ ساتھ کتابتِ قرطاس کے فریقین میں سے کسی ایک پر بھی نکیر فرمائی؟ بلکہ اس کے بعد چار روز تک اس دنیا میں موجود رہے کیا ان ایام میں جبکہ بیماری سے کسی قدر افاقہ بھی ہو گیا تھا آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نکیر فرمائی؟ اگر آنجناب کا جواب اثبات میں ہے تو دلیل پیش کریں، اور اگر نفی میں ہے (اور یقیناً نفی میں ہوگا) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تائید کے بعد اب اس سوال کی جسارت سوائے شیعی ذہنیت کے حامل شخص کے اور کوئی کر سکتا ہے؟؟؟۔

میرا خیال ہے کہ یوں تو ان سوالات: (تو ایسا کیا ہوا کہ گھر میں جھگڑا ہونے لگا؟ تو پھر (کتابتِ قرطاس میں) رکاوٹ کیوں ہوئی؟

کبار صحابہ میں جھگڑا کیوں ہوا؟) کا یہاں کوئی محل نہیں ہے، بلکہ سرے سے کوئی سوالات ہی نہیں ہیں۔ ہاں مولانا محترم کے قائم کردہ سنسنی خیز اندازِ سوال سے اشکال ضرور پیدا ہو رہا ہے کہ "تو ایسا کیا ہوا کہ جھگڑا ہونے لگا؟ تو پھر (کتابتِ قرطاس میں) رکاوٹ کیوں ہوئی؟

کبار صحابہ میں جھگڑا کیوں ہوا؟" میرا خیال ہے یہ سوال اس انداز میں ہونا چاہئے تھا کہ "واقعۂ قرطاس کے موقع پر صحابہ کرام میں اختلاف رائے کی وجہ کیا تھی؟ کتابتِ قرطاس کیوں نہ ہو سکی؟ کبار صحابہ میں اختلاف رائے کی وجہ کیا ہے؟) اس سے اس تصور امامت وخلافت ووصیت کی (جو شیعہ فرقہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بابت رکھتا ہے) ترجمانی کی جھلک نہ محسوس ہوتی جو مولانا محترم کے اندازِ سوال سے جھلک رہی ہے، یہی انداز دیگر سوالوں میں بھی ہے، خیر یہ میرا ایک خیال ہے جس کا صحیح ہونا ضروری نہیں، مولانا محترم زبان وادب کا پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں، انہوں نے یہ اندازِ

سوال کیوں اختیار کیا؟ ظاہر ہے ان کے نزدیک اس کی کوئی نہ کوئی معقول وجہ ہوگی۔

اس واقعۂ قرطاس کو بنیاد بنا کر شیعوں کی جانب سے صحابہ کرام پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہیکہ ''حضرت علی وصی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور وہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امامِ برحق وخلیفۂ بلافصل ہونے کے حقدار ہیں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس موقع پر یہی وصیت قلمبند کرانا چاہتے تھے اور حضرت عمرؓ نے ایسا نہیں ہونے دیا۔

سوال یہ ہے ''وہ وصیت قلمبند ہوئی یا نہیں؟ اگر قلمبند ہوئی تو وہ وصیت کس امر کی بابت تھی؟ اور اگر نہیں ہوسکی تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تبلیغِ شریعت میں کوتاہی سرزد ہوئی؟ حضرت عمرؓ نے اگر کتابت وحی سے روکا تو حضرت علیؓ نے اسے تحریر کیوں نہیں فرمایا جبکہ وہ اس وقت حجرۂ نبوی میں موجود تھے؟ حضرت علیؓ کی موجودگی کی دلیل خود ان ہی روایت کردہ ایک حدیث ہے جو مسند أحمدِ :۱/۹۰ میں ہے:

"عن علي بن أبي طالب رضى الله عنه قال:أمرني النبي ﷺأن آتيه بطبق يكتب فيه ما لاتضل أمته من بعده فخشيت أن تفوتني نفسه، قال:قلت:إني أحفظه وأعيقال:أوص بالصلوة والزكاة وما ملكت أيمانكم"۔ (احمد شاکر نے اس کو حسن قرار دیا ہے اور حافظ نے فتح میں اس روایت پر سکوت اختیار کیا ہے)۔

(ترجمہ: حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے حکم فرمایا کہ میں لکھنے کا سامان لاؤں تاکہ اس کے بعد امت گمراہ نہ ہو مجھے خوف ہوا کہ کہیں آپ کی روح پرواز نہ کر جائے تو میں نے کہا کہ میں نے اس کو یاد کرلوں گا، اسے محفوظ کرلوں گا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں نماز زکاۃ اور غلاموں کے حقوق کے بارے میں وصیت کرتا ہوں)

اس روایت سے منصوص نتائج ملاحظہ فرمائیں:

(۱) حضرت علیؓ بھی اس وقت حجرۂ نبوی میں موجود تھے۔

(۲) قرطاس لانے کا حکم حضرت علیؓ کو رسول للہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیا تھا، (یہ حکم حضرت عمرؓ کو نہیں تھا لہٰذا ان کی ذات گرامی کو موردِ طعن بنانا صحیح نہیں)

(۳) حضرت علیؓ نے فرمایا ''میں یاد کرلوں گا، میں محفوظ کرلوں گا''۔ (یعنی حکم کی ظاہری تعمیل

سے انکار (یا بالفاظِ دیگر ٹال مٹول) حضرت علیؓ نے کیا) حضرت عمرؓ نے نہیں۔
(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وصیت اگرچہ لکھوائی نہیں، لیکن حضرت علیؓ نے اسے یاد کرلیا
(۵) اس وصیت کا امرِ خلافت سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔
(٦) یہ وصیت نماز زکوۃ اور غلاموں کی حقوق سے متعلق تھی۔

مزید اطمئنانِ خاطر کے لیے حضرت علیؓ کا اعتراف خود شیعوں کی مقدس کتاب ''نہج البلاغۃ'' میں ملاحظہ فرمایئے وہاں حضرت علیؓ کا اعتراف موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیعتِ ابوبکرؓ پر ان سے عہد و میثاق لیا تھا:

قال علی بن أبي طالب: رضينا عن الله قضاء ه، وسلمنا لله أمره، أترانی أكذب على رسول الله ﷺ؟ والله لأنا أول من صدقه، فلا أكون أول من كذب عليه، فنظرت فی أمری فإذا طاعتی سبقت بيعتی، وإذا الميثاق فی عنقی لغيری"۔

(نہج البلاغۃ کا خطبہ نمبر ٦ ٣ ملاحظہ ہو)

(ترجمہ: حضرت علی فرماتے ہیں کہ ہم اللہ کے فیصلہ سے راضی ہیں، اور اس معاملہ کو اللہ کے سپرد کرتے ہیں، کیا تم چاہتے ہو کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف جھوٹ بولوں، اللہ کی قسم! میں سب سے پہلے تصدیق کرنے والا ہوں، تو میں سب سے پہلے ان پر جھوٹ باندھنے والا نہیں ہوں گا، میں نے اپنے معاملہ میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ میں اپنی بیعت سے پہلے طاعت کا پابند ہوں اور یہ دوسروں کیلئے مجھ سے عہد لیا گیا ہے)۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خلفاء کی فہرست قلمبند کرانا چاہتے تھے تو بھی حضرت علیؓ کے خلیفۂ اول ہونے پر دلیل نہیں ہوسکتی، کیونکہ مسلم کی روایت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گویا حضرت ابوبکر کی تعیین بطور خلیفۂ اول فرمادی تھی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابتدائے مرض میں مجھے حکم دیا تھا کہ: أدعی لی أباك وأخاك، حتى أكتب كتاباً فإنی أخاف أن يتمنى متمن، ويقول قائل: أنا أولى، ويأبى الله والمؤمنون إلا أبا بكر"۔ (مسلم: ۲۳۸۷)

اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: معاذ الله أن يختلف المؤمنون على أبي بكر"۔

(ابن أبی عاصم: ۱۱۶۳، وصححه الألبانی)۔

(معاذ اللہ کہ مسلمان حضرت ابوبکر کی خلافت کے بارے میں اختلاف کریں)۔

کیا عبداللہ بن عباس حسبِ روایت بخاری جمعرات کے اس دن کو یاد کر کے روتے نہیں تھے؟

جواب: جی ہاں بخاری کی روایت میں ہے کہ حضرت ابنِ عباس اس دن کو یاد کر کے روتے تھے، اور روایت ودرایت ہر دو اعتبار سے ان کا افسوس کرنا ثابت ہے، اور ان کا رونا بھی ثابت ہے، لیکن اس کی وجہ کیا تھی؟ اور کیا صرف حضرت ابنِ عباس ؓ کا رونا اور اظہارِ افسوس کرنا حضرت علی ؓ کے حق میں امامت وخلافت اور وصایت کی دلیل ہو سکتی ہے؟ ظاہر ہے ایسا ہر گز نہیں۔

یہ تو تھے بخاری کے طلبہ کے سوالات جن کے جواب پیش کر دئے گئے اور امید ہے کہ اس تشریح سے ان کے اشکالات رفع ہو جائیں گے۔

اب مسلم شریف کے طلبہ کی جانب سے چند سوالات مولانا کی خدمت میں پیش ہیں، حضرت عبداللہ بن عباس جن کے اظہار افسوس سے حضرت علی ؓ کے خلیفۂ بلافصل یا اول ہونے پر استدلال کیا جا سکتا ہے، ان کے والد حضرت عباس ؓ نے باغِ فدک کے قصہ میں صراحتاً حضرت علی ؓ ان کے بارے میں یہ کلمات امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب ؓ کے سامنے کہے تھے: یا أمیر اللمؤمنین اقض بینی وبین هذا الکاذب الآثم الغادر الخائن"۔

(مسلم شریف: کتاب الجہاد والسیر : باب الفیٔ: ۴۵۷۵)

حضرت عباس ؓ جن کے بارے میں اتنے سخت الفاظ استعمال فرمائیں کیا ان کو خلیفہ بنایا جا سکتا ہے؟ اور کیا حضرت علی ؓ پر لگائے گئے یہ الزمات صحیح ہیں؟ اگر صحیح نہیں تو اس کا کیا مطلب ہے؟ اور حضرت عباس ؓ نے ایسا کیوں فرمایا؟ حضرت ابن عباس ؓ کا کسی نامعلوم امر پر اظہار افسوس حضرت علی ؓ کے حق میں استحقاقِ امامت وامارت کی اگر دلیل بن سکتا ہے تو حضرت عباس ؓ کے اتنی سخت ناراضگی ابطالِ استحقاق امامت وامارت کی دلیل آخر کیوں نہیں بن سکتی؟؟ امید ہے جواب عنایت فرمائیں گے۔

(قسط نمبر-۵)

سوال (5و6): ''کیا پھراسی دن (واقعۂ قرطاس بروز جمعرات) یہ ثابت کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم ایسے بیمار نہیں ظہر کی نماز میں حضور مسجد تشریف نہیں لائے؟ یعنی اس واقعہ کے تھوڑی دیر بعد، اور نہ صرف یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی، بلکہ ظہر کی نماز کے بعد تقریر کی، اور اسامہ بن زید کی قیادت پر تنقید کرنے والوں پر سخت نکیر فرمائی (دیکھئے روایت صحیح بخاری) اور حضرت اسامہ کی قیادت میں لشکر کو رومیوں سے جنگ کرنے کے لیے جانے کا بتاکید حکم فرمایا، اور اس میں حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ وغیرہ حضرات کو بتاکید ساتھ جانے کا حکم فرمایا، اس کے بعد چند گھنٹوں کی تاخیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو برداشت نہ تھی (حدیث وتاریخ کی کتابوں کی ورق گردانی کیجئے اور جواب دیجئے)۔

آپ کو معلوم تھا کہ یہ میرا آخری وقت ہے، جبرئیل نے آپ کو مطلع کر دیا تھا اس موقع پر ابوبکر وعمر کو شام روانہ کر رہے ہیں، جہاں جانے اور واپس آنے میں ڈیڑھ دو ماہ لگتے، ایسا آپ کیوں کر رہے ہیں''؟۔

۶۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بار بار کی تاکید کے بعد یہ حضرات کیوں نہیں روانہ ہوئے؟۔

جواب: ''کیا پھراسی دن یہ ثابت کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم ایسے بیمار نہیں ظہر کی نماز میں حضور مسجد تشریف نہیں لائے؟

قارئین کرام غور فرمایئے، سابقہ سوال اور اس مذکورہ سوال کا اول وآخر ضم کر لیجئے، مولانا کے تعلق سے حسنِ ظن اور عقیدت کی شراب طہور کے جام پر جام نوش کر جایئے، خم پر خم لنڈھا دیجئے، احترام وعظمت کی تمام قبائیں زیب تن کر لیجئے، آدابِ شیخ کے تمام اسباق ازبر کر لیجئے، غور وتدبر کے ہر روزن بند کر دیجئے، عقل وخرد پر پردہ بٹھا دیجئے، صرف ایک روزن کھلا رکھئے کہ "وکلا وعد اللہ الحسنی (اور سب سے اللہ تعالی نے بھلائی کا وعدہ کر رکھا ہے)۔ اور پھر بتایئے

کہ سوال کے پسِ پردہ یہ شیعیت کی بے دلیل ترجمانی نہیں تو اور کیا ہے؟۔

دیجئے جواب، اور کریئے تاویل ان سوالوں کی جو خود مولانا محترم کی تحریر سے پیدا ہو رہے ہیں، ہاں مگر ایمان ویقین اور خدا ے علیم وخبیر کے سامنے جوابدہی کے احساس وشعور کے ساتھ (حاشا ثم حاشا، مولانا محترم کے تعلق سے کسی سوءظن میں مبتلا نہیں، اور ہمیں یقین ہے کہ سبقتِ قلم کیوجہ سے، اور اشتعال وجذبات کی رو میں یہ الفاظ نکل گئے ہوں گے، مولانا محترم سے بصد ادب درخواست ہے کہ اسے حذف فرمادیں کیونکہ اس کی زد کہاں کہاں پڑتی ہے ہم ذیل میں ذکرکریں گے) ہم نے بار بار اس پیرگراف کو پڑھا لیکن اسے کسی اور معنی پر محمول نہ کرسکے، اس جملہ کو مکرر سہ کرر پڑھیئے، اور بتایئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ظہر کی نماز میں (حضرت علیؓ وفضل بن عباسؓ) کے شانوں کے سہارے مسجد اس لئے آئے تھے کہ کتابتِ قرطاس میں رکاوٹ پیدا کرنے والوں کے سامنے یہ بات حجت بن جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیمار نہیں ہیں، اور (اتمام حجت کے لیے) ''نماز کے بعد تقریر بھی کی، اتنا ہی نہیں اسامہ بن زید کی قیادت پر تنقید کرنے والوں پر نکیر بھی کی''؟ (نعوذ باللہ من ذلک)

(۱) کیا یہ سب اس لئے تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیمار نہیں ہیں یہ ثابت ہو جائے؟

(۲) کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عبادتیں بھی خالصۃ لوجہ اللہ نہیں تھیں؟

(۳) اور قرآن حکیم کے بیان "إن صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین" میں کیا صداقت وواقعیت نہیں؟ یا یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کسی اور نبی کے حق میں ہے؟۔

(۴) اگر اس کے یہی معنی ہیں تو (مولانا محترم کے تعلق سے حسنِ ظن کی بنا پر ہمارا سوال مشروط ہے، مولانا محترم کے اعتراف کے بعد وہ اس سوال کے مخاطب ہیں ورنہ نہیں) مولانا محترم کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس اتہامِ صریح کی تشکیکی ذہنیت کے سوا کوئی دلیل ہے؟

یقیناً ہمیں سو بار اعتراف ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمعرات کے دن مسجد تشریف لائے، ظہر کی نماز پڑھی، نہ صرف یہ کہ نماز پڑھی بلکہ جیشِ اسامہؓ کی جلد از جلد روانگی، اور دیگر موضوعات پر مشتمل تقریر بھی کی، یہ سب تسلیم ہے اب بتایئے مدعا کیا ہے؟ آپ جمہور اہلِ سنت کے خلاف استغاثہ دائر کر دیجئے، لیکن وجہِ استغاثہ تو صریح الفاظ میں بیان کریئے؟

ایسا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیوں کر رہے ہیں؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بار بار کی تاکید کے بعد یہ حضرات (حضرت ابوبکر وعمر وابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہم) کیوں نہیں روانہ ہوئے؟۔

قارئین کرام!

سابقہ پیراگراف اور خاص طور پر یہ دونوں سوال آپ ایک بار اور ملاحظہ کیجئے اور بتائیے کہ مولانا کی مراد اس سے کیا ثابت کرنا ہے؟ کیا یہی ثابت کرنا نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علیؑ کی خلافت کی وصیت جو لکھانا چاہتے تھے اور ان کو اپنے بعد امیر مقرر کرنا چاہتے تھے، ان حضرات کی رکاوٹوں کی وجہ سے ایسا نہ کر پا رہے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ان حضرات کا گویا ایسا دباؤ تھا کہ ان کی موجودگی میں اپنی اس خواہش کو عملی شکل نہیں دے پا رہے تھے، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک محکم تدبیر اور حکمت عملی کے ذریعہ ان کو مدینہ منورہ سے دور کرنا چاہا، تا کہ ایک ڈیڑھ مہینہ میں یہ کارِ امامت وخلافت انجام پذیر ہو جائے، لیکن ان حضرات نے اپنی رکاوٹوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تدبیر کو ناکام بنا دیا۔ (نعوذ باللہ من ذلک اُلف اُلف مرات) کتنا صریح الزام ہے کہ پیغمبرِ انقلاب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی پر، جس نے عرب کے وحشی طبیعت انسانوں کو اپنا ایسا گرویدہ بنایا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر ان کے دشمنوں تک نے ان کی اطاعت شعاری، اور اپنے نبی سے ان کی محبت وعقیدت کی قسمیں کھائیں اور کہا کہ "ایسے اطاعت شعار اور اخلاص ووفا کے پیکر چشم فلک نے نہیں دیکھے" اور وہ عظیم پیغمبر نہایت مختصر عرصہ میں ایسا بے وقعت مجبور و بے بس ہو گیا کہ اس کی بات نہیں سنی جا رہی ہے، جس کی ایک آواز پر گردنیں جھک جاتیں تھیں آج وہ سب سرتابی پر آمادہ ہیں، وہ نبی اعظم اپنی تربیت میں اتنا ناکام ثابت ہوتا ہے!!!! یاللعجب۔

مولانا محترم کا یہ سوالنامہ، یہ شبہات، اور یہ سب تگ ودو کیا صرف اس لئے نہیں ہے کہ یہ سب وصایت وامامتِ علیؑ کے دلائل ہیں؟ مولانا محترم صاف لفظوں میں آخر کیوں نہیں کہہ دیتے کہ حضرت علیؑ کو خلیفۂ اول تسلیم کر لیا جائے؟۔ تو پھر "امر خلافت" پر توجہ مرکوز کی جائے اور دلائل کی روشنی میں اس کی تنقیح کی جائے اور پھر اسی مسئلہ پر سیر حاصل بحث کر لی جائے۔

سر دست مولانا محترم کے اس سوال کا جواب حاضر ہے کہ ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بار بار کی تاکید کے بعد یہ حضرات کیوں نہیں روانہ ہوئے؟

مولانا محترم کا یہ اعتراض درحقیقت تین حضرات سے متعلق ہے (۱) حضرت ابوبکر صدیقؓ (۲) حضرت عمر بن خطابؓ (۳) حضرت ابوعبیدۃ بن جراح۔

حضرت ابوبکرؓ پر مولانا کا یہ اعتراض درست نہیں کیونکہ حضرت ابوبکرؓ جیشِ اسامہؓ بن زید میں شامل ہی نہیں تھے، اور اگر ان کی شمولیت کی مولانا محترم کے پاس کوئی دلیل ہے تو پیش کریں، عدمِ شمولیت کی ایک دلیل ملاحظہ فرمائیں:

"عن أبي موسى قال: مرض النبي ﷺ فاشتد مرضه، فقال: مروا أبابكر فليصل بالناس، (متفق عليه، فقد رواه البخاري:٦٧٨، ومسلم:٤٢٠).

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت بھی اسی معنی میں بخاری و دیگر کتب حدیث میں موجود ہے، اور حضرت ابوبکرؓ کو یہ حکم جیشِ اسامہؓ کی جلد از جلد مدینہ سے روانہ ہوجانے کی نبوی تاکید کے بعد کا ہے، اور محض حکم نہیں تھا بلکہ اس حکم میں اصرارِ شدید تھا۔ (اطمئنان کے لیے بخاری کی روایات دیکھ لی جائیں)۔

علامہ ابنِ تیمیہ منہاج السنہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"وأبوبكر لم يكن في جيش أسامة باتفاق أهل العلم ولكن روى أن عمر كان فيهم..." (منهاج السنة٦٣١٨).

اور اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ جیش اسامہ میں حضرت ابوبکرؓ بھی شامل تھے تب بھی کوئی قباحت نہیں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو اس کے بعد گویا نماز کی امامت کا حکم دیا، اور یہ حکمِ ثانی حکمِ اول کے لیے ناسخ ہوگیا، اور یہ حکم بھی زبانِ شارع سے منقول ہے۔

رہا حضرت عمر بن خطابؓ و ابوعبیدہؓ کا مسئلہ کہ وہ جیشِ اسامہ میں روانہ کیوں نہیں ہوئے؟ تو یہ بھی خلاف واقعہ ہے اور سبائیوں کا پروپیگنڈہ ہے، آئندہ سطروں میں ہم نقل کریں گے۔

حضرت عمرؓ جیشِ اسامہ میں شامل تھے، مدینہ سے روانہ ہوگئے تھے، یہ لشکر ابھی مدینہ کے قریب مقام ''جرف'' میں مقیم تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیماری کے عرصہ میں یہ حضرات اپنے

امیر حضرت اسامہ بن زیدؓ سے اجازت لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عیادت کے لیے آتے تھے ٹھیک ویسے ہی جیسے حضرت علیؓ وعباسؓ تیمارداری کے لیے واپس آگئے تھے، اب اگر لشکر ہی روانہ نہیں ہوا تو یہ حضرات کیسے جاتے؟؟ اگر لشکر روانہ ہوتا تو قطعاً یہ حضرات روانہ ہونے میں ایک لمحہ کا توقف نہ کرتے۔

اسی عرصہ میں انتقال کی خبر ملی اور سارے شہر میں بدحواسی کی کیفیت پیدا ہوگئی، سب افتاں وخیزاں مدینہ آئے۔۔۔۔۔اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، خیر مختصرا جواب یہ ہے کہ جب لشکر ہی روانہ نہیں ہوا تو کیسے روانہ ہوتے، اور یاد رہے کہ یہ حضرات امیر لشکر نہیں تھے اس لئے ان پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا، امیر لشکر حضرت اسامہ تھے اور حضرت اسامہؓ نے لشکر روانہ کیوں نہیں کیا؟ اس کا جواب خود انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دے دیا تھا۔

مولانا محترم نے اپنے سوال میں اس امر کی اجازت دی ہے کہ تاریخ وحدیث کی ورق گردانی کی جاسکتی ہے لہٰذا ابن کثیر کی تاریخ کا ایک بیان اس موقع پر نقل کرنا اطمینانِ قلب کا باعث ہوگا ابن کثیر کہتے ہیں:

وقد انتدب كثير من الكبار من المهاجرين الأولين والأنصار في جيشه فكان من أكبرهم عمر بن الخطاب ومن قال:إن أبابكر كان فيهم فقد غلط، فإن رسول الله ﷺ اشتد به المرض وجيش أسامة مخيم بالجرف وقدأمر النبي ﷺ أبا بكر أن يصلي بالناس كما سيأتي، فكيف يكون في الجيش وهو إمام المسلمين بإذن الرسول من رب المؤمنين ولو فرض أنه قد انتدب معهم فقد استثناه الشارع من بينهم بالنص عليه للإمامة في الصلاة التي هي أكبر أركان الإسلام ثم لما توفي عليه الصلاة والسلام استطلق الصديق من أسامة عمر بن الخطاب فأذن له في المقام عند الصديق ونفذ الصديق جيش أسامة كما سيأتي بيانه وتفصيله في موضعه إن شاء الله"۔ (البداية والنهاية ص۲۴۳،)

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں حضرت اسامہ کے لشکر میں مہاجرین وانصار کی بڑی تعداد شامل تھی جن میں سب سے بڑی شخصیت حضرت عمر کی تھی جس نے یہ دعوی کیا جیشِ اسامہ میں حضرت

ابوبکر بھی شریک تھے اس نے غلطی کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مرض وفات میں مبتلا ہو چکے تھے اور جیشِ اسامہ ''جرف،، میں خیمہ زن تھا اور حضرت ابوبکر کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز پڑھانے کا حکم دیا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے حضرت ابوبکر مسلمانوں کے امام تھے وہ بھلا لشکر میں کیسے شریک تھے تو نماز پڑھانے کا حکم دئے جانے سے پہلا حکم منسوخ ہو گیا، پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہو گئی اور حضرت ابوبکر خلیفہ ہوئے تو آپ نے حضرت اسامہ حضرت اسامہ سے اجازت لے کر حضرت عمر کو اپنے پاس روک لیا اور جیشِ اسامہ کی تنفیذ فرمائی۔

مولانا محترم کی شبہات کی وجہ:

مولانا محترم کی شبہات کی وجہ غالبا وہ حدیث ہے جو اہلِ تشیع اور روافض میں بہت مشہور ہے، اور وہ روایت سراسر باطل بے بنیاد ہے بلکہ اہلِ علم کے نزدیک روافض کی من گھڑت ہے، اوران کی بے شمار کتابوں میں موجود ہے وہ یہ ہے:

"لعن الله من تخلف عن جيش أسامة" (أنظر المهذب لابن البراج ۱/۱۳، الإيضاح لابن شاذان: ۴۵۴، ووصول الأخيار للعاملي: ۶۸)۔

یہ روایت اہل تشیع کی ایجاد کردہ ہے اور محض کبار صحابہ کی ذات کو متہم کرنے کی خاطر وضع کی گئی ہے، اس کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں سوائے اس کے کہ اہل تشیع و روافض کے یہاں اس کا رواج ہے مذکورہ کتابوں کے علاوہ ان کی دیگر کتب میں بھی یہ روایت موجود ہے، روافض کا تعصب و ناعاقبت اندیشی دیکھئے کہ شدت پسندی اور تعصب میں اس ورایت کو وضع کرتے ہوئے یہ بھی فراموش کر دیا کہ اس کی زد خود امیر المؤمنین حضرت علیؓ پر پڑے گی، مولانا محترم نے چونکہ خود روایت سے استدلال نہیں کیا اسلئے ہم اس پر کلام سے صرف نظر کرتے ہیں۔

مولانا محترم اپنے تمام سوالات میں جیسا کہ ظاہر ہے دو مقاصد ثابت کرنا چاہتے ہیں (۱) حضرت علی کا خلیفہ اول ہونا (۲) دوسرے صحابہ کرام خصوصاً اکابر صحابہ کا حرص دنیا میں اس قدر مبتلا ہونا کہ فرمان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعمیل بھی نہ ہوسکی۔ نعوذ باللہ من ذلک۔

ہم یہاں خلفاے راشدین کے حق میں ان کے زہد و اتقاء، ورع و احتیاط، استغنا اور متاعِ

دنیوی سے کمالِ بے نیازی کے مظاہر خلفاے راشدین اور خصوصاً حضرت علیؓ کے بیانات کی روشنی میں پیش کریں گے۔

خلفائے راشدین کا خلافت کے باب میں کمالِ استغنا:

قبولِ خلافت کے بعد حضرت ابوبکر نے جو خطبہ دیا اس میں ان کا زہد واستغنااور ورع واحتیاط کا اندازہ ہوتا ہےاور معلوم ہوتا ہے یہ حضرات امر خلافت کوایک بہت حساس اوراہم ذمہ داری خیال کرتے تھے، ان کے نزدیک امر خلافت کوئی دنیوی عہدہ، اور مادی ترقی کی حصول کا زینہ نہیں تھا حضرت ابوبکر نے ایک خطبہ میں فرمایا:

"والله ما كنت حريصا على الإمارة يوماً ولا ليلة قط، ولا كنت فيها راغباً، ولاسألتها الله عز وجل فى سر وعلانية ولكنى أشفقت من الفتنة، ومالى فى الإمارة من راحة ولكن قلدت أمرا عظيما، مالى به من طاقة ولايد إلا بتقوية الله عز وجل، ولوددت أن أقوى الناس عليها مكانى"۔

(ترجمہ: واللہ میں خلافت وامارت کا کبھی خواہاں نہیں رہا، اور نہ کبھی اس کا طالب رہا، خلوت وجلوت میں کبھی اللہ رب العزت سے اس کی دعا کی ،لیکن مجھے فتنہ کا اندیشہ ہوا، میرے لئے خلافت کوئی آرام دہ معاملہ نہیں ہے، مجھے ایک عظیم ذمہ داری سپرد کی گئی ہے، اللہ رب العزت کی تائید وتقویت کے بغیر اس امر خلافت کے بارگراں کا میں متحمل نہیں، میری خواہش ہے کہ لوگوں میں سب سے طاقتور انسان میری جگہ ہوتا)۔

حضرت ابوبکر کی ایک اور تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس ذمہ داری کی نزاکت اور خلافت سے متعلق فریضہ کی عظمت کا ان کو جو حد درجہ احساس تھا، اور اللہ کے سامنے جواب دہی کا کتنا شدید خوف رکھتے تھے، وہ اسے لقمۂ تر نہیں سمجھتے تھے جس کے لیے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کریں، انہوں نے ایک بار فرمایا لوگو مجھے تمھارا حاکم بنایا گیا ہے، میں تم لوگوں سے بہتر نہیں، لہذا مجھے حق پر دیکھو تو میرا تعاون کرو، غلط راستہ پر دیکھنا تو سیدھا کر دینا، تمہارے بارے میں جب تک میں طاعتِ الٰہی پر کاربند رہوں میری بات ماننا، اگر میں نافرمانی کروں تو

پھر میری اطاعت تم پر ضروری نہیں''۔

اور خاص طور پر یہ قول سرمۂ بصیرت بنانے کے لائق ہے، حضرت ابوبکر نے بیعت کے بعد اپنی تقریر میں فرمایا: ''لوگو میں بوڑھا ہوں، اس کام کی انجام دہی اور نظم وضبط رکھنے کے لیے مجھ سے زیادہ کسی طاقتور کو مقرر کرلو'۔ (طبقات ابن سعد: ۳/ ۳۱۲)

ایک موقع پر فرمایا:

"وددت أني يوم سقيفة بني ساعدة كنت قذفت الأمر فى عنق أحد الرجلين: أبي عبيدة وعمر فكان أمير المؤمين و كنت وزيرا"۔

(کاش سقیفہ بنی ساعدہ میں یہ ذمہ داری میں ابوعبیدہ یا عمر کے گلے میں ڈال دیتا وہ امیر المؤمنین ہوتے اور میں ان کا وزیر ہوتا)۔

ایک دو بار نہیں حضرت ابوبکرؓ کے خلافت سے بیزاری کے جذبات بار بار ظاہر ہوئے اور انہوں نے اس امر سے اپنے استغنا کا اظہار کرتے ہوئے بار بار کہا:

"أيها الناس هذا أمركم إليكم، تولوامن أحببتم على ذلك، وأكون أنا كأحدكم فقد قال:فأجابه الناس رضينا بك قسما وحظا، و كنت ثاني اثنين من رسول الله ﷺ"۔

(اے لوگو اپنی خلافت اپنے پاس رکھو جس کو چاہو اس کو خلیفہ بنا لو میں تم میں سے ایک عام انسان کی طرح رہوں گا، لوگوں نے کہا ہم آپ سے راضی ہیں، آپ ثانی اثنین ہیں)۔

اور خود حضرت علی کی زبانی ان حضرات اور خاص طور سے حضراتِ شیخین کی بے نفسی و بے لوثی اور متاع دنیا سے مکمل بیزاری، انقطاعِ اِلی اللہ کی شہادت ان الفاظ میں ملاحظہ ہو، یاد رہے کہ یہ روایت ۸۰ سے زیادہ رواۃ نے حضرت علی سے نقل کی ہے:

"خير هذه الأمة بعد نبيها أبوبكر ثم عمر"۔ (بخاری ۳۶۷۱، ابوداؤد: ۴۶۲۹، ابن عاصم کی السنۃ: ۱۲۰۶)۔

قارئین فیصلہ کریں کہ حضرت علیؓ سے زیادہ شیخین کے مقام ومرتبہ سے کون آشنا ہوگا؟ اور شیخین کے مقامِ بلند کی گواہی حضرت علیؓ سے زیادہ کس کی معتبر ہوگی؟۔اس شہادت کے بعد

رافضیت کا ناطقہ بند ہوجانا چاہئے تھا لیکن ظاہر ہیکہ تعصب، حقد وحسد اور خبثِ باطن کی وجہ سے ان کو کسی کل چین حاصل نہیں ہورہا، حضرت علیؓ تو یہ تمنا فرمایا کرتے تھے کہ وہ اس دنیا سے جب رخصت ہوں اوران کا سامنا ان کے پروردگار سے ہوتو کم ازکم حضرت عمرؓ کے برابران کے اعمال ہوں''۔

ذیل میں حضرت علیؓ کا ایک خط نقل کیا جاتا ہے جو انہوں نے حضریت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف تحریر کر کے روانہ کیا تھا، اس خط کو شیعی علماء یعنی شارحین نہج البلاغۃ نے اپنی شروح میں درج کیا ہے:

''وكان أفضلهم فى الإسلام كما زعمت وأنصحهم لله ولرسوله الخليفة الصديق والخليفة الفاروق، ولعمرى أن مكانهما فى الإسلام لعظيم وإن المصاب بهما لجرح فى الإسلام شديد يرحمهما الله، وجزاهما الله بأحسن ماصيلا''۔ (دیکھئے شرح نہج البلاغۃ لابن ہیثم البحرانی ص۴۸۶ رجلد ۳، طبع قدیمی ایران نیز جلد ۴ رص ۳۶۲ مطبع حیدری طہران)۔

ترجمہ: ''یعنی اسلام میں سب لوگوں میں افضل جیسا کہ تم نے کہا اللہ اور رسول کے ساتھ سب سے زیادہ اخلاص رکھنے والے خلیفہ خلیفہ ''صدیق تھے، اور خلیفہ فاروق تھے، اور مجھے اپنی زندگی کی قسم یقینا اسلام میں ان دونوں (خلفاء) کا مقام بہت عظیم ہے، اور ان کو (موت کی) مصیبت پہنچ جانا اسلام کے لیے شدید زخم تھا۔ اللہ تعالی ان دونوں پر رحم فرمائے اور ان دونوں کو ان کے بہترین اعمال کے موافق خیر عطا فرمائے''۔

حضرت علی کی ان بیانات سے مستفاد فوائد اختصار کے ساتھ ذیل میں ملاحظہ ہوں:

(۱) حضرات شیخینؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سب سے افضل مقام ومرتبہ کے حامل، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سب سے زیادہ خیر خواہ تھے۔

(۲) اسلام میں ان کا مرتبہ سب سے عظیم اور عالی تھا۔

(۳) ان حضرات کی وفات اسلام کے حق میں شدید نقصان کا باعث ثابت ہوئی۔

(۴) حضرت علیؓ ان جیسا ہونے کی تمنا فرماتے تھے۔

(۵) حضرت مرتضیٰؓ ان کے حق میں کلماتِ ترحم فرماتے تھے اور ان کے حق میں دعائیں فرماتے تھے۔

خلفائے راشدین اور خاص طور پر رشد وہدایت کے منارۂ نور، اخلاص و بے لوثی کے یہ دو معیار حضرات شیخین کا امارت وخلافت کے سلسلہ میں یہ رویہ رہا، انہوں نے حاکم ہونے کے باوجود زہد واتقاء اور ورع واحتیاط کی وہ مثالیں پیش کیں کہ چشمِ فلک نے کسی نبی کے متبعین میں ایسی مثالیں نہ دیکھی ہوں گی، جب تک دنیا میں رہے زاہدانہ آن بان شان سے رہے، اور جب دنیا سے رخصت ہوئے تو اس حال میں کہ اپنا پورا سرمایۂ حیات (وقت، طاقت، دولت) اسلام کے نام پر قربان کر چکے، رافضیوں سے کہنا ہے کہ (اگر حضرات شیخین حصولِ اقتدار اور متاعِ دنیا کی خاطر (رافضیوں کے الزام کے مطابق) منصوبہ بندیاں کرتے رہے، نبی کے خلاف سازشیں رچتے رہے) ان کے خلاف سی بی آئی انکواری کرلیں اور بتائیں کہ ابوبکر وعمر نے جب اسلام قبول کیا تو ان کی مالی حیثیت کیا تھی؟ اور جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تب صورتحال کیا تھی؟ ورنہ ان شبہات کا کیا مطلب کہ۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بار بار کی تاکید کے بعد یہ حضرات (حضرت ابوبکر وعمر وابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہم) کیوں نہیں روانہ ہوئے؟۔

اور یہ وہی رافضی ذہنیت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بار بار کی تاکید کے بعد "لا تسبوا أصحابي فلو أن أحدكم أنفق مثل أحد ذهباً ما بلغ مد أحدهم ولا نصيفه" (بخاری: ۳۶۷۳) بھی باز نہیں آتی۔

اور ابن بطہ نے باسناد صحیح حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے "لا تسبوا أصحاب محمد فإن الله قد أمرنا بالاستغفار لهم وهو يعلم أنهم سيقتتلون" (أحمد فضائل صحابة)۔

(ابن عباس سے روایت ہے کہ اصحاب محمد کو برا بھلا نہ کہو کیونکہ اللہ تعالی نے ان کے حق میں ہمیں استغفار کا حکم دیا ہے، حالانکہ اللہ تعالی کو خوب معلوم تھا کہ وہ باہم دست وگریباں ہوں گے)۔

(میرے اصحاب کو برا بھلا نہ کہو کیونکہ تم میں سے کوئی اگر اُحد پہاڑ کے برابر سونا خرچ

کرے تو بھی وہ ان کے مد اور آدھے مد کے برابر نہیں پہنچ سکتا)

حیرت!! سو بار حیرت ہوتی ہے لیکن حضرت عائشہ کا یہ قول اطیئنان قلب کا باعث بن جاتا ہے ایک شخص نے حضرت عائشہؓ کے پاس آکر شکایت کی کہ لوگ اُصحاب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تنقید وتبصروں کا نشانہ بناتے ہیں حتی کہ ابوبکرؓ وعمرؓ کو بھی، تو اماں عائشہ نے فرمایا "یا بنی إن أصحاب محمد كانوا مع رسول الله وكان الله يجري لهم أجورهم فلما قبضهم الله أحب أن يجري ذلك الأجر لهم. (الآجري في الشريعة: ١٩٩٩).

(حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اصحاب محمد اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے تو اللہ تعالی ان کو اجر عطا فرماتا تھا، اب جبکہ ان کا انتقال ہو گیا ہے تو اللہ تعالی کی مشیت یہ ہوئی کہ ان کا اجر ان کو ملتا رہے)۔

انھیں رافضیوں کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو وصیت کی تھی "یا علي سيكون في أمتي قوم ينتحلون حب أهل البيت لهم نبذ يسمون الرافضة قاتلوهم فإنهم مشركون". (طبراني: ١٢٩٩٨، أبو يعلى: ٣٥٨٦، والبزار: ٢٢٢٢، وحسن الهيثمي في المجمع إسناده: ١٦٤٣٤)

قسط نمبر-٦

سوال نمبر (8): ''دوشنبہ ۱۲ ربیع الأول ۱۱ھ میں آپ کا انتقال ہوا، تو حضرت عمرؓ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، ان کا دماغ حاضر نہیں رہا، اور جب حضرت ابوبکرؓ کی تقریر سے حقیقت واضح ہوگئی، تو ان کا بیان ہے کہ ان کے پیروں نے جواب دے دیا، اور بے طاقتی کے عالم میں بیٹھنے پر مجبور ہو گئے، پھر سقیفہ بنی ساعدہ کی میٹنگ کی اطلاع پر انہوں نے وہاں جانے کا فیصلہ کیا تو صرف حضرت ابوبکرؓ وابوعبیدہؓ کو ساتھ لیا، حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کو جو گھر ہی میں موجود تھے ساتھ کیوں نہیں لیا؟؟ (سیرت وتاریخ کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص یہ سوال کرتا ہے)۔

اس سوال پر جناب مفتی صاحب! یہ الزام نہ لگا دینا کہ لیجئے حضراتِ شیخین کی بے حرمتی ہوگئی، ان باتوں کا صرف علمی جواب دیں، ادھر ادھر کی باتیں نہ کریں۔

جواب: دامن پہ کوئی چھینٹ، نہ خنجر پہ کوئی داغ تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

جناب شیخ نے یہاں بھی صرف سوال کے ذریعہ آسمان رشد وہدایت کے نیر تاباں، اور صدق واخلاص کے مہر وماہ حضراتِ شیخین کی ایک عظیم خدمتِ اسلام کو داغدار کرنے کی کوشش کی ہے، جس خدمت کا حق تو یہ تھا امت مسلمہ رہتی دنیا تک ان کے حق میں دعاؤں کا اہتمام کرتی، آج تک اس ایک قربانی کا حق دنیا ادا نہیں کرسکی، لیکن ستم ظریفی کی انتہا تو دیکھئے بجائے ادائے شکر کے ان کا یہی کارنامہ لائق تنقید بنا لیا گیا، وہ صدیق اعظم جس کی صدیقیت کی گواہی قرآن نے دی، وہ فاروق اعظم جسکے ارادوں کی تائید مشیت ایزدی نے کی، دبے لفظوں میں ان کے کردار کو مشکوک بنایا گیا، اس کے باوجود یہ اصرار ہے کہ اسے بے احترامی نہ سمجھا جائے، حضور والا ''بے احترامی'' نہ سمجھا جائے تو کیا سمجھا جائے؟ اگر یہ بے احترامی نہیں تو پھر بے احترامی کیا ہے؟ یہ تو ایسے ہی ہوا جیسے کسی کو برسر عام رسوا کر دیا جائے اور کہہ دیا جائے اس کو رسوائی مت خیال

کرنا، ما لکم کیف تحکمون۔

وہ نفوسِ قدسیہ جو علم شرعی و حقیقی کا منبع ہوں، جن سے علمِ دین کی ابتدا ہوتی ہو، جو واقفِ اسرارِ شریعت ہوں، جو وحی ربانی کے ترجمان ہوں، ان کو موردِ طعن بنا کر اب کس علمی بحث کا ہم سے مطالبہ ہے؟ وہی تو ہمارے علم کی ابتدا و انتہا ہیں، جمہور اہلِ سنت کا علم ان ہی سے شروع ہو کر وہیں ختم ہو جاتا ہے؟ خدارا اس سے زیادہ کے ہم متحمل نہیں، ان کا قول و عمل بھی اگر دائرۂ شک میں آ جائے اور ان کو نقد و تمحیص کی کسوٹی میں پرکھا جانے لگا تو بھلا بتایئے کہ شریعتِ اسلامیہ اور قوانین اسلامی کی حیثیت کیا رہ جائے گی۔ وہ ہمارے دین کی بنیادیں ہیں اب آنجناب ہمیں باخبر فرمائیں جب صحابہ کی ذات گرامی کے خلاف مقدمہ دائر ہے، تو اب تو قرآن بھی (نعوذ باللہ) حجت نہ رہا، احادیث کی حجیت مشکوک ہوگئی، اور فقہاء کے استنباطات اب کس شمار و قطار میں، تو اب ہم کون سی دلیل پیش کریں؟ اب کس کا بیان قابلِ اعتبار ہوگا؟۔

مولانا محترم کا حکم ہے ان باتوں کا علمی جواب دیا جائے، ادھر ادھر کی باتیں نہ کی جائیں، لیکن اب کون سا علم باقی رہا؟ ہم تو جو بھی کہیں گے اس کا آخری سرا تو یہی صحابہ ہوں گے جن کا کردار خود شک کے دائرہ سے باہر نہیں ہماری عقل حیران ہے اب کس دلیل سے بات کریں، منصوصات واحادیث کے سوا ہمارے پاس کچھ ہے بھی تو نہیں؟۔ لیکن کیا کریں تعمیلِ حکم بھی تو ضروری ہے؟

مولانا محترم کی خدمت میں بہت اختصار اور سادگی کے ساتھ اس سوال کا جواب عرض کیا جاتا ہے کہ

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات حسرت آیات کا سانحہ پیش آنے کے بعد جو رنج و غم کی صورتحال پیش آئی کہ صحابۂ کرام کے فرطِ عقیدت و محبت میں اوسان خطا ہو گئے، تہلکۂ عظیم برپا ہو گیا، حضرات صحابہ اور خاص طور پر حضرت عمرؓ کی جو کیفیت ہوئی آنجناب نے خود بیان فرمائی ہے وہ اس انتقال کی خبر کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے، ان کے پیروں نے جواب دے دیا، اور بے طاقتی کے عالم میں بیٹھنے پر مجبور ہو گئے۔۔۔۔ اس کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ کی میٹنگ ہوئی، جس میں انصار کے دونوں قبیلے اور ان کے سردار موجود ہیں، اور ان کا ارادہ ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی جائے، رفتہ رفتہ اس امر کی اطلاع حضرت عمرؓ اور پھر حضرت ابو بکرؓ کو

پہنچی، یہ دونوں بزرگ مع ابوعبید بن الجراح کے اس اختلاف کی روک تھام کے لیے سقیفہ بنی ساعدہ کی طرف چلے، مبادا کوئی فتنہ نہ کھڑا ہوجائے، راستہ میں عاصم بن عدی اورعویم بن ساعدہ سے ملاقات ہوگئی، عاصم اورعویم نے ان کو وہاں جانے سے روکنا چاہا،لیکن یہ نہ رکے اور جس قدر جلد ممکن ہوسکا سقیفہ میں جہاں انصار مجتمع تھے پہنچ گئے،اور پھر وہاں بحث ومباحث اور مناقشہ کے بعد اتفاق رائے سے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ منتخب کرلیا گیا، یہ ناگہانی سانحہ تھا جس سے اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا شدید اختلاف وانتشار گروہ مسلمین میں نہ پیدا ہوجائے کہ پھراس کو کنٹرول کرنا مشکل ہوجائے، اسی متوقع خطرہ کی اطلاع حضراتِ شیخین کو ہوئی، جس کی سرکوبی کے لیے یہ حضرات تشریف لے گئے، حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ گرچہ حجرۂ نبوی میں تھے،لیکن چونکہ یہاں بھی کسی کا رہنا ضروری تھا تاکہ تجہیز وتکفین کا انتظام ہوجائے اور اس امر کے زیادہ حقدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خویش واقارب سے بڑھ کر بھلا کون ہوسکتا تھا؟اس لئے ان کو نہیں بتایا گیا، یہ ایک ہنگامی صورتحال تھی، کوئی سوچا سمجھا منصوبہ نہ تھا، اور نہ کوئی منظم سازش تھی، بس صورتحال کچھ ایسی بنتی گئی کہ تعیینِ خلافتِ ابوبکرؓ کا قصہ پیش آگیا، اوراس کے ذریعہ متوقع انتشار وافتراق پر قابو پالیا گیا، اور ماقبل میں ہم ذکر کرچکے ہیں کہ حضرت ابوبکر قطعاً اس صورتحال سے ناآشنا تھے، ان کو حضرت عمرؓ نے اس پیش آمدہ صورتحال سے باخبر کیا، اور حضرت عمر کو بھی ایک صحابی نے آکر بتایا کہ سقیفہ میں انصار کے مابین خلافت کے معاملہ میں بحث ومباحثہ جاری ہے''۔

یہاں دوامر ذہن میں واضح رہیں ایک تو یہ کہ سقیفہ بنوساعدہ میں حضرات شیخین ابوبکر وعمر کا پہونچنا یہ تو اتفاقی امر تھا اور مشیتِ حق کو یہی منظور تھا، رہا حضرت ابوبکر کی تعیینِ خلافت کا معاملہ تو وہ ایک اتفاق نہیں تھا، بلکہ یہ رسول اللہ ﷺ کا حتمی فیصلہ تھا، اور اس کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے، اور آپ ﷺ کو چونکہ یقین تھا کہ لوگ ابوبکر کے علاوہ کسی اور کی خلافت پر متحد نہیں ہوں گے اور اسی لئے آپؐ نے کتابتِ قرطاس سے صرف نظر فرمایا لیا تھا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہ سے فرمایا تھا "أدعي لي أباك وأخاك، حتى أكتب كتابافإني أخاف أن يتمنى متمن ويقول قائل:أنا أولى ويأبى الله والمؤمنون إلا أبابكر" (مسلم:۲۳۸۷)اور ایک روایت کے یہ الفاظ بھی ہیں: معاذ الله أن يختلف الناس على

أبي بكر"۔

اسی طرح یہ کہنا کہ فضائلِ صحابہ پر نظر رکھے بغیر بس انتظامی مصلحتوں سے تعیینِ خلافت حضرت ابوبکر کے حق میں ہوگئی یہ بھی غلط ہے، سقیفہ کا واقعہ بخاری و دیگر کتبِ حدیث میں جہاں بھی مذکور ہے مطالعہ فرمائیں، وہاں باقاعدہ خلیفہ کے مقام ومرتبہ کا تعین فضائل اور دلائل کی روشنی میں کیا گیا اور سب نے باتفاق حضرت ابوبکر کو سب سے افضل تسلیم کیا ہے۔

دوسری بات یہ بھی ذہن میں رہے کہ حضرت عباس وحضرت علی کے ناگہانی صورتحال کی وجہ سے سقیفہ نہ پہنچ پانے کی دلیل علامہ ابن حجر کی وہ روایت ہے جو انہوں فتح الباری میں مسند ابویعلی سے روایت کی ہے اور سکوت فرمایا ہے اور ابن حجر کا سکوت خود ان کے بیان کے مطابق صحت کی دلیل ہے روایت ملاحظہ فرمائیں:

عن مالك عن الزهري قال:فبينما نحن في منزل رسول اللهﷺإذا رجل ينادي من وراء الجدار:أن اخرج إلي ياابن الخطاب فقلت:إليك عني، فإنا عنك مشاغيل، يعني بأمر رسول ﷺفقال له:إنه قد حدث أمر، فإن الأنصار اجتموا في سقيفة بني ساعدةفأدركوهم قبل أن يحدثوا أمرايكون فيه حرب۔ قال:فقلت لأبي بكر انطلق فذكره۔قال: فانطلقنا نؤمهم حتى لقينا رجلان صالحان فقالا: لا عليكم ألا تقربوهم، واقضوا أمركم قال: فقلت: والله لنأتينهم فانطلقنافإذا بين ظهرانيهم رجل مزمل فقلت من هذاقالوا سعد ابن عباده۔۔۔۔۔"

(حضرت عمرؓ کا بیان ھے کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خانۂ مبارک میں بیٹھے تھے کہ دفعتاً دیوار کے پیچھے سے ایک آدمی نے آواز دی کہ ابن خطاب ذرا باہر آؤ میں نے کہا چلو ہٹو ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بندوبست میں مشغول ہیں، اس نے کہا کہ ایک قابلِ توجہ حادثہ پیش آیا ہے یعنی انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہیں اس لئے جلد پہنچ کر ان کی خبر لو کہیں ایسا نہ ہو کوئی ایسی بات ہوجائے کہ باعث قتال اور سببِ حرب وضرب بن جائے، تو میں نے ابوبکر سے کہا کہ چلئے، وہ فرماتے ہیں کہ ہم چلے، راستے میں دو صالح بزرگ ملے انہوں نے کہا کہ آپ ان کے

پاس (یعنی انصار کے مجمع میں) نہیں جا سکتے ، اپنا معاملہ خود دیکھ لو، حضرت عمرؓ نے کہا واللہ ہم ضرور جائیں گے، لہذا ہم چلے، وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک صاحب چادر اوڑھے بیٹھے ہیں حضرت عمر نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ سعد بن عبادہ ہیں ۔۔۔۔)۔

مولانا محترم کے سوال کا انداز کچھ ایسا ہے کہ جیسے جبراً حضرت علیؓ وحضرت عباس کو جانے سے روکا گیا ہو، اور منصوبہ بندی کے تحت اور باہمی مشورہ سے ان تینوں حضرات نے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ نامزد کر دیا ہو، اور اس میں صرف ان کی نفسانی خواہش کی تکمیل مقصود ہو، اسلام کی سربلندی اور جماعتِ مسلمین کا مفاد ان کو عزیز نہ رہا ہو۔ (بیعت ابوبکر کی تفصیل حضرت عمر کی زبانی (بخاری: ٦٨٣٠) میں مذکور ہے، جس سے اس واقعہ کی تفصیل معلوم ہوتی ہے)

مولانا محترم سے ہمارا سوال یہ ہے کہ اس صورتحال میں حضرات شیخینؓ نے جو بھی کیا وہ ازروئے شریعتِ اسلامیہ کیا غلط تھا؟ اگر غلط تھا تو ان کو کیا کرنا چاہئے تھا؟ اور اس کو غلط کہنے کی دلیل کیا ہے؟ صرف شبہات وبدگمانیوں کی بنیاد پر ان پاکیزہ ہستیوں کو متہم مت کریئے، انہوں نے جو کچھ بھی فیصلہ لیا وہ عین جماعتِ اسلام کے مفاد میں تھا، اور وہ اپنے ارادوں میں مخلص تھے اور اس کی گواہی خود حضرت علی مرتضیٰؓ نے دی۔ ہم ان کے بیانات پیش کر چکے ہیں مزید اور کچھ بیانات آئندہ پیش کریں گے۔

مسئلۂ خلافت ووصایت علیؓ :

مولانا محترم نے یہ شبہ درحقیقت اپنے اسی دعوی کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے یعنی حضرت علی خلیفۂ اول اور وصی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، اور ان حضرات (ابوبکر وعمر) نے گویا سازش اور مکر وفریب سے زمامِ خلافت ووصایت پر قبضہ جما لیا، اور ان کو سقیفہ نہ لے جانا اس امر کی دلیل ہے۔

مولانا محترم نے اس وصایت کی کہیں کوئی نص صریح نہیں پیش کی، اس باب میں ان کے پاس سوائے شبہات وتخیلات کے کچھ بھی نہیں، اور طرفہ تماشہ تو یہ ہے کہ خود حضرت علی (جن کے حق میں مولانا کا دعوی ہے) وہی اس وصایت کے سب سے بڑے مخالف ہیں، اس مخالفت کے بعض دلائل ہم سابقہ مباحث میں پیش کر چکے ہیں مزید اور دلائل ملاحظہ فرمائیں:

(۱) حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مرض الوفات میں سوال کیا گیا کہ ''اے امیر المؤمنین! آپ ہم پر خلیفہ کیوں نہیں بنا دیتے، حضرت علیؓ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی کو خلیفہ نہیں بنایا، تو میں کیوں خلیفہ بناؤں؟ لیکن اگر اللہ تعالی کا ارادہ لوگوں کے ساتھ خیر کا ہوگا تو میرے بعد لوگوں کو کسی بہتر آدمی پر متفق اور مجتمع کر دے گا، جیسا کہ اللہ تعالی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں کو کیسے بہترین انسان یعنی ابوبکر پر متفق اور مجتمع کر دیا (رواہ البیہقی باسناد جید: ۸/۱۴۹)۔

(۲) ابن کثیر نے البدایہ والنہایۃ میں سفیان ثوری کی یہ روایت نقل کی ہے کہ

''اے لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں امارت اور خلافت کے بارے میں کوئی وصیت نہیں فرمائی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد سب کی متفقہ رائے سے ابوبکر خلیفہ مقرر ہوئے اور خلافت کا کام نہایت عمدگی سے انجام دیا، یہاں تک کہ دنیا سے رخصت ہوئے پھر ابوبکر نے اپنی رائے سے عمر کو خلیفہ مقرر کیا، عمر نے نہایت خوبی سے خلافت کا کام انجام دیا، یہاں تک کہ دنیا سے رخصت ہوئے''۔ (البدایۃ والنہایۃ ۵/۲۵۰)

(۳) صحیحین میں ہے کہ حضرت علیؓ نے خطبہ دیا اور یہ فرمایا کہ ''جو شخص یہ گمان کرے کہ ہمارے پاس سوائے کتاب اللہ کے اور اس کے صحیفہ کے جس میں دیات وغیرہ کے احکام ہیں کوئی اور کتاب اور کوئی وصیت نامہ ہے تو وہ بالکل جھوٹ بولتا ہے''۔

(۴) اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؓ کو خلافت کے لیے نامزد کیا ہوتا ہے ناممکن اور محال تھا کہ صحابہ کرام اس پر عمل نہ کرتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ کاروانِ صدق ووفا جس نے نبی کی مرضی پر تمام خواہشات کو مٹا دیا ہو، جنہوں نے جان ومال اور خویش واقارب سب قربان کردئے ہوں ان کی نسبت یہ بدگمانی کہ انہوں نے دیدہ ودانستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت کو رد کر دیا یہ قرآن کریم کی صریح تکذیب ہے جو صحابہ کرام کی توصیف سے بھرا پڑا ہے۔

(۵) حضرت علی کے نزدیک اگر صدیق اکبر کی خلافت حق نہ ہوتی تو ضرور ابوبکر سے مقابلہ اور مقاتلہ کرتے جیسے حضرت معاویہ سے کیا اس لئے کے ''اسد اللہ الغالب'' ہونے کے بعد

اعداء اللہ سے مقابلہ نہ کرنا غایت درجہ بزدلی اور ایمان کی کمزوری ہے، چنانچہ حضرت علی کا اس سے سکوت کی وجہ اگر لاچاری اور مجبوری تھی تو لاچار اور مجبور آدمی لائقِ امارت وخلافت کیسے ہوسکتا ہے؟ اور اگر یہ کہا جائے کہ حضرت علی نے باوجود قدرت کے اپنی خلافت کی نص یا وصیت کو ''تقیہ'' کے عقیدہ کے تحت ظاہر نہیں کیا تو یہ بزدلی بھی ہے اور نفاق بھی ہے اور کیا بزدل اور منافق خلیفہ ہوسکتا؟۔ (البدایۃ والنہایۃ: ج/۵،ص/۲۵۲)

(۶) حضرت علیؓ یا حضرت عباسؓ وغیرہ میں سے کسی کی خلافت کے متعلق کوئی نص یا وصیت ہوتی تو وہ قطعاً متواتر ہوتی، اس کا چھپا رہنا عادۃً محال ہوتا ضرور وہ نص مجلس میں پیش ہوتی، جیسے ابوبکر صدیق نے انصار کے سامنے جب حدیث پیش کی ''**الائمة من قريش**'' تو انصار نے فوراً اس کی اطاعت کی اور اپنی امارت کے خیال کو چھوڑ دیا، نیز اگر خلافت کے بارے میں کوئی نص ہوتی تو کوئی نہ کوئی اس مجلس میں یہ کہتا کہ تم لوگ اس قدر لڑ کیوں رہے ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو فلاں کو امامت اور خلافت کے لئے معین اور نامزد کردیا ہے نبی کریم علیہ السلام اگر سوائے ابوبکرؓ کے کسی اور کو مثلاً حضرت علیؓ یا حضرت عباسؓ کو مقرر کرجاتے تو یہ ناممکن تھا کہ صحابہ میں سے کوئی اس کو ظاہر نہ کرتا، سقیفۂ بنی ساعدہ کا اجتماع خلیفہ ہی کی تعیین کے لئے تو تھا؟ وہاں اسی لئے تو جمع ہوئے تھے؟ اگر خلافت کے بارے میں کوئی نص ہوتی تو انصار ''منا أمير ومنكم أمير'' نہ کہتے اور نہ سقیفۂ میں کسی زبان سے یہ نکلا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غدیر خم کے خطبہ میں ''**من كنت مولاه فعلي مولاه**'' سے حضرت علیؓ کی خلافت کی طرف اشارہ فرما چکے ہیں، اب اس بحث کی ضرورت نہیں۔

(۷) حضرت علی جب اپنے زمانۂ خلافت میں خطبہ دیتے تھے تو خلفاء ثلاثہ کے فضائل اور مناقب بیان کیا کرتے تھے مولانا محترم سے سوال یہ ہے ایسا حضرت علیؓ کیوں کرتے تھے کیا ان کو خوف دامنگیر تھا، وہ تو شہید کربلاء حضرت حسین کے والد محترم اور فاتح خیبر ہیں، آخر امیر المؤمنین علی کیسے شیر خدا تھے کہ خلفاء ثلاثہ کے انتقال کے بعد بھی ان سے ڈرتے تھے اور ڈر کر ان کی تعریف کرتے تھے افسوس کہ شیر خدا ہوکر ان سے ڈرے جو اس دنیا میں نہ تھے اور خلیفہ اور بادشاہ ہونے کے بعد بھی انہی کے منہج موافق احکام جاری کرے۔

خلافت کے باب میں عدم تعیین کی نبوی حکمت:

عن حذيفة قال قالوا يا رسول الله استخلف علينا قال أن استخلف عليكم فتعصوا خليفتي نزل عليكم۔

''حضرت حذیفہ راوی ہیں کہ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم پر کوئی امیر اور خلیفہ کیوں نہ مقرر کر جائیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میں کسی کو خلیفہ مقرر کر دوں اور پھر تم اس کی نافرمانی کرو تو تم پر اللہ کا عذاب نازل ہوگا''۔(مجمع الزوائد ۱۷۹/۵ وهو ضعيف)

حضرات شیخینؓ اور اہلِ بیت کے باہمی تعلقات

مولانا محترم کے سوال کا غالبا منشا یہ ثابت کرنا ہیکہ حضرات شیخینؓ واہلِ بیت اطہار کے مابین تعلقات کشیدہ رہے،اور حضرت علیؓ کے دل میں امر خلافت کی وجہ سے ناراضگی موجود تھی، اور ابوبکر وعمر نے اپنے عہدِ خلافت میں ان کے ساتھ حسنِ سلوک نہیں برتا،حالانکہ شواہد وواقعات ان تمام امور کی تردید کرتے ہیں،حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ایک بیان ملاحظہ ہو:

"والذی نفسی بیده لقرابة رسول الله ﷺ أحب إليأن أصل من قرابتي"۔ (بخاری: ۳۷۱۲)

(ترجمہ: بخدا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قرابتداروں کا خیال رکھنا اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا مجھے اپنے خویش واقارب کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے سے زیادہ محبوب ہے)۔

ان ہی کا ایک قول اور ہے:"ارقبوا محمداً في آل بيته"۔ (بخاری: ۳۷۱۳)

(محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آل بیت کا خیال رکھو)۔

حضرت علیؓ اور ان کے متبعین:

حقیقت یہ ہے حضرت علیؓ کے متبعین میں تین مختلف قسم کے رجحانات کے حامل لوگ رہے ہیں،اور حضرت علی مرتضیٰؓ نے ان تینوں سے اپنی عملی برائت کا اظہار فرمایا:

(۱) ایک وہ جس نے حضرت علیؓ کی محبت میں غلو سے کام لیا حتی ان کے بارے میں الوہیت کا دعوی کیا، اور خود حضرت علی نے ان کو آگ میں جلوایا ہے۔

(۲) دوسرا گروہ وہ تھا جس نے حضرت علیؓ کی محبت میں حضراتِ شیخین کے بارے میں زبان درازی اور طعن و تشنیع کو روا سمجھا، حضرت علیؓ نے ان کے قتل کا حکم صادر کیا یہاں تک کہ ان کو مدائن بھاگ کر پناہ لینی پڑی۔ یہ عبداللہ بن سبأ اور اس کے ہمنواؤں کا گروہ تھا۔

(۳) تیسرا گروہ وہ تھا جو حضرات شیخینؓ پر حضرت علیؓ کی تفضیل کا قائل تھا ان کے بارے میں خود حضرت علی کا قول ہے: "لا يبلغني عن أحد أنه فضلني على أبي بكر وعمر إلا جلدته جلد المفتري۔ (فضائل الصحابة لأحمد ابن حنبل: ۴۹)

(مجھے جس کسی کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ مجھے ابوبکر و عمر سے افضل قرار دیتا ہے میں اس پر مفتری کی حد جاری کروں گا)

اس چمن کا کیا یہی دستور ہے
پھول کے تم مستحق، کانٹوں کے ہم

☆☆☆

سر پٹکتا ہے لفظ مرا
اب نہ سمجھے کوئی تو کیا کیجئے

قسط نمبر۔ ۷

سوال: ''آپ (مفتی عتیق صاحب بستوی) نے معاویہ کے بارے میں جتنی حدیثیں (ازالہ میں) نقل کی ہیں، کیا آپ کو معلوم ہے وہ سب ضعیف اور منکر حدیثیں ہیں، تمام محقق محدثین کا فیصلہ ہے کہ معاویہ اور عمرو بن العاص کی فضیلت کے بارے میں کوئی حدیث ثابت نہیں، بخاری مسلم اور صحاح میں تلاش کیجئے کوئی حدیث نہیں ملے گی، سنن میں جو حدیث ذکر کی گئی ہے وہ بھی ہدایت کی دعا ہے اس کو بھی محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے، امام ذہبی نے محدث ابن عساکر کی شکایت کی ہے کہ انہوں نے معاویہ کے ذکر میں منکر اور موضوعات کی بھر مار کر دی ہے، جب حدیث آپ کا موضوع نہیں تو کیا شوق ہوا ''ازالہ'' کا!۔

ہمارے اور آپ کے امام نسائی کو اسی حقیقت کے اظہار میں شام کے ناصبی غنڈوں نے مار مار کر شہید کر دیا، امام اسحاق ابن راہویہ نے بصراحت یہ ارشاد فرمایا کہ معاویہ کے بارے میں کوئی حدیث ثابت نہیں (دیکھئے زوائد السنن ترتیب صالح احمد الشامی، کتاب المناقب)۔

جواب: تمام محقق محدثین کا فیصلہ ہے کہ معاویہ اور عمرو بن العاص کی فضیلت کے بارے میں کوئی حدیث ثابت نہیں، بخاری اور مسلم اور صحاح میں تلاش کیجئے کوئی حدیث نہیں ملے گی۔

قارئین کرام!

آپ حضرات کے علم میں ہے کہ مولانا محترم ایک عرصہ سے حدیث وعلومِ حدیث کی تدریس میں مصروف ہیں، اور خود مولانا محترم کو اس پر ناز (صحیح لفظوں میں غرور وتعلي) بھی ہے، اور اس کا اظہار ان کی تحریر میں جا بجا موجود ہے، مولانا کی علمِ حدیث سے شغف اور اس فن میں ان کی دقت نظری کا ہر ایک معترف ہے، ہمیں بھی بغیر کسی مداہنت کے اس بات کا اعتراف ہے کہ مولانا ایک عرصہ سے اس فن شریف سے اشتغال رکھتے ہیں، اس فن کا مطالعہ بھی وسیع ہے لیکن کیا کسی فن سے ایک مدت تک اشتغال اس امر کا جواز فراہم کرتا ہے کہ اس فن کے بارے میں اپنے

علاوہ کسی شخص کو گفتگو کا مجاز نہ سمجھا جائے، اور جو چاہے دعوی کیا جائے؟ اور جیسا چاہے دعوی کیا جائے؟ اور اس علم وفن کے اصول ومبادئ کو اپنی خواہشات کا تابع بنالیا جائے؟ جس حدیث کو چاہے قبول کیا جائے اور جسے چاہے کوڑے دان میں ڈال دیا جائے؟ حضور والا کیا نقدِ حدیث کا معیار صرف ذوق ورجحان ہی ہے کہ کوئی حدیث اگر فکر ونظر کے ذرا خلاف کیا ہوئی فوراً اس پر ضعیف ومنکر ہونے کا حکم لگادیا، یہ حدیث سے اشتغال کے نام پر کیا دھاندلی نہیں؟۔

بخاری اور مسلم اور صحاح میں تلاش کیجئے۔

مولانا محترم کا حکم ہے کہ بخاری اور مسلم اور صحاح میں تلاش کیجئے، حضرت معاویہؓ کی فضیلت پر کوئی حدیث موجود نہیں، ہم نے مولانا محترم کے دعویٔ ہمہ دانی کی صحت کی تحقیق اور ان کے حکم کی تعمیل کی، لہذا حضرت معاویہ کےؓ فضائل میں ان کتابوں میں مذکور چند احادیث پیش کی جاتی ہیں تا کہ قارئین کو معلوم ہوجائے کہ مولانا محترم کا دعوی کتنا بے بنیاد اور سراسر غرور ونخوت پر مبنی ہے۔(حضرت معاویہ کے فضائل میں چند احادیث پیش ہیں)

(۱) امام بخاری علیہ الرحمہ نے صحیح البخاری کے باب فضائل أصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں حضرت عبداللہ بن عباس کی ایک حدیث ذکر کی ہے:

"حدثنا الحسن بن بشر، حدثنا المعافی عن عثمان بن الأسودعن ابن أبي مليكة، قال:أوتر معاويةبعد العشا ء بر كعة، وعنده مولی لابن عباس، فأتی ابن عباس، فقال:دعه فإنه صحب النبی صلی الله عليه وسلم"۔

(صحیح البخاری:باب فضائل أصحاب النبیﷺ:باب ذ کر معاويةرضی الله عنه:۳۷۶۴)

(ابن ملیکہ فرماتے ہیں حضرت معاویہ عشاء کے بعد ایک رکعت وتر پڑھی، ان کے پاس ابن عباس کے ایک غلام بھی تھے، انہوں نے دیکھا تو ابن عباس سے آ کر بتایا کہ انہوں نے وتر صرف ایک رکعت پڑھی، تو عبداللہ بن عباس نے فرمایا رہنے دو، وہ اصحاب رسول میں سے ہیں)

اس حدیث سے ہمارے دو استدلال ہیں (۱) صحیح بخاری میں فضائل حضرت معاویہؓ

میں حدیث موجود ہے، اور آپ کا دعوی باطل ہے (۲) حضرت معاویہؓ بصراحت حضرت عبداللہ بن عباسؓ صحابیِ رسول اللہ ﷺ ہیں، وہ عبداللہ بن عباسؓ جن کا تعلق اہلِ بیت سے ہے وہ حضرت معاویہؓ کی صحابیت کے گواہ ہیں۔

(۲) ابن عباسؓ کی ایک دوسری روایت صحیح بخاری میں موجود ہے

"حدثنا ابن أبي مريم، حدثنا نافع بن عمر، حدثني ابن أبي مليكة، قيل لابن عباس: هل لك في أمير المؤمنين معاوية فإنه ما أوتر إلا بواحدة؟ قال إنه فقيه"۔ (صحیح البخاری: باب فضائل أصحاب النبی ﷺ: باب ذکر معاویۃ رضی اللہ عنہ: ۳۷۶۵)

(ترجمہ: ابن ملیکہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے سوال کیا گیا کہ آپ معاویہ کے بارے میں کیا فرماتے ہیں کیونکہ انہوں نے تو صرف ایک رکعت وتر پڑھی ہے، تو انہوں نے فرمایا کہ وہ (حضرت معاویہؓ) فقیہ ہیں)۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت معاویہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے نزدیک درجۂ فقاہت کے حامل ہیں۔

(۳) امام بخاری نے صحیح البخاری "باب الجهاد والسير" میں حضرت ام حرام کی ایک روایت ذکر کی ہے، وہ روایت حسب ذیل ہے:

"عن أم حرام أنها سمعت رسول الله ﷺ يقول: أول جيش من أمتي يغزون البحر قد أوجبوا" قال أم حرام: قلت: يارسول الله أنا فيهم، قال: أنت فيهم، ثم قال النبي ﷺ أول جيش من أمتي يغزون مدينة قيصر (القسطنطنة)، مغفور لهم "فقلت أنا فيهم يارسول الله؟ قال: لا"۔

(بخاری: ۲۹۲۴)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اس امت کا پہلا سمندری غزوہ کرنے والا گروہ جنتی ہے اور بخاری کی حدیث نمبر (۲۸۰۰) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزوہ حضرت معاویہؓ کے سربراہی میں ہوا۔

یہ روایات امام بخاری نے اپنی صحیح میں درج کی ہیں، جبکہ مولانا محترم کا دعوی ہے، ان کی فضیلت میں کوئی صحیح حدیث موجود نہیں۔

(۴) مسلم شریف کی روایت ملاحظہ ہو

"حدثنی ابن عباس، قال: كان المسلمون لا ينظرون إلى أبي سفيان، ولا يقاعدونه، فقال للنبي ﷺ: يانبي الله، ثلاث أعطنيهن، قال: نعم، قال: عندي أحسن العرب وأجمله أم حبيبة بنت أبي سفيان أزوجكها، قال: نعم، قال: ومعاوية تجعله كاتبا بين يديك، قال: "نعم" قال: وتؤمرني حتى أقاتل الكفار، كما كنت أقاتل المسلمين. قال "نعم" قال أبو زميل: ولولا أنه طلب ذلك من النبي ﷺ"۔ (مسلم: ۲۵۰۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت معاویہؓ کاتب وحی تھے، اور ان کے اس شرف سے انکار حدیث صحیح کا انکار ہے۔

مسلم ہی کی ایک روایت ہے جس میں حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مشورہ طلب کیا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشورہ دیتے ہوئے فرمایا تھا

"أما معاوية فصعلوك لا مال له"۔ (مسلم: ۱۴۸۰)

نوٹ: ابو معاذ محمود بن امام بن منصور نے اپنی کتاب "إسكات الكلاب العاوية بفضائل خال المؤمنين معاوية رضي الله عنه" میں ۱۸ مختلف وجوہ سے حضرت معاویہ کے فضائل ثابت کئے ہیں دیکھیں (صفحہ: ۳۶-۶۷)۔

اس حدیث سے جہاں اس امر کا علم ہوتا ہے حضرت معاویہ ایک سچے اور مخلص مؤمن ہیں، ٹھیک اسی طرح ان لوگوں کے خلاف دلیل بھی ہے جو ان پر نفاق کا الزام عائد کرتے ہیں، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے بارے میں یہ تو فرمایا کہ وہ غریب اور مفلوک الحال ہیں لیکن ان کے تدین اور دینداری پر کوئی تبصرہ نہیں فرمایا، اور ایمان واسلام سے بڑھ کر اور کیا فضیلت ہوسکتی ہے۔

اب سنن ترمذی کی ایک روایت دیکھئے جس کے بارے میں استاد محترم کا خیال ہے کہ یہ محض

حضرت معاویہ کے حق میں دعا ہے اس کا فضائل سے واسطہ نہیں، خیر ہم تو رسول اللہ کی دعا کو بھی جو کسی صحابی کے حق میں ہو فضیلت کی دلیل مانتے ہیں ہم ہی کیا امام ترمذی بھی اسے فضیلت کی دلیل مانتے ہیں، اسی لئے انہوں نے اس حدیث کو "أبواب المناقب عن معاوية رضي الله عنه" میں ذکر کیا ہے۔

"عن النبي ﷺ أنه قال اللهم اجعله هاديا مهديا واهد به"۔

(سنن ترمذی: ۳۸۴۲)

ان دلائل کے ذریعہ سے صرف یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ مولانا محترم کا یہ دعوی کہ فضائل معاویہ میں کوئی صحیح حدیث موجود نہیں، غلط ہے اور صرف بغض معاویہ نے ان کو اس کذب بیانی پر آمادہ کیا ہے۔

مولانا محترم نے اپنے رسالہ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا تذکرہ جس انداز میں فرمایا ہے، یہ قطعا علمائے سلف اور خصوصا ندوی برادری کا طرز تکلم وتحریر نہیں، یہ انداز نہایت سوقیانہ واہانت آمیز ہے مولانا محترم سے درخواست ہے کہ یہ انداز تحریر ترک فرمادیں کیونکہ آپ کے عقیدہ اور فکر ونظر کے اعتبار سے گرچہ وہ مقام صحابیت کے حامل نہ ہوں، لیکن ایک دنیا ان کے فضل وکمال کی معترف ہے اور ان کو ایک صحابی کی حیثیت سے قابل احترام وقابل قدر نگاہوں سے دیکھتی ہے، اور یہ سبھی جمہور اہلِ سنت ہیں جن کو آپ بھلے ہی ناصبی تسلیم کرتے ہوں البتہ ان کو مسلمان تو سمجھتے ہی ہوں گے اور آپ کا یہ عمل ایذائے مسلم شمار کیا جائے گا، امید ہے اس درخواست کو قبول کیا جائے گا۔

آئندہ قسط میں فضائل معاویہ پر تفصیلی کلام ہم پیش کریں گے۔

(قسط نمبر-۸)

حضرت معاویہؓ اوران کا مقام

حضرت معاویہؓ کے فضائل ومناقب کے سلسلہ میں تین بنیادی معیار کے اعتبار بحث کی جائے گی ،اور درحقیقت یہی تین بنیادی پیمانے ہیں جن کی بنیاد پر کسی کے فضل وکمال اور مقام ومرتبہ کی تعیین کی جاسکتی ہے۔

(۱) حضرت معاویہؓ کا قبول اسلام

حضرت معاویہؓ کے قبول اسلام کے بارے میں علماء کا کوئی اختلاف نہیں، ان کا قبول اسلام ایک مسلمہ حقیقت ہے،اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں،البتہ قبول اسلام کے وقت کی تعیین میں علماء کی آرا مختلف ہیں،بعض کے نزدیک قبول اسلام کا واقعہ صلحِ حدیبیہ کے زمانہ کا ہے،اور ایک قول مطابق فتحِ مکہ کے وقت مشرف باسلام ہوئے ،اس وقت ان کی عمر شریف ۱۸ برس تھی، یعنی نوجوان تھے۔(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ ابن عساکر میں حضرت معاویہ کا تذکرہ اور علما کی دیگر آراء واقوال)۔

کسی شخص کے فضائل ومناقب کے باب میں سب سے بنیادی معیار اور سب سے مضبوط پیمانہ اسلام ہے،اور یہی سب سے بہتر،افضل،سچا،قابل فخر،اور بے لاگ پیمانہ ہے،اور دین حق وشریعت مصطفوی میں اسی کو قابلِ اہمیت اور لائق ستائش قرار دیا گیا ہے،اس کے علاوہ خواہ کوئی پیمانہ ہو اس کا کوئی اعتبار نہیں،اس کے علاوہ تمام پیمانے اور معیار خواہ ابوت وبنوت ہو،اخوت ومصاہرت ہو،یا قرابت داری اور حسب ونسب کی برتری سب ہیچ ہے،یہی وہ پیمانہ ہے جس کے ذریعہ کسی شخص یا شخصیت کے فضل وکمال کا اندازہ لگایا جاتا ہے،اور اسی کے مطابق اس کا درجہ

متعین ہوتا ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے: "إن الدين عند الله الإسلام"۔ (یقینا دین حقیقی تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے) ایک اور جگہ فرمایا گیا: "ومن يبتغ غير دين الإسلام فلن يقبل منه" (جو اسلام کی علاوہ کسی اور دین کا طالب ہے تو اس کا دین قبول نہیں کیا جائیگا) اور ایک جگہ ہے: "قل بفضل الله وبرحمته، فبذلك فليفرحوا هو خير مما يجمعون" سورہ یونس: ۵۸۔ (اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے لہذا اس پر ان کو خوش ہونا چاہئے) اور ایک جگہ ارشاد ہے: "لا ينفع مال ولا بنون إلا من أتى الله بقلب سليم"۔

نقاد محدثین، ارباب سیر وتراجم میں سے کسی نے ان کے ایمان واسلام کے بارے میں کلام نہیں کیا، سب نے ان کے قبول اسلام کے واقعہ کا تذکرہ کیا ہے، ان کی صدق دلی اور استقامت ایمان کی گواہی دی، ہاں بعض شیعی فکر وعقیدہ کے حاملین کی جانب سے اگر ان کے ایمان واسلام کو اتہامات کا نشانہ بنایا جائے اور اگر یہ سوال اٹھایا جائے کہ حضرت معاویہ نے نفاق کے جذبہ سے اسلام قبول کیا تھا تو اسکا جواب اس انداز میں دیا جا سکتا ہے کہ حضرت معاویہؓ کے ایمان واسلام، اور اس میں استقامت کی شہادت زبان حق ترجمان سے ثابت ہے جس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں، اور ان پر اعتراض کرنا گویا پیغمبر صدق وصفا جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اعتراض کرنا ہے، مرفوع احادیث میں ان کے ایمان واسلام کی صراحت موجود ہے، اور ان احادیث مرفوعہ کی دو قسمیں ہیں، نصوص عامہ ونصوص خاصہ، پہلے ہم نصوص خاصہ ذکر کرتے ہیں، اس کے بعد نصوص عامہ، اور ہر دو اعتبار سے ان کے صدق ایمان کو ثابت کریں گے۔

حضرت معاویہؓ کا اسلام نصوصِ خاصہ کی روشنی میں:

امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں ایک روایت ذکر کی ہے، جس میں حضرت فاطمہ بنت قیسؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے نکاح کی بابت دریافت کیا تھا، اور مشورہ طلب کیا تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشورہ دیتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ:

"أما معاوية فرجل ترب لا مال له، وأما أبو جهم فرجل ضراب للنساء، ولكن أسامة بن زيد" فقالت بيدها هكذا: أسامة! أسامة! فقال لها رسول الله ﷺ: طاعة الله وطاعة رسوله خير لك، قالت فتزوجته، فاغتبطت"۔ (رواه

مسلم :۱۴۸۰)۔

(جہاں تک معاویہ کا معاملہ ہے تو وہ تنگ دست ہیں، اور عورتوں کو بہت کو زیادہ زدوکوب کرنے ہیں، لیکن اسامہ بن زید سے نکاح کرلو، تو انہوں نے ہاتھ کے اشارہ سے کہا اسامہ ! اسامہ! تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا خدا اور رسول کی اطاعت تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے، وہ فرماتی ہیں کہ تو میں نے ان سے نکاح کرلیا، اور مجھے اس پر خوشی ہے)۔

اس حدیث سے جہاں اس امر کا علم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ ایک سچے اور مخلص مؤمن ہیں، وہیں ان کے مخالفین کے خلاف دلیل و حجت بھی ہے جو ان پر نفاق کا الزام عائد کرتے ہیں، کیونکہ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ تو فرمایا کہ معاویہ غریب ومفلوک الحال ہیں، ان کے پاس دولت نہیں ہے، لیکن ان کے دین واسلام پر کسی قسم کا کوئی تبصرہ نہیں فرمایا، اگر دینی اعتبار سے ان کی ذات میں کسی قسم کا کوئی نقص یا قابل اتہام بات ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کا ضرور ذکر فرماتے، یہ حضرت معاویہؓ کے صدق اسلام اور مخلصانہ ایمان کی واضح دلیل ہے، اور خاص طور پر اس وجہ سے بھی کہ یہ ان کی جواں سالی اور قبول اسلام کے قریبی زمانہ کا واقعہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں آپ ایک غازی ومجاہد کی حیثیت سے شام تشریف لے گئے، اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کو شام کی جانب روانہ ہونے والے لشکر کا امیر مقرر فرمایا، وہاں پہنچ کر وہ اشاعت اسلام اور حکومتی انتظام وانصرام کی ذمہ داری نہایت خوبی وسلیقہ سے انجام دیتے رہے، عدل قائم کیا ہے، امن وامان کا ماحول پیدا کیا، اور کسی قسم کی ناانصافی اور شکایت کا موقع نہیں دیا۔

حضرت عمرؓ نے بھی اپنے عہدِ خلافت میں ان کو امارت کا عہدہ سپرد فرمایا، ان پر اعتماد کیا اور ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا، اور ان کی حزم وبصیرت اور حلم وبردباری اور قیادت وادارت کی خوبیوں سے اسلام ومسلمانوں کو خوب نفع ہوا۔

حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں بھی آپ اسی عہدہ پر مامور رہے، بلکہ خلیفۂ ثالث حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں تو آپ کو پورے شام کی گورنری کا عہدہ سپرد کیا گیا، اور ظاہر ہے کہ یہ سب ان کے ایمان واسلام کے ساتھ قائدانہ ومدبرانہ صلاحیتوں اور ان

کے عادلانہ و مدبرانہ خوبیوں ہی کی وجہ سے ممکن ہوا، یہ حضرت معاویہؓ کے عہد شباب کا زمانہ ہے۔

عہدِ کہولت کا حال بخاری کی روایت سے بخوبی معلوم ہوتا ہے، جس میں ہے کہ

"فقال الحسن سمعت أبا بكرة يقول: رأيت رسول الله ﷺ والحسن إلى جنبه، ويقول: إن ابني هذا سيد ولعل الله أن يصلح به بين فئتين عظيمتين من المسلمين"۔ (بخاری: ۲۷۰۴، اس کے علاوہ بھی امام بخاری نے یہ روایت متعدد جگہ اپنی صحیح میں ذکر کی ہے، دیکھئے: ۳۶۲۹-۳۷۴۶-۷۱۰۹)۔

اس حدیث سے جہاں حضرت حسنؓ کی فضیلت و برتری کا علم ہوتا ہے، وہیں حضرت معاویہؓ کے فضل و کمال کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حسنؓ کے مصالحت کے اقدام کی تعریف فرمائی ہے اور دعویٰ خلافت سے دستبرداری کے اعلان کو ان کی سیادت کا اہم ترین سبب قرار دیا ہے، تو اس سے معلوم ہوا کہ انہوں نے جس کے حق میں مصالحت فرمائی اور دعویٰ خلافت سے دستبردار ہوئے ہیں، وہ واقعی عہدہ خلافت کا مستحق ہے، ورنہ حضرت حسن کے اس اقدام کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تعریف نہ فرماتے، اور حدیث نبوی کی روشنی میں حضرت معاویہؓ جماعت مؤمنین کے ایک فرد ثابت ہوتے ہیں، اسی طرح یہ حدیث اس امر کی بھی دلیل ہے کہ حضرت حسنؓ و حضرت معاویہؓ کے ساتھ جو جماعت تھی ان میں سے ہر دو جماعت اسلام پر قائم اور راہ حق کی پیرو تھی۔

حضرت سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد کیا خوب ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "بين فئتين عظيمتين من المسلمين"۔

(ملاحظہ ہو فتح الباری: ۱۳/ ۶۶)

امام بیہقی وجہ پسندیدگی ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں جماعتوں کو حق پر قرار دیا ہے اور ان کو ایمان و اسلام کی سند عطا فرمائی ہے۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ حضرت حسنؓ جس زمانہ میں حضرت معاویہؓ سے صلح فرمائیں گے اس وقت بھی وہ حالت ایمان و اسلام میں ہوں گے، اور وہ زمانہ جب حضرت حسنؓ نے مصالحت فرمائی، اور امرِ خلافت ان کے سپرد فرمایا یہ ان کی کہولت کا زمانہ ہے، اور یہ خود زبان نبوت سے

ثابت ہے، اس میں کسی احتمال کی گنجائش نہیں، حضرت حسنؓ نے ایک خطبہ میں فرمایا تھا کہ:

"أیها الناس إن الله هدا کم بأولنا وحقن دمائکم بآخرنا، إن هذا الأمر الذی اختلفت فیه أنا ومعاویة هو حق لامرء کان أحق به منی، أو حق لی ترکته إرادة إصلاح المسلمین وحقن دمائهم، وإن أدری لعله فتنة لکم ومتاع إلی حین"۔ (الاعتقاد: ۵۳۵-۵۳۳)

علامہ خطابی معالم السنن میں حدیث مذکور کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس حدیث کے مصداق اہل شام واہلِ عراق کے مابین خوں ریزی اور فتنہ وفساد کے بعد صلح کا اقدام ہے، اس حدیث سے ان دونوں جماعتوں کا ایمان وحق پر قائم ہونا ثابت ہوتا ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر دو جماعت کے بارے میں بصراحت مسلمان ہونے کی شہادت دی ہے، اس فتنہ کے دور میں ان سے جو افعال سرزد ہوئے، یا جو بھی اقوال ایک دوسرے کے حق میں نکلے اس کی وجہ سے وہ دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہیں، اس فتنہ میں ہر ایک کی اپنے اجتہاد کی بنیاد پر ایک رائے تھی، اور اس جماعت کا اپنا ایک اجتہادی مذہب تھا، اور ان کے پاس اس رائے کی دلیل بھی تھی، اگر چہ وہ دلیل صحیح نہ ہو اور ان کا موقف درست نہ رہا ہو، کیونکہ ہر ایک کے گمان کے مطابق وہ حق پر اور اس کا مخالف غلطی اور خطا پر تھا''۔(معالم السنن: ۷/۷/۳)

علامہ بغویؒ نے شرح السنۃ: ۱۴/۶/۱۳۶ میں بھی اسی جیسا قول نقل کیا ہے۔

علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس صلح کی تعریف فرمائی ہے، اور حضرت حسنؓ کو ''سید'' کے عظیم خطاب سے نوازا ہے، اور ظاہر ہے کہ اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ عمل اللہ ورسول کے نزدیک پسندیدہ اور قابل قدر ہے، اگر جنگ وجدال محبوب ہوتا، اور اگر اس کا حکم ہوتا تو ایسی بشارت نہ دی جاتی۔۔۔۔اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت حسن کا اقدام صلح محمود اور عنداللہ پسندیدہ ہے۔ (فتاوی شیخ الاسلام: ۵/۳۵/۷۰)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اس فتنہ میں پڑنا یا حضرت معاویہؓ کو گالی دینا برا بھلا کہنا، اسی طرح حضرت حسنؓ کو مستحق ملامت قرار دینا کسی بھی طور مناسب نہیں، کیونکہ اگر حضرت معاویہؓ

کوطعن وتنقید کا نشانہ بنایا گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت حسنؓ کا اقدام بہتر نہیں تھا، اور حضرت حسنؓ کے اقدام کو غلط کہنا درحقیقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اعتراض کرنا ہے، اس لئے اس صلح پر تنقید وتبصرہ سے گریز کرنا چاہیئے، امام ابوداؤ نے اس روایت کو جس باب کے تحت ذکر کیا ہے وہ واقعی ان کے تفقہ فی الحدیث کی دلیل ہے، امام ابوداؤد اس حدیث کا باب "باب ترك الكلام في الفتنة" مقرر کیا ہے۔

عہدِ پیری:

حضرت معاویہؓ کے شیخوخت وعالم پیری میں بھی ان کا مسلمان ہونا ثابت ہے، اور یہ ثبوتِ اسلام صرف تاریخی روایات سے نہیں بلکہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے، بخاری ومسلم میں ہے کہ حضرت جابر بن سمرہ بیان کرتے ہیں: سمعت النبي ﷺ يقول: لا يزال أمر الناس ماضياً ما وليهم اثنا عشر رجلا" ثم تكلم بكلمة خفيت علي، فسألت أبي: ماذا قال رسول الله ﷺ؟ فقال: كلهم من قريش"۔ وهذا لفظ مسلم۔

(بخاری: ۷۲۲۲-۱۸۲۱)

حضرت جابر کی ایک دوسری روایت ان الفاظ میں ہے کہ "إن هذا الأمر لا ينقضي حتى يمضي فيهم اثنا عشر خليفة"۔

اس قسم کی روایات متعدد طرق سے کتب حدیث میں موجود ہیں، ان احادیث سے بجا طور پر یہ استدلال کرنا درست ہے کہ حضرت معاویہؓ ان بارہ خلفاء میں شامل ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا تعلق قریش سے ہے، اور وہ اپنے وقت کے حاکم وفرمانروا ہیں، اور خاص طور سے سماک عن جابر کے طرق سے جو روایت ہے اس کے مطابق اسلام بارہ خلفاء تک غالب رہے گا، اس روایت کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ اسلام کی یہ شان وشوکت، غلبہ وسطوت خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ سے بارہ خلیفہ تک رہے گی، اور معاویہؓ اان میں شامل ہیں، اور اس کی وجہ یہ بھی ہے حضرت معاویہؓ کو باتفاق تمام جماعت مسلمین کی خلافت وحکومت سپرد کی گئی، اور ان کی خلافت کے سال کو عام الجماعت کہا گیا۔

اس اعتبار سے یہ کہنا غلط نہیں کہ حضرت معاویہؓ کی خلافت شرعی تھی اور شرعی بنیادوں پر ان کو خلیفہ نامزد کیا گیا، اور اسلام کو ان کے زمانہ میں قوت وشوکت حاصل رہی، اور ظاہر ہے کہ ایسا دین وشریعت کے نفاذ اور اسلامی قوانین واحکام پر عمل ہی کے ذریعہ ممکن ہوسکا، ورنہ اسلام کے غلبہ کا کیا معنی ومفہوم ہوسکتا ہے۔

حضرت معاویہؓ کا اسلام نصوص عامہ کی روشنی میں:

(۱) بخاری کی روایت میں ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک دو جماعتیں باہم دست وگریباں نہیں ہوں گی، اور ان دونوں کا دعوی ایک ہی ہوگا۔

قال:قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:لا تقوم الساعة حتى يقتتل فئتان دعواهما واحدة"۔ (بخاری:۳۶۰۸)

(۲) مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

"تمرق مارقة عند فرقة من المسلمين يقتلها أولى الطائفتين بالحق"۔

(مسلم:۱۰۶۵)

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے معلوم ہوا کہ دو مسلمان جماعتوں میں اختلاف ہوگا اور اس سے حضرت علیؓ وحضرت معاویہؓ کے درمیان رونما ہونے والے اختلافات کو مراد لیا جاسکتا ہے، اور بلاشبہ حضرت علیؓ دوسروں کے مقابلہ میں حق پر تھے، اور انہوں نے خوارج سے قتال کیا، ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوا کہ حضرت معاویہ اسلام پر قائم تھے، اور اس کی شہادت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد گرامی ہے کہ "دعواهما واحدة" اور "أولى الطائفتين بالحق"۔

امام نووی شرح مسلم میں لکھتے ہیں کہ دونوں جماعت مؤمن ہیں، باہمی جنگ وجدال اور قتال سے اسلام سے خارج نہیں، اور نہ فاسق ہیں''۔ (شرح مسلم: ۱۶۸/۷)

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ان روایات میں دونوں جماعتوں اہلِ شام واہلِ عراق کے

اسلام پر ہونے کا حکم وصراحت موجود ہے۔

وفیه الحکم بإسلام الطائفتین: أهل الشام وأهل العراق، لا کما تزعمه فرقة الرافضةأهل الجهل والجور من تکفیرهم أهل الشام"۔

(البدایة والنهایة:۱۰/ ۵۱۳)

(۲) حضرت معاویہؓ اور صحبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ماقبل میں ہم صحیح بخاری کی ایک روایت پیش کر چکے ہیں، جس سے واضح انداز میں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہ صحابئ رسول ہیں، اور حضرت معاویہؓ کی صحبت ورفاقتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر انگلی اٹھانا سبائیت کی علامت ہے، حضرت معاویہؓ کے لیے قبول اسلام کے ساتھ ایک شرف ومنزلت یہ بھی کیا کم ہے کہ ان کے حصہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت آئی، اور حضرت عباسؓ نے خود ان کے عمل کو حجت مانا، نہ صرف یہ کہ حجت مانا بلکہ ان کی شکایت کرنے والے کو صرف اس وجہ سے طعن وتنقید سے روکا کہ وہ صحابئ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، امام بخاری کی ذکر کردہ روایت ملاحظہ ہو:

حدثنا الحسن بن بشر، حدثنا المعافی، عن عثمان بن الأسود عن ابن ملیکة قال: أوتر معاویة بعد العشاء وعنده مولی لابن عباس، فأتی ابن عباس، فقال: دعه فإنه قد صحب رسول الله ﷺ۔ (صحیح البخاری: ۳۷۴۶)۔

اس حدیث سے حضرت معاویہؓ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحبت ورفاقت ثابت ہوتی ہے، اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مقام ومرتبہ قرآن وسنت کی روشنی میں کیا ہے وہ اس آیت سے بخوبی معلوم ہوتا ہے قرآن کریم کا ارشاد ہے:

"لا یستوی منکم من أنفق من قبل الفتح وقاتل، أؤلئك أعظم درجة من الذین أنفقوا من بعد وقاتلوا، وکلا وعد الله الحسنی، والله بما تعملون خبیر"۔

اس آیت کے عموم میں تمام حضرات صحابہ کرام شامل ہیں، خواہ فتح مکہ سے پہلے انہوں نے اسلام قبول کیا ہو یا فتح مکہ کے بعد، ہر ایک کے ساتھ اللہ رب العزت کے خاص وعدے ہیں، اور وہ خاص وعدہ درحقیقت جنت کا ہے، حضرت معاویہؓ نے اسلام خواہ فتح مکہ سے پہلے

قبول کیا ہو یا بعد میں کیا ہو، بہر حال وہ ایک صحابی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، اور صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیثیت سے ان کی قدر کرنا قرآنی ونبوی تصریحات کا اقتضاء ہے، اور ان کی شان میں گستاخی کرنا توہینِ صحابہ کرامؓ کے زمرے میں آتا ہے، لہذا ایسے انسان سے جو صحابہ کی ہجو ومذمت کرتا ہو، ان کی نیتوں پر شبہات کا اظہار کرتا ہو، ان کے کردار وعمل کو مشکوک کرنے کی کوشش کرتا ہو اس سے توفیق الٰہی سلب جاتی ہے، ایمان وعقیدہ بھی سلامت نہیں رہتا، توہین صحابہ کا مرتکب شخص درحقیقت صحابہ کرام پر طعن وتشنیع اور تنقید وتعریض کے پسِ پردہ اسلام کی حقانیت کو مجروح کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس آیت کے عموم میں حضرت معاویہؓ بلاشبہ شامل ہیں، ان کی توہین صحابہ کی توہین ہے، امام نسائیؒ نے بہت عظیم بات کہی ہے جسے آبِ زر سے لکھا جانا چاہئے اور لوحِ قلب ودماغ میں محفوظ کر لینا چاہئے امام نسائی سے حضرت معاویہؓ کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:

"إنما الإسلام كدار لها باب، فباب الإسلام الصحابة، فمن آذى الصحابة إنما أراد الإسلام، كمن نقر الباب إنما يريد دخول الدار". (تہذیب الکمال للمزی: ۱/۳۳۹، مختصر تاریخ ابن عساکر لابن منظور: ۲/۲۰۵، بغیۃ الرغب: ۱۲۹)

(اسلام کی مثال اس گھر کی ہے جس میں ایک دروازہ ہو، صحابہ اسلامی گھر کے دروازہ ہیں، چنانچہ جس نے صحابہ کو ایذا پہنچائی تو اس نے اسلام کو نقصان پہنچانا چاہا ہے، ٹھیک ویسے ہی جیسے کوئی دروازہ پر دستک دے تو یقیناً اس کا طلب یہی ہے کہ وہ دروازہ کے اندر داخل ہونا چاہتا ہے)۔

(۳) حضرت معاویہ اور کاتبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونے کا شرف

امام احمد نے اپنی مسند میں ایک روایت ذکر کی ہے جس سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے کاتبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونے کے شرف کا علم ہوتا ہے، مسند احمد کی روایت ذیل میں ذکر جاتی ہے:

عن ابن عباس رضى الله عنه يقول: كنت غلاما أسعى مع الصبيان قال: فالتفت فإذا نبى الله خلفى مقبلا، فقلت: ما جاء نبى الله إلا إلى، قال فسعيت حتى أختبئ وراء باب دار، قال: فلم أشعر حتى تناولنى، قال: فأخذ بقفاى، فحطأنى

حطأة، وقال: إذهب فادع لی معاویةوکان کاتبه، فسعیت، فقلت: أجب رسول الله فإنه علی حاجة۔

(حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں چھوٹا تھا بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ میں مڑا تو دیکھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے پیچھے تشریف لا رہے ہیں، میں نے دل میں کہا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے ہی پاس آ رہے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ میں بھاگ کر ایک گھر کے دروازہ کے پیچھے چھپ گیا، میں سمجھ نہیں پایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے پالیا، فرماتے ہیں کہ آپ نے میری گدی پکڑی اور ایک چپت رسید کی اور کہا کہ جاؤ معاویہ کو بلا لاؤ، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کاتب تھے، میں دوڑ کر گیا، اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کو طلب کیا ہے، انہیں کوئی کام ہے)۔

یہ روایت مسند ابوداؤد طیالسی (۲۷۶۴) میں حمزہ قصاب کے حوالہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا کاتبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونا ایک مسلمہ حقیقت ہے جس کا انکار حقائق و مسلمات کا انکار ہے اور یہ شرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے لائق فخر ہے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نہ صرف یہ کہ کاتب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، بلکہ کاتبِ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی ہیں (المعرفة والتاریخ: ۳/ ۳۷۳)۔

حضراتِ صحابہ وتابعین کے نزدیک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا مقام

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا مقام و مرتبہ کیا تھا، اس کا تذکرہ ہم حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے ماقبل میں کر چکے ہیں، کہ انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ایک عمل کے تعلق سے سوال کرنے والے کو منع کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، اور درجۂ فقاہت پر فائز ہیں، گویا ان کا عمل تعلیم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی وجہ سے ہوگا، اور اس امر کی ان کے پاس کوئی دلیلِ شرعی ہوگی، یونہی اپنی مرضی سے ایسا نہیں کیا ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا قول حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں یہ ہے فرماتے ہیں:

"ما رأیت بعد رسول الله ﷺ أسود من معاویة، فقیل ولا أبوك؟ فقال: أبي -یرحمه الله- خیر من معاویة، وکان أسود منه"۔ (السنة للخلال: ۲/ ۴۴۲/ ۶۸۰)

(ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا قول ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت معاویہؓ سے زیادہ قابلِ سیادت کسی کو نہیں دیکھا، کسی نے سوال کیا، آپ کے والد بھی نہیں؟ تو فرمایا کہ میرے والد- ان پر اللہ کی رحمت ہو- معاویہ سے بہتر تھے، لیکن معاویہ زیادہ قابلِ سیادت تھے)۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

"ما رأيت رجلا كان أحق للملك من معاوية، كان الناس يردون منه على أرجاء واد رحب لم يكن بالضيق الحصر" (جامع معمر المطبوع مع مصنف عبد الرزاق: ۲۰۹۸۵)۔

(ابن عباس فرماتے ہیں کہ میں نے معاویہ سے زیادہ حکومت کا اہل کسی کو نہیں پایا، لوگ ان کے پاس سے اس حال میں واپس پلٹتے جیسے کسی زرخیز و شاداب وادی سے آئے ہوں، وہ تنگ دست و بخیل نہ تھے)

علامہ ذہبی نے حضرت سعد بن وقاص کا یہ قول کیا ہے

"ما رأيت أحدا بعد عثمان أقضى بحق من صاحب هذا الباب، يعني معاوية"۔
(تاريخ الإسلام للذهبي: ۲/ ۵۴۴)

(میں نے حضرت عثمانؓ کے بعد ان صاحب یعنی معاویہؓ سے بڑھ کر منصف و عادل نہیں دیکھا)۔

عبداللہ بن زبیر فرماتے ہیں:

"كان والله يعني معاوية كما قالت ابن رقيقة

"ألا أبكيه ألا أبكيه ألا كلا الغنى فيه"

(تاريخ دمشق لأبي زرعة الرازي: ۱/ ۵۲۷)۔

(بخدا معاویہ ابن رقیقہ کے ان اشعار کا حقیقی مصداق ہیں کہ میں معاویہ پر کیوں نہ روؤں، کیوں نہ آنسو بہاؤں وہ ہر اعتبار سے غنی تھے)۔

امام مجاہدؒ واثرمؒ وقتادہؒ وغیرہ سے منقول ہے فرماتے ہیں

"لو رأيتم معاوية لقلتم هذا المهدی" (السنة للخلال:۴۳۸)

(کاش تم لوگوں نے معاویہ کو دیکھا ہوتا تو کہتے مہدی (منتظر) تو یہی ہیں)۔

علامہ آجریؒ نے نقل فرمایا ہے کہ ایک شخص نے عبد اللہ بن مبارک سے سوال کیا کہ

"معاوية خير أو عمر بن عبد العزيز؟ قال: فقال تراب دخل أنف معاوية رضی الله عنه مع رسول الله ﷺ خير -أو أفضل- من عمر بن عبد العزيز"۔

(الشريعة للآجری: ۵/ ۲۴۶۶-۱۹۵۵)۔

(معاویہ زیادہ بہتر ہیں یا عمر بن عبد العزیز؟ تو انہوں نے فرمایا کہ معاویہ کی ناک کا غبار عمر بن عبد العزیز سے بہتر و افضل ہے)۔

اسی جیسا ایک سوال معافی بن عمران سے کسی نے کیا تو بہت مشتعل ہو گئے اور فرمایا کہ

"لا يقاس بأصحاب رسول الله ﷺ أحد، معاوية صاحبه وصهره وكاتبه وأمينه على وحی الله"۔ (تاريخ بغداد للخطيب البغدادی: ۱/ ۲۰۹)

(اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی کا موازنہ نہیں کیا جا سکتا حضرت معاویہؓ تو صحابئ رسول ہیں، آپ کے سسرالی قرابتدار ہیں، کاتب رسول ہیں، وحی کی نقل و کتابت میں امین ہیں)۔

امام احمد سے سوال کیا گیا کہ کوئی شخص اگر حضرت معاویہ و حضرت عمرو بن العاص کے توہین کرے تو اس کے بارے میں آپ کا خیال ہے، کیا اسے رافضی کہا جائے، تو امام احمدؒ نے فرمایا کہ:

"لا يجترء عليهما إلا وله خبيئة سوء" (السنة للخلال: ۴۴۷)

(ایسی جرأت ایک بدنیت شخص ہی کر سکتا ہے)۔

ہم ماقبل میں بیان کر چکے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حضرت معاویہؓ کو شام کے بعض علاقوں کا عامل بنایا تھا، پھر حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں وہ پورے شام کے عامل رہے یہ عہدہ اور مقام و منصب خود ان کے حق میں دلیلِ عظمت ہے، اور اس بات کی بھی دلیل ہے کہ خلفائے ثلاثہ ان پر اعتماد فرماتے تھے اور ان کے نزدیک آپ ایک معتبر اور قابل قدر صلاحیتوں کے حامل صحابی تھے، اور یہ حضرات ان کی ایمانی و اسلامی خوبیوں کی قدر فرماتے تھے، حضرات صحابہ میں سے کسی نے نہ ان کے ایمان و اسلام کے بارے میں سوال اٹھایا اور نہ ان کے کردار کو مجروح کیا، حتی کہ

خالص دین وشریعت کے باب میں ان کے تعلق سے حضرات صحابہ مطمئن رہے اور ان سے احادیث روایت کیں۔

اب صدیوں بعد ان کے ایمان واسلام اور ان کی تدین ودینداری پر کلام کرنا اور کو مورد طعن بنانا درحقیقت صحابہ کی روش سے اعراض ہے، اور ان کے فیصلوں پر عدمِ اطمینان کی دلیل ہے، ان کی ذاتِ پر کیچڑ اچھالنا درحقیقت صحابہ کرام پر کیچڑ اچھالنا ہے، اور ظاہر ہے صحابہ پر طنز وتعریض کرنے کی ایک صاحبِ ایمان کیسے جرأت کرسکتا ہے؟ مولانا محترم نے جس انداز میں حضرت معاویہؓ کا تذکرہ فرمایا ہے وہ انداز تخاطب قطعاً کسی بھی صحابی کے شان میں مناسب نہیں، مولانا محترم سے درخواست ہے کہ وہ اپنے اس عمل سے بارگاہ خداوندی میں توبہ کریں، اللہ غفور ورحیم ہے توبہ کرنے والے کو پسند کرتا ہے، یاد رکھئے کہ اللہ غفور ورحیم ہونے کے ساتھ غیور بھی ہے وہ اپنے اولیاء کی توہین برداشت نہیں کرتا، اور صحابہ کرام سے بڑھ کر خدا کا مقرب وولی بھلا اور کون ہوسکتا ہے؟ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

"من عادى لى ولياً فقد آذنته بالحرب وما تقرب إلى عبد بشئى أحب إلى مما افترضت عليه،وما يزال عبدى يتقرب إلى بالنوافل حتى أحبه،فإذا أحببت كنت سمعه الذى يسمع به وبصره الذى يبصر به،ويده التى يبطش بها ورجله التى يمشى بها،وإن سألنى لأعطينه،ولئن استعاذنى لأعيذنه"۔ (بخاری شریف)۔

(حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا بے شک اللہ تعالی فرماتا ہے کہ جس نے میرے ولی سے دشمنی کی اس کے خلاف میری طرف سے اعلان جنگ ہے، اور میرا بندہ جن عبادتوں سے میرا تقرب حاصل کرتا ہے ان میں فرائض سے زیادہ میرے نزدیک کچھ محبوب نہیں، میرا بندہ نوافل کے ذریعہ میرا تقرب حاصل کرتا ہے، یہانتک کہ مجھ سے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، اور جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہو، اور اس کی نگاہ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اس کا پیر بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، اگر وہ مجھ سے مطالبہ کرے تو میں عطا کرتا ہوں، اگر مجھ سے پناہ مانگے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں)۔

قسط نمبر-۹

سوال: معاویہ وعمرو بن العاص کے سلسلہ میں کوئی روایت ثابت نہیں

قارئین کرام نے گذشتہ دو قسطوں میں ملاحظہ کیا ہوگا کہ مولانا محترم کا یہ دعوی کتنا بے بنیاد ہے کہ کوئی حدیث ثابت نہیں، اولا تو دعوی کی بنیاد ہی درست نہیں، کسی صحابی کے بارے میں زبانِ نبوت سے کوئی فضیلت اگر ثابت نہ ہوتو کیا وہ صحابی احترام واکرام کے دائرہ سے خارج ہو جاتے ہیں؟ اوران کے حق میں ہر قسم کے ناروا تبصروں کی اجازت مل جاتی ہے؟ اور بحیثیت ایک صحابی ہونے کے کیا لائقِ احترام اور قابل قدر نہیں رہتے؟ مولانا محترم نے صحابیت کی تعریف کے سلسلہ میں جمہور اہلِ سنت اور محدثین واصحاب سیر کی رائے سے صرف اس لئے اختلاف کیا ہے تا کہ وہ حضرات صحابہ کرام جو فتنہ کے زمانہ میں حضرت معاویہ؄ کی جماعت میں شامل تھے، ان پر طعن وتنقید کی راہ مل جائے، اور کھل کر ان کے خلاف ہرزہ سرائی کی جا سکے، حب اہلِ بیت ہی کی آڑ میں سبائیت نے ہمیشہ اور ہر زمانہ میں ان حضرات صحابہ پر طعن وتشنیع اوران کے کردار کے مجروح کرنے کوششیں کی ہیں، ماضی کی تاریخ اس امر کی گواہ کی ہے، جمہور اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ انبیائے عظام کے بعد اگر کوئی ہستی لائقِ احترام اور قابل قدر اس روئے زمین میں موجود رہی ہے تو درحقیقت اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، یہ فی الواقع دین اسلام کے وہ بنیادی ستون ہیں جن کے بغیر اسلام کا معتدل وہمہ گیر تصور اور دین کی صحیح تفہیم وتشریح ممکن نہیں، اسی دین حقیقی کی حفاظت کی خاطر علمائے سلف اور خصوصا جمہورِ اہلِ سنت نے صحابہ کرام کی ذات کو نقد وتمحیص کی کسوٹی سے بالاتر رکھا ہے، اور جمہور اہلِ سنت ہی کیا خود صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عبد اللہ بن عباس؄ کا عمل بھی اس امر کی تائید کرتا ہے۔

ہم نے گذشتہ قسطوں میں حضرت معاویہ؄ کی فضیلت میں بخاری ومسلم اور ترمذی کی صحیح روایات پیش کی ہیں اور علمائے اہلِ سنت کے نزدیک ان کے مقام ومرتبہ کا ایک سرسری تعارف

پیش کیا ہے، صحابہ کرام اور خاص طور پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ ، حضرت سعد بن وقاصؓ حضرت معاویہؓ کو کس مقامِ بلند کا حامل سمجھتے تھے بالتفصیل بیان کیا ہے، جس سے بخوبی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت معاویہ ایک جلیل القدر صحابی، کاتب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، خال المسلمین اور اسلام کے ایک مضبوط سپاہی ہیں، ان کے بارے میں احادیث صحیحہ بھی موجود ہیں، ان کی ذات کو مطعون کرنا، ان پر ہرزہ سرائی کرنا سبائیت کی علامت ہے۔

مولانا محترم کا ایک ادعاء یہ بھی ہے کہ حضرت معاویہؓ کے سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو یہ کلمات بلند فرمائے کہ

"اللھم اجعلہ ھادیا مھدیا واھدبہ" یہ کلمات درحقیقت دعا ہیں ان کا فضائل سے واسطہ نہیں، جبکہ امام ترمذی نے اسے مناقبِ معاویہ کے تحت ذکر فرمایا ہے، مولانا محترم سے سوال یہ ہے کہ اہلِ تشیع کے علاوہ حدیث مذکور کا یہ مفہومِ بلیغ کسی اور نے سمجھا ہے یا اس میدان فہمِ حدیث میں آپ بے نظیر ہیں؟ اور اس مفہوم کی تحدید میں آپ یکتا و یگانہ ہیں؟۔

حضرت عمرو بن العاصؓ اور ان کا مقام:

حضرت عمرو بن العاص کے بارے میں مولانا محترم کا دعوی ہے کہ کوئی حدیث ان کے تعلق سے ثابت نہیں، ہم نے اس سے قبل ذکر کیا ہے کہ کسی کے حق میں شرفِ صحابیت کے ثبوت کے بعد لائقِ احترام ہونے کے لیے قطعا اس کی ضرورت نہیں کہ زبانِ نبوت سے اس کی کوئی فضیلت بھی ثابت ہو، وہ اس کے بغیر بھی لائق احترام اور قابلِ قدر ہیں، ان پر کسی قسم کی تنقید یا ناروا تبصرہ جائز نہیں، اور نہ ہی ان کی نیت و کردار پر کسی قسم کی حرف گیری کی گنجائش ہے۔

اور اگر کسی صحابی کے حق میں زبان نبوت سے منقول کوئی فضیلت ثابت ہو اس کے باوجود اس کی فضیلت کا صرف اس لئے انکار کر دیا جائے کہ مشاجراتِ صحابہؓ کے موقع پر حضرت معاویہؓ کی جماعت میں شامل تھے تو لامحالہ رافضی جذبات اور سبائی رجحانات کی اثر پذیری کا نتیجہ ہوگا، جو کسی صورت میں جائز و قابل وقبول نہیں، حضرت عمرو بن العاص کے فضائل زبانِ نبوت سے جو منقول ہیں ہم ذیل کی سطروں میں پیش کریں گے، لیکن اس سے قبل ان کا مختصر

تعارف اور اشاعتِ اسلام میں ان کی خدمات پیش کرتے ہیں۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جلیل القدر اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے ہیں، شجاعت و بہادری اور ذہانت وفطانت میں بے نظیر تھے، سپہ سالاری اور قیادت وانتظامی صلاحیتوں سے توفیق ایزدی نے انہیں وافر حصہ عطا فرمایا تھا، اسی لئے قبول اسلام سے ہی آپ کی شہرت ایک بیدار مغز قائد اور ذہین و باصلاحیت مدبر کی حیثیت سے تھی، حضرت خالد بن ولید کے ساتھ مدینہ طیبہ میں حاضر ہوکر ۸ھ میں اسلام قبول کیا۔ (الإصابة فی تمییز الصحابة: ۵/ ۲ وسیر أعلام النبلاء: ۱/ ۳۸۲-۲۸۴)

آپ کی جرأت وشہامت اور قیادت وفنون سپہ سالاری سے واقفیت اسلام کی اشاعت راہ میں بہت مفید ثابت ہوئی، آپ کی قائدانہ ومدبرانہ صلاحیتوں سے نہ صرف عرب بلکہ اسلامی سلطنت کا دائرہ مصر تک وسیع ہوگیا، وہ خود بطور فخر اپنی ان سعادتوں کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ:

ما عدل بی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وبخالد منذ أسلمنا أحداً من أصحابه فی حربه"۔

(فتح الباری ۷/ ۲۶)

"ہمارے اسلام لانے کے بعد سے جنگ میں میرے اور خالد کے برابر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی کو نہیں سمجھا"۔

بیشمار غزوات وسرایا میں شرکت کی اور شجاعت وبہادری کے جوہر دکھائے، اور کئی غزوات میں بحیثیت امیرِ لشکر قیادت کے فرائض انجام دئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سچے عاشق ومخلص وباوفا صحابی تھے، خود ذاتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنی وارفتگی اور عشق وفدائیت کی کیفیت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں صحیح مسلم شریف کی روایت ہے، فرماتے ہیں:

"ایمان لانے کے بعد میری حالت یہ ہوگئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ میری نگاہوں میں کوئی محبوب ومحترم نہ رہا، میرے دل میں ذاتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت وجلال کا عالم یہ تھا کہ آپ کو نظر بھر کر دیکھنے کی مجھ میں تاب نہ تھی، مجھ سے اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حلیۂ مبارک بیان

کرنے کو کہا جائے تو میں اس پر قادر نہیں کیونکہ میں نے کبھی آنکھ بھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دیکھا نہیں''۔ (مسلم:۱۲۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ان کی اس عشق ووارفتگی کے جذبات کی قدر فرماتے، ان کے والہانہ اور عقیدتمندانہ اطوار کو سراہتے ان کے حق میں دعا فرماتے، ایک مرتبہ تو یوں فرمایا کہ

"اللهم صل على عمرو بن العاص إنه يحبك ويحب رسولك"۔

(أخرج أبو نعيم فى الإمامة والرد على الرافضة: ۲۲۶، وهو منقطع)

(اے اللہ! عمرو بن العاص پر رحمتیں نازل فرما کیونکہ وہ تجھ سے اور تیرے رسول سے محبت کرتا ہے)

جامع ترمذی کی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت عمرو بن العاص کے بارے میں فرمایا

"إن عمرو بن العاص من صالحي قريش"۔ (ترمذی: ۳۸۰۹)

(یقیناً عمرو بن العاص قریش کی صالح لوگوں میں سے ایک ہے)۔

حضرت عمرو بن العاص کی فضیلت میں صحیح حدیث:

مولانا محترم نے غالباً محض حضرت معاویہؓ اور حضرت عمروؓ بن العاص کی شان عالی میں نقص پیدا کرنے اور ان کی تعظیم وتوقیر کے وہ جذبات جوامتِ مسلمہ میں پائے جاتے ہیں ان کو ختم کرنے کی خاطر یہ کہا کہ ان کے فضائل میں کوئی روایت ثابت نہیں جبکہ کم از کم تین روایات تو ہم ذیل ہی پیش کررہے ہیں، امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں ایک روایت ذکر کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی ان کو بیشمار بشارتیں عطا ہوئی تھیں

(۱) مسلم شریف کی روایت ملاحظہ ہو:

"عن ابن شماسة المهرى، قال: حضرنا عمرو بن العاص وهو فى سياقه الموت، فبكى طويلا، وحول وجهه إلى الجدار، فجعل ابنه يقول: يا أبتاه، أما بشرك رسول الله ﷺ بكذا؟ أما بشرك رسول الله ﷺ بكذا؟ قال: فأقبل بوجهه، فقال:

إن أفضل ما نعد شهادة أن لاإله إلا لله وأن محمداً رسول الله........"۔ (صحیح مسلم:۱۲۱)

غور فرمایئے مذکور روایت مسلم شریف کی ہے، فاتحِ مصر حضرت عمرو بن العاصؓ کا اس دنیائے فانی سے دمِ واپسیں ہے، ان کے جلیل القدر فرزند حضرت عبد اللہ بن عمروؓ جن کا شمار مکثرین صحابہ میں ہوتا ہے، اور جنہوں نے اپنی حیات مستعار کا بیشتر حصہ خدمتِ حدیث کی نذر کر دیا تھا، اپنے والد محترم کو تسلی دے رہے ہیں کہ ابا جان آپ کے تعلق سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بشارت نہیں فرمائی تھی، ابا جان آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بشارت نہیں فرمائی تھی''۔

(ابن شماسہ ہروی کہتے ہیں ہم حضرت عمرو بن العاص کے آخری لمحات میں ان کے پاس پہنچے تو ان پر گریہ طاری تھا اور انہوں نے اپنا چہرہ دیوار کی جانب کر رکھا تھا اور ان کے فرزند کہہ رہے تھے ابا جان! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کو یہ یہ بشارتیں نہیں سنائیں تھیں؟ تو وہ متوجہ ہوئے اور فرمانے لگے کہ کلمہ شہادت کو ہم سب سے افضل سمجھتے ہیں)۔

اس کا یہی مطلب ہے زبانِ نبوت نے فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص کو بہت سی بشارتوں سے نوازا تھا، اور اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

(۲) ایک روایت مزید ملاحظہ ہو

"حدثنا موسى على بن رباح يقول: سمعت أبي سمعت عمرو بن العاص، يقول: بعث إلىَّ رسول الله ﷺ فأتيته فأمرنى أن آخذ على ثيابي وسلاحى، ثم آتيه، قال: ففعلت، ثم أتيته وهو يتوضأ فصعد فىَّ النظر، ثم طأطأ، ثم قال: يا عمرو، إنى أريد أن أبعثك على جيش، فيغنمك الله ويسلمّك، وارغب لك رغبة صالحة من المال، ولكن أسلمت رغبة فى الإسلام، وأن أكون مع رسول الله ﷺ، فقال لى: يا عمرو نعم المال الصالح للرجل الصالح"۔

اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ مالِ طیب صالح شخص (عمرو بن العاص) کیلئے کتنا عمدہ ہے)۔

یہ روایت مسند أحمد صحیح ابن حبان مسند ابوداؤد طیالسی مسند ابی یعلی، اتحاف الخیرۃ مصنف ابن

ابی شیبۃ، طبرانی کی المعجم الأوسط وغیرہ میں موجود ہے، حاکم نے مستدرک علی الصحیحین میں صحیح علی شرط مسلم قرار دیا ہے، ذہبی نے بھی تلخیص میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔

مسند احمد کی ایک روایت ملاحظہ ہو

"عن عقبة بن عامر قال: قال رسول الله ﷺ أسلم الناس وآمن عمرو بن العاص"۔ (مسند أحمد: ۱۷۴۱۳ سنن الترمذی: ۳۸۴۴)۔

(عقبہ بن عامر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ نہایت بہتر ایمان واسلام عمرو بن العاص کا ہے)۔

علامہ البانی نے اسے حسن قرار دیا ہے، (دیکھئے السلسلۃ الصحیحۃ: ۱۵۵، اور تخریج مشکاۃ المصابیح ۶۲۳۶، مجموع الفتاوی: ۳۵/ ۶۴)۔

یہ احادیث اس بات کی دلیل ہیں کہ حضرت معاویہؓ وحضرت عمرو بن العاص کے سلسلہ میں احادیث صحیحہ موجود ہیں، اسلام اور خدمتِ اسلام کے تعلق سے ان کی عظیم ترین خدمات کو دنیاے اسلام فراموش نہیں کرسکتی۔

لیکن اس سب کے باوجود بھی قافلۂ اسلام کے یہ عظیم ترین محسنین حضرت معاویہؓ وعمرو بن عاصؓ وخالدؓ جو قائدانہ صلاحیتوں کے حامل سپہ سالار ہیں، حضرت عمرو وخالدؓ جنھوں نے شجاعت وبہادری کی ایک روشن تاریخ رقم کی، سبائیوں اور روافض کی ہرزہ سرائیوں سے محفوظ نہ رہ سکے، انہوں نے حب اہلِ بیت کے پس پردہ اصحابِ رسول کو بے بنیاد الزامات اور سازشوں کا نشانہ بنایا۔

مولانا محترم نے غالباً سبائی پروپیگنڈہ سے متأثر ہوکر یہ دعوی کیا ہے کہ معاویہ اور عمرو بن عاص کے فضائل میں کوئی روایت ثابت نہیں، جبکہ آپ نے ملاحظہ کیا کہ حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن عاص دونوں کے فضائل میں صحیح روایات موجود ہیں، اور اگر یہ روایات نہ ہوتیں تب بھی ان کے مقام صحابیت میں کوئی نقص یا کمی کی بات نہ تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کتنے ایسے جاں نثار رفقاء ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دین اسلام کی بقاء واشاعت کی خاطر سر بکف رزم گاہِ حق وباطل میں ڈٹے رہے اور راہِ عزیمت میں فدائیت وجاں سپاری کی عظیم مثالیں قائم کیں،

جان و مال کی قربانی پیش کی، لیکن احادیث صحیحہ کے ذخیرہ میں زبانِ نبوت کی کوئی شہادت ان کے حق میں موجود نہیں تو کیا ان نفوس قدسیہ کو دائرہ صحابہ سے خارج کر دیا جائے گا اور ان کو دیگر صحابہ کی طرح قدر و احترام کا مستحق نہیں سمجھا جائیگا، ہرگز نہیں یقیناً وہ لائقِ ستائش اور قابل قدر ہیں، دنیا کا بڑے سے بڑا اولی اور قطب الأ قطاب بھی ان کے مقامِ بلند تک رسائی سے قاصر ہے۔

حضرت عمرو رضی اللہ عنہ بن عاص اور رافضی الزمات:

حضرت عمرو بن عاص سے ناراضگی اور ان پر شیعوں کی تبرا کی بڑی وجہ درحقیقت مسئلہ تحکیم ہے حضرت عمرو بن عاص نے اپنی ذکاوت کو بروے کار لاتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ ومعاویہ رضی اللہ عنہ کے مابین ثالثی میں اہلِ تشیع کے نظریہ کے مطابق عیاری سے کام لیا، اور قرآن کریم کو نیزوں میں بلند کیا۔

روافض کا یہ الزام بالکل بے بنیاد ہے، اس اعتراض کا بنیادی مأ خذ ابومخنف کی وہ روایت ہے کہ حضرت عمرو بن عاص کے مشورہ کے مطابق ایک جنگی تدبیر کے طور پر جنگ صفین میں حضرت معاویہ کے لشکر نے قرآن کریم کو نیزوں پر بلند کروایا، تاکہ حضرت علی کے لشکر میں پھوٹ پڑ جائے، ابومخنف کی اس روایت کی بنیاد پر اہلِ تشیع نے وہ طوفان بدتمیزی برپا کیا کہ خدا کی پناہ، جبکہ علامہ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں اسی واقعہ کے متعلق امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی بھی ایک باسند روایت نقل کی ہے، اور اس کے علاوہ صحیح سندوں سے اس بابت ان گنت روایات مروی ہیں، ان فتنہ پردازوں کو اس سبائی کی روایت تو یاد رہی مگر وہیں موجود یہ روایت نظر نہ آئی جسے ایک صحابی رسول روایت کر رہے ہیں:

''حضرت ابو وائل فرماتے ہیں کہ ہم صفین میں تھے جب اہلِ شام کے ساتھ گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی، شامی ایک ٹیلے پر چڑھ گئے، پھر حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ گے پاس قرآن بھیج کر ان کو کتاب اللہ کا حکم قبول کرنے کی دعوت دیں، وہ ہرگز انکار نہ کریں گے، تب قرآن مجید لے کر ایک آدمی معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے آیا، اس نے کہا ہمارے اور آپ کے درمیان یہ اللہ کہ کتاب فیصلہ کرنے والی ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم اس کے زیادہ

حقدار ہیں کہ اس کتاب کے فیصلہ پر عمل کریں اور کتاب اللہ کو اپنا فیصل تسلیم کریں، حضرت علی کی جانب سے جنگ صفین میں شریک ہونے والے صحابی حضرت ابووائلؒ کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرو بن عاص کو اس بات کا احساس تھا کہ سبائیوں اور قاتلان عثمان نے اپنی جان بچانے کے یہ جنگ ایک چال کے طور پر مسلمانوں کے درمیان شروع کروادی ہے، جس سے دونوں طرف مسلمان شہید ہورہے ہیں۔انھوں نے مسلمانوں کو اس بڑے جانی نقصان سے بچانے کے لیے یہ مخلصانہ کوشش کی اور ایک آدمی کو قرآن دے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج کر یہ پیش کش کی، ہم اس فتنے میں قرآن مجید کو اپنا حکم بنالیں اور اسی کے مطابق فیصلہ کرلیں، جسے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر منظور کرلیا کہ میں تو قرآن کے فیصلہ کی طرف بلانے اور اس پر عمل کرنے کا زیادہ حق دار ہوں، چنانچہ بعد میں اسی مشورے کے مطابق واقعہ تحکیم ہوا اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے ذریعہ ایک بڑے جانی نقصان اور فتنے سے بچالیا۔مسند احمد میں ہے:(۳/ ۴۸۵)(۱۵۹۷۵)

عن حبيب بن أبي ثابت قال: أتيت أبا وائل أحد على بن أبي طالب فقال: كنا بصفين، فلما استحر القتل بأهل الشام قال عمرو لمعاوية: أرسل إلى علىّ المصحف، فادعه إلى كتاب الله، فإنه لا يأبى عليك، فجاء به رجل فقال: بيننا وبينكم كتاب الله { ألم تر إلى الذين أوتوا نصيبا من الكتاب يدعون إلى كتاب الله ليحكم بينهم ثم يتولى فريق منهم وهو معرضون} [آل عمران:۲۳]، فقال على: نعم، أنا أولى بذلك، فقام القراء ـ الذين صاروا بعد ذلك خوارج ـ بأسيافهم على عواتقهم فقالوا: يا أمير المؤمنين ألا نمشى إلى هؤلاء حتى يحكم الله بيننا وبينهم؟ فقام سهل بن حنيف الأنصارى رضى الله عنه فقال: أيها الناس اتهموا أنفسكم، لقد كنا مع رسول الله ـ صلى الله عليه وسلم ـ يوم الحديبية، ولو نرى قتالاً لقاتلنا، وذلك فى الصلح الذى بين رسول الله ـ صلى الله عليه وسلم ـ وبين المشركين، ثم حدثهم عن معارضة عمر رضى الله عنه للصلح يوم الحديبية ونزول سورة الفتح على رسول الله ـ صلى الله عليه وسلم ـ

فقال علی: أیها الناس إن هذا الفتح، فقبل القضية ورجع، ورجع الناس"۔

(مسند احمد: ۳/ ۴۸۵، ۱۵۹۷۵)

(حبیب بن ثابت فرماتے ہیں کہ میں ابووائل - جو حضرت علی کی جماعت کے ایک فرد تھے - کے پاس آیا انہوں نے بتایا کہ ہم صفین میں تھے جب اہلِ شام کے ساتھ جنگ گرم تھی تو عمرو بن عاص نے معاویہ سے کہا کہ علی کے پاس مصحف بھیجئے اور ان کو کتاب الٰہی کی جانب بلائیے، کیونکہ تب وہ انکار نہیں کریں گے، چنانچہ ایک شخص لے کر گیا اور اس نے کہا ہمارے اور آپ کے درمیان کتابِ الٰہی فیصل ہے، اور قرآن کی یہ آیت پڑھی کہ " **ألم تر إلى الذين أوتوا نصيبا من الكتاب يدعون إلى كتاب الله ليحكم بينهم ثم يتولى فريق منهم وهم معرضون**،، کیا آپ نے ان لوگوں کو جن کو کتاب کے علم میں سے ایک اچھا خاصہ حصہ دیا گیا ان کو کتاب کی جانب بلایا جاتا ہے تاکہ کتاب ان کے درمیان فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک جماعت منھ موڑ لیتی ہے اور وہی اعراض کرنے والے ہوتے ہیں،، تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ہاں! میں اس کا زیادہ مستحق ہوں چنانچہ وہ قراء - جو بعد میں خوارج بن گئے - اپنے شانوں میں تلوار اٹھا کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ امیر المؤمنین! ہم ان کی جانب کوچ نہ کریں کہ اللہ تعالی ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ فرما دے، تو سہل بن حنیف کھڑے ہوئے اور کہا لوگو! تم خود کو متہم کرو، یقیناً ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ حدیبیہ میں تھے، اگر ہم قتال مناسب سمجھتے تو قتال کرتے، یہ تو صلح ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مشرکین کے مابین ہوئی تھی، اور انہوں نے حدیبیہ کے دن حضرت عمرؓ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معارضہ اور پھر سورہ فتح کے نزول کا پس منظر بھی ذکر فرمایا، تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ لوگو! یہ بلا شبہ فتح ہے، چنانچہ انہوں نے اسے قبول کر لیا، اور واپس ہوئے اور لوگ بھی واپس ہو گئے)۔

قصہ تحکیم میں قرآن مجید کو نیزوں پر اٹھانے والی بات ابو مخنف راوی کے حوالے سے آئی ہے جب کہ یہ راوی شیعہ، مدلس، ضعیف، متروک، قصہ گو اور ناقابل اعتبار ہے۔

قسط نمبر-۱۰

جمہور اہلِ سنت کے متبعین کو مولانا محترم کی ایک نصیحت

''بھائی مفتی صاحب! جمہور کے چکر میں کمزور دھاگوں کو پکڑ کر چڑھنے کی کوشش نہ کریں، ورنہ سوائے گرنے اور چوٹ کھانے کے کچھ نہ ملے گا، آپ نے صحابہ کرام کے مقامات کو ثابت کرنے کے لیے جو زور لگایا ہے اس کی کوئی ضرورت نہیں، خود قرآن بتا رہا ہے کہ کون اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہیں اور کون ناپسندیدہ ہیں؟ جن حدیثوں کا تذکرہ آپ نے کیا ہے مثلا **''اللّٰہ اللّٰہ فی أصحابي''** جس کو خطبۂ جمعہ میں منبر کے خطیب پڑھتے ہیں، ضعیف حدیث ہے، اس کا کوئی ثبوت نہیں، اور یہ حدیث ''أصحابی کالنجوم'' محدثین کے نزدیک قابلِ اعتبار نہیں، لہذا کمزور کھپچیوں پر مفتی صاحب! چلنے کی کوشش نا کریں''۔

مولانا محترم! سید الطائفہ کی ایک نصیحت ہر طالب علم اور بالخصوص ہم سب کو ہے کہ

سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی

مولانا سید سلمان حسینی ندوی صاحب کو اہم ترین نصیحت

''جمہور اسلام جس مسئلہ پر اعتقادی وعملی طور پر متفق ہوں اس کو چھوڑ کر نئی راہ نہ اختیار کی جائے، یہ طریقِ تواتر وتوارث کی بیخ کنی کے مرادف ہے، اس گناہ کا مرتکب کبھی میں بھی ہو چکا ہوں، اور اس کی اعتقادی اور عملی سزا بھگت چکا ہوں، اس لئے دل سے چاہتا ہوں کہ اب میرے عزیزوں اور دوستوں میں سے کوئی اس راہ سے نہ نکلے تا کہ وہ سزا اسے محفوظ رہے جو ان سے پہلوں کو مل چکی ہے''۔ (ماہنامہ بینات جمادی الاٰخری ۱۳۸۸ھ جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی)

مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی ایک جگہ فرماتے ہیں

''کہ تجربہ کی بات کہتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں نے بھی کتابیں پڑھی ہیں، اسلام کے مذاہب

اربعہ، اوران سے باہر نکل کر تقابلی مطالعہ کیا ہے شاید کم ہی لوگوں نے اس طرح کا مطالعہ کیا ہو، ان تمام کے مطالعہ کے نچوڑ میں ایک گر کی بات بتاتا ہوں کہ جمہور اہلِسنت کے مسلک سے کبھی نہ ہٹئیے گا، اس کو لکھ لیجئے، چاہے آپ کا دماغ کچھ بھی بتائے، آپ کی ذہنیت آپ کو کہیں بھی لے جائے، کیسی ہی قوی دلیل پائیں جمہور کے مسلک سے نہ ہٹئیے، اللہ تعالی کی جو تائیداس کے ساتھ رہی ہے جس کے شواہد وقرائن ساری تاریخ میں موجود ہیں''۔

(خطبات علی میاں جلداول:۳۴۸)

قارئین کرام!

ہم جیسے کم علم طالب علم تو جمہور ہی نقش قدم کے پیرو ہیں، ان ہی قائم کردہ علمی خطوط پر اپنا کاروانِ علم وتحقیق آگے بڑھانا چاہتے ہیں، ہمارے نزدیک تو سید الطائفہ سید سلیمان ہوں یا عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شبلی، ابوالحسن علی ندوی ہوں یا صوفیٔ باصفا مونگیری، سب ہی لائقِ تقلید اور قابلِ احترام ہیں، یہ سب جمہور کی مضبوط اکائی کا ایک اٹوٹ حصہ ہیں، اور سب نے بالاتفاق حضرت معاویہؓ کو ایک صحابی رسول کی حیثیت سے لائقِ احترام گردانا ہے، سب حضرت علیؓ پر شیخین کی افضلیت کے قائل ہیں، اورانکی اقتدااوراحترام کو ایمان واسلام کی علامت قرار دیتے ہیں، اسی پر بس نہیں بلکہ متقدمین سلف کی تحقیقات میں موجود تفرد اور شذوذ سے احتراز کی تلقین کرتے ہیں، صحابہ ہی کیا تمام علمائے مفسرین ومحدثین، فقہاء واصحابِ سیر کی شان میں بے احترامی سے انہوں نے اجتناب کا ادب سکھایا ہے، اورہمیں بتایا جاتا ہے علم وتحقیق کی پہلی منزل ادب ہے، اوریہی شانِ ندویت ہے، سید صاحب نے اسی امر کی تلقین کی، اوراپنے تلخ تجربات ہمارے سامنے رکھ دئے، آپ کے نانا محترم اور ہم سب کے میر کارواں مفکر اسلام علی میاں نے اپنا سرِ زندگی بیان کردیا، اور بڑے درد کے ساتھ اس امر کی تلقین کی کہ طریقِ جمہور کامیابی کا ضامن اورلغزشوں سے محفوظ رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے، لیکن اس کے برخلاف آپ ہمیں اس راستہ کی رہنمائی کررہے ہیں، جہاں سوائے لغزشوں، ٹھوکروں اوررسوائیوں کے اور کچھ نہیں، آپ ہمیں نصیحت کرتے ہیں کہ جمہور کے راستہ میں ٹھوکریں ہیں، خدارا اپنی زندگی کا جائزہ لیجئے، گردش ایام کو ذرا پیچھے لے جائیے اورغور کیجئے کہ وہ سلمان حسینی جو کل تک لسانِ ندویت تھا، جو شبلی

وسلیمان اور بوالحسن کے افکار کا شارح وترجمان تھا، آج اپنے گھر میں وہ غیر سا کیوں ہے؟ اس کی تشریحات سے ندوی برادری براءت کے اظہار پر کیوں مجبور ہے؟ آپ خود غور فرمائیں، طریقِ جمہور سے اعراض کر کے آپ نے کون سے علمی قلعے فتح کر لئے ہیں، تحقیقات کی آخر کون سی بلندیاں سر کر لی ہیں، یقیناً اگر آپ نے طریق جمہور کی پیروی کی ہوتی، اپنی خود پسندی اور کبر وغرور کی بلی چڑھائی ہوتی تو فتوحات بڑھ کر آپ کے قدم چومتیں، موازنہ کیجئے اپنا اور متبعین جمہور کا، عزت کسے ملی اور رسوائیاں کس کا نصیب بنیں؟ گرا کون اور ٹھوکریں کس نے کھائیں؟ ہم جیسے طالب علم حیران و پریشان ہیں کہ تختِ سلیمانؒ کی ہمرکابی حاصل کی جائے یا سلمان حسینی کی پرخطر راہ اپنائی جائے؟ اساطینِ ندویت اور آپ کے بیانات باہم متصادم ہیں، سابقہ قسطوں میں ہم نے دیکھا کہ دلائل و براہین کے اعتبار سے محکم ومضبوط تو طریقِ جمہور ہے، اور طریقِ حسینی میں سوائے بلند بانگ دعووں، مغالطوں اور اکابر وسلفِ صالحین حتی کہ صحابہؓ وشیخینؓ کی اہانت کے سوا کچھ نہیں؟ آخر اس راہ کے رہرو بنیں جہاں احترام وعظمت کے جذبات ہوں یا اس راہ کے راہی جہاں صرف کبر وغرور اور نخوت وانانیت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر؟ خدارا ہمیں دلائل علمیہ سے بتائیے کہ آپ کا طریق کیسے صحیح ہے؟ اس لئے کہ یہاں کافی سراسیمگی ہے ہمارا حال تو یہ ہے:

ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں؟

مولانا محترم کا فرمان ہے کہ ”آپ نے صحابہ کرام کے مقامات کو ثابت کرنے کے لیے جو زور لگایا ہے اس کی کوئی ضرورت نہیں، خود قرآن بتا رہا ہے کہ کون اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہیں اور کون ناپسندیدہ ہیں؟

مولانا محترم خدا کی واسطے ہمیں بتائیے کہ کیا واقعی قرآن کریم میں کوئی بیان ایسا موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہو بعض ایسے بھی صحابہ ہیں جن کی مذمت قرآن کریم میں مذکور ہے؟ اور ان کو برا بھلا کہنے کی اجازت ہے؟ اور کیا فضائل صحابہ جو احادیث میں مذکور ہیں ان کو بیان کرنے اور ان بیانات کو ثابت کر دینے کے باوجود آپ اسے تسلیم نہیں کرتے؟ اور کیا وہ حدیث صحیح جو ثابت ہے جہاں سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مضبوطی سے تھامنے کی تلقین ہے کیا آپ اس پر عمل کی ضرورت محسوس نہیں فرماتے؟ اور مقامِ صحابہ کی تعیین اور درجہ بندی کیا صرف قرآن کے ذریعہ ہی ہوگی

حدیث اس باب میں حجت نہیں ہوں گی؟ اگر یہ سب دلائل کی بنیاد پر آپ کہہ رہے ہیں تو یہ دلائل کہاں ہیں؟۔

مولانا محترم کا ارشاد ہے کہ "الله الله فی أصحابی" اور "أصحابی کالنجوم" دونوں حدیث ضعیف ہیں۔

مولانا محترم!

مان لیا کہ یہ احادیث ضعیف ہیں تو کیا طعن اور سبِ صحابہ کی اجازت مل گئی؟ اور قرآن میں کیا صحابہ کرام کی کوئی فہرست جاری کی گئی ہے جس سے آپ کو معلوم ہوجاتا ہو کہ فلاں صحابی کے حق میں سب وطعن جائز ہے اور فلاں کے حق میں نہیں؟ آپ کو خدا کا واسطہ اگر ایسا ہے تو وہ لسٹ جاری فرمادیں تاکہ اس پر عمل کیا جاسکے کیونکہ ہمارے تیس پاروں میں تو ایسی کوئی بات نہیں بتائی گئی۔

مولانا محترم صحابہ کے عظمت واحترام کے ثبوت میں اور طعن وتشنیع سے اجتناب کے لیے تو آپ کو کوئی روایت نہ مل سکی اور جو ملی بھی تو اسے آپ نے ضعیف کہہ کر نا قابل استدلال قرار دیا، حضور والا اگر کسی ضعیف روایت سے فضائل صحابہ پر آپ کی شریعت میں استدلال جائز نہیں تو آپ ہی کی تحقیق کے مطابق وہ روایت جو ضعیف اور شیعیوں کے اباطیل کا حصہ ہیں اس سے آپ نے حضرت علیؓ کے خلیفۂ بلافصل ہونے پر استدلال کیسے کرلیا؟ آپ خود فرماتے ہیں کہ "وأما ما یذکرہ الشیعة فی هذا الحدیث وغیرہ أن النبی ﷺ قال فی علی رضی اللہ عنہ إنه خلیفتی من بعدی فلا یصح بوجه من الوجوہ بل هو من أباطیلهم الکثیرة"۔

اگر یہ اباطیلِ شیعیت کا حصہ ہیں تو پھر سوالنامہ میں اس سے استدلال کے کیا معنی؟۔ کیا "سنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین عضو علیها بالنواجذ" اور "اقتدوا بالذین من بعدی أبی بکر وعمر" والی روایات بھی آپ کے معیار نقد کے اعتبار سے صحیح ثابت نہیں ہوتیں؟ اگر یہ روایات صحیح ہیں اور یقینا صحیح ہیں تو شیخین پر توہین واتہامات کے تیر آخر کیوں چلائے گئے؟

قسط نمبر-۱۱

مولانا محترم کی تقریر وتحریر کا خلاصہ، شبہات، اشکالات:

مولانا محترم نے اپنی تحریر وتقریر سے طلباء وسامعین کو جو عام تأثر دینے کی کوشش کی ہے وہ یہ ہے حضرت معاویہؓ لائق تعظیم اور قابل احترام ہستی نہیں، کیونکہ وہ صحابہ کرام کے گروہ مقدس میں شامل نہیں، اس لئے کہ صحابہ کرام کی جماعت میں (نعوذ باللہ) ہر طرح کے لوگ تھے، ان میں مؤمن بھی تھے اور منافق بھی، لہذا ہمیں قرآن کریم میں صحابہ کرام جیسے گروہ مقدس کو قرآنی آیات اور نبوی فضائل کی روشنی میں پرکھنا ہوگا کہ وہ واقعی صاحب ایمان اور مخلص مؤمن تھے یا نہیں، لہذا اگر کسی صحابی سے کوئی گناہ سرزد ہوا اور وہ گناہ فسق کی قبیل کا ہو تو اسے فاسق کہا جائیگا، اگر کفر اور گمراہی جیسا کسی سے عمل صادر ہوا تو اسے کافر کہا جائیگا، اسی قاعدہ کے مطابق چونکہ حضرت علیؓ کے حق میں بیعت منعقد ہوجانے کے بعد حضرت معاویہؓ ان سے برسر پیکار رہے اس لئے (نعوذ باللہ) وہ باغی ہیں، ان کے سلسلہ میں زبانِ نبوت سے کوئی فضیلت ثابت نہیں، ان کا ایمان معتبر نہیں، اسلئے صحابی کے چادر میں لپیٹ کر جن لوگوں نے ان کو احترام وعظمت کے مقام پر فائز کیا ہے وہ سب ناصبی ہیں، اسی طرح مولانا محترم نے حضرت علیؓ وحضرت معاویہؓ کے مابین پیش آنے والے مشاجرات میں حضرت علی کو حق پر اور ان کے مخالفین کو ضلالت وگمراہی کی راہ اختیار کرنے والے قرار دیتے ہیں، اس اعتبار سے وہ مولانا محترم کے نزدیک کسی احترام کے لائق نہیں اس سلسلہ میں مولانا محترم کا سب سے بڑا مستدل یہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "إن عمارا تقتله الفئة الباغية"۔

قارئین کرام!

گذشتہ قسطوں میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ حضرت معاویہؓ جلیل القدر صحابی ہیں، کاتبِ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، خال المسلمین ہیں، اور زبانِ نبوت سے آپ کے حق میں فضائل بھی منقول ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے غایت درجہ محبت اور سچی عقیدت رکھنے والے جانثار رفقاء میں ہیں۔ اور یہ تمام امور ہم دلائل و بینات کی روشنی میں مفصل ذکر چکے ہیں، اسی طرح صحابہ کرام اور خاص طور پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، و دیگر صحابہ کرام حضرت معاویہؓ سے جو والہانہ عقیدت و محبت اور تعلق رکھتے تھے ہم نے ان کے اقوال کی روشنی میں بیان کیا ہے، کسی نے نہ ان کے ایمان و اسلام پر تہمت لگائی اور نہ ان کو منافق ٹھہرایا، بلکہ دین و شریعت کو اخذ کرنے میں ان پر اعتماد کیا ہے، ابن حزم نے ان کو اصحاب افتا میں شمار کیا ہے ان سے روایت کرنے والے جلیل القدر صحابہ میں حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابوسعید خدری، حضرت ابودرداء، حضرت جریر، حضرت نعمان، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، حضرت وائل بن حجر، اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم وغیرہ ہیں، حضرات تابعین میں حضرت سعید بن المسیب، حضرت علقمہ بن وقاص، حضرت عروہ بن زبیر، حضرت محمد بن الحنفیہ، وعیسی بن طلحہ وحمید بن عبدالرحمن، ابوسلمہ بن عبدالرحمن، سالم بن عبداللہ اور قاسم بن محمد وغیرہ کبار تابعین ہیں، ابن حزم کا بیان ہے حضرت معاویہ سے تقریباً ۱۶۳ روایات مروی ہیں۔

حضرت علیؓ وحضرت معاویہؓ کے مابین مشاجرات اور ان کی نوعیت:

مولانا محترم کے بیانات اور ان کی تقریروں سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ قتال وجدال درحقیقت حق و باطل اور اسلام و کفر کی مابین جنگیں ہوں، جن میں سے ایک جماعت کافر اور دوسری مؤمن تھی، حالانکہ ایسا نہیں تھا، حضرت علیؓ وحضرت معاویہؓ کے مابین جو ہوا یقیناً وہ اسلامی تاریخ کا ایک اذیت ناک باب ہے، جمہور اہلِ سنت کا موقف ہے کہ ان جنگوں میں حق حضرت علیؓ کے ساتھ تھا اور حضرت معاویہؓ سے اجتہادی خطا واقع ہوئی، دونوں حق پر تھے، اور دونوں مجتہد تھے البتہ حضرت علیؓ چونکہ مجتہد ہونے کے ساتھ مصیب بھی ہیں اس لئے وہ دوہرے اجر کے حقدار ہیں، اور حضرت معاویہؓ مجتہد ہونے کے ساتھ ساتھ غلطی پر تھے اس لئے وہ ایک اجر کے حقدار ہیں، یہ معرکۂ کفر و ایمان نہ تھا اور نہ حق و باطل۔ ذیل کی سطروں میں ہم حضرت علیؓ

کے اقوال کی روشنی میں ان جنگوں کی نوعیت واضح کریں گے۔

حضرت علیؓ کے نزدیک حضرت معاویہؓ کا مقام:

حضرت علیؓ حضرت معاویہ کے بارے میں بیان فرماتے ہیں:

"أيها الناس لا تكرهوا إمارة معاوية، والله لو قد فعلتموه لقد رأيتم الرؤوس تندر من كواهلها كالحنظل"۔ (المصنف لابن أبي شيبة:۳۰۰۰۹)

ترجمہ "لوگو! معاویہ کی امارت کو ناپسند مت کرو واللہ اگر تم نے ایسا کیا تو لوگوں کے سروں کو ان کے کندھوں سے گرتے ہوئے دیکھو گے"۔

دوسری طرف حضرت معاویہ حضرت علیؓ کو کس عظمت ومحبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے وہ حضرت ضرار بن ضمرہ (حضرت علی کے خاص حمایتی ہیں) کی روایت سے بخوبی معلوم ہوتا ہے، حضرت ضرار بن ضمرہ نے حضرت علی کی شہادت کے بعد حضرت معاویہ کی درخواست پر ان کے سامنے حضرت علیؓ کے اوصاف بیان کئے تو حضرت معاویہؓ نے نہ صرف یہ کہ ان کی تصدیق کی، بلکہ اتنا روئے کہ ان کی داڑھی تر ہوگئی،

"وكان ضرار من أصحابه (علي)فدخل على معاوية بعد موته فقال صف لي عليا.....فبكى معاوية حتى اخضلت لحيته"۔ (شرح مأة كلمة لابن ميثم البحراني ۱/۴۴۵، مواقف الشيعة للميانجي:۴۵۰/۸، شرح نهج البلاغةلابن أبي الحديد:۲۶۵/۴، وانظر الحلية لابن نعيم، والتبصرة لابن الجوزي والإستيعاب لابن عبد البر، وتاريخ دمشق لابن عساكر)۔

مذکورہ عبارتیں اس امر کی صریح دلیل ہیں کہ ان دونوں کے درمیان عارضی ووقتی طور پر جو جنگ وجدال پیش آیا تھا وہ کسی ذاتی رنجش اور عداوت ودشمنی کی وجہ سے نہیں تھا، اور نہ اس میں نیتوں کا فتور اور فساد باطن کا عنصر شامل تھا، یہ سب ہنگامی مسائل اور ناگہانی صورتحال تھی جو ختم ہوگئی، البتہ بعض اسلام دشمن راویوں، اور کینہ پرور مؤرخین کی کذب بیانی نے ان واقعات کو دائمی کینہ اور عداوت کی صورت میں نقل کر دیا، علامہ ابن خلدون کا تبصرہ ان جنگوں کے سلسلہ میں

ملاحظہ فرمائیں:

"كان طريقهم فيها الحق والاجتهاد، ولم يكونوا في محاربتهم لغرض دنيوي أو لإيثار باطل أو لاستشعار حق كما توهمه متوهم وينزع إليه ملحد"۔

(تاریخ ابن خلدون: ۱/ ۲۵۷)

(ان جنگوں میں ان کا طرز عمل حق اور اجتہاد پر مبنی تھا، یہ جنگیں انہوں نے کسی دنیوی غرض یا باطل کیلئے نہیں لڑیں جیسا کہ بعض لوگوں کو وہم ہوا ہے یا بد دین اس طرح کی بات کرتے ہیں)۔

"إن عمارا تقتله الفئة الباغية" کا صحیح مفہوم:

بعض روافض اس حدیث کی بنیاد پر حضرت معاویہؓ اور ان کے ہمنواؤں کی تکفیر کے قائل ہیں، کیونکہ جس جنگ میں حضرت عمار بن یاسرؓ کی شہادت کا دردناک حادثہ پیش آیا، وہ جنگ درحقیقت اہلِ شام اور اہل عراق کے مابین ہوئی تھی اور حضرت عمارؓ اس جنگ میں حضرت علیؓ کی جماعت میں شامل تھے، اور یہ حضرت عمارؓ کے حق میں رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئی تھی جو من وعن ثابت ہوئی، اس پیشین گوئی کا تذکرہ بخاری میں ہے "عن أبي سعيد الخدري رضي الله عنه قال: كنا نحمل لبنة لبنة وعمار لبنتين لبنتين، فرآه النبي ﷺ فينفض عنه التراب، ويقول ويح عمار تقتله الفئة الباغية يدعوهم إلى الجنة ويدعونه إلى النار، قال: يقول عمار: أعوذ بالله من الفتن"۔ (بخاری، حدیث: ۲۶۰۷)

(حضرت ابوسعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک ایک اینٹ اٹھا رہے تھے اور عمار دو دو اینٹ اٹھا رہے تھے، رسول اللہ ﷺ نے ان کو دیکھا تو ان کے کپڑوں سے مٹی جھاڑنے لگے اور فرمانے لگے کہ خدا عمار کا بھلا کرے، ان کو باغی جماعت قتل کرے گی یہ ان کو جنت کی طرف دعوت دے رہے ہوں گے، اور وہ ان کو جہنم کی جانب دعوت دے رہے ہوں گے، راوی کہتے ہیں کہ حضرت عمار یہ دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ فتنوں سے میں تیری پناہ چاہتا ہوں)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عمارؓ کو قتل کرنے والی ایک ''باغی'' جماعت ہوگی، حضرت عمارؓ حق اور جنت کی جانب ان کو بلانے والے ہوں گے، اور ان کے مخالفین ان کو جہنم کی طرف

بلانے والے ہوں گے''۔

جنت کی جانب بلانے کا مطلب امیر کی اطاعت اوراس کی پیروی ہے، اورجہنم کی دعوت کا مطلب امیر کی مخالفت اور نافرمانی ہے، اس لئے کہ حضرت عمارؓ ان کو الفت ومحبت، اتحاد واتفاق اور حضرت علیؓ کے حق میں بیعت کی دعوت دے رہے تھے، اوران کے مخالفین ان کواس شخص کو امر خلافت سونپ دینے کی بات کررہے تھے جو ان کی نگاہ میں خلافت کا حضرت علیؓ سے زیادہ مستحق تھا، یہاں یہ خیال رہے کہ حضرت معاویہؓ اوران کے ہمنوا ان کو حق وعدل پر قائم سمجھ کر جنگ کررہے تھے، اوران سے یہ اجتہادی خطا ہوئی، اورجس شخص سے اجتہادی طور پر خطا صادر ہو، اوراس کے پاس معقول عذر بھی ہوتو وہ معذور ہے، حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

"ولایلزم من تسمیة أصحاب معاویة بغاة: تکفیرهم، کما کان یحاوله جهلة الفرقة الضالة من الشیعة وغیرهم، لأنهم وإن کانوا بغاة فی نفس الأمر فإنهم کانوا مجتهدین فیما تعاطوه من القتال، ولیس کل مجتهد مصیبا بل المصیب له أجران، والمخطئی له أجر"۔ (البدایة والنهایة: ۵۳۸/۴)

(ان کو باغی قرار دینے سے یہ لازم نہیں آتا وہ کافر ہیں، جیسے جاہل فرقہ شیعہ یہ بازور کرانے کی کوشش کرتا ہے، اگر چہ وہ حقیقتا باغی تھے، لیکن قتال کے معاملہ میں مجتہد تھے، اور ہر مجتہد مصیب نہیں ہوا کرتا، مجتہد مصیب کیلئے دو اجر ہیں اور مجتہد مخطئ کیلئے ایک اجر)۔

اس حدیث پر جن لوگوں نے یہ اضافہ کیا کہ "لا أنالها الله شفاعتی یوم القیامة"۔ تو ان الفاظ کا ثبوت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نہیں ہے، بلکہ اہلِ تشیع وروافض کا اضافہ ہے۔

حافظ ابن حجرؒ اس حدیث پر کلام کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"فإن قیل کان قتله بصفین، وهو مع علی، والذین قتلوه مع معاویة، وکان معه جماعة من الصحابة: فکیف یجوز علیهم الدعاء إلی النار:

فالجواب أنهم کانوا ظانین أنهم یدعون إلی الجنة، وهم مجتهدون لا لوم علیهم فی اتباع ظنونهم،... وکذلك کان عمار یدعوهم إلی طاعة علی وهو الإمام الواجب الطاعة إذ ذاك، وکانوا هم یدعون إلی خلاف ذلك، لکنهم

معذورون للتأويل الذي ظهر لهم"۔ (فتح الباری:۱/ ۵۴۲)

(اگر یہ اشکال کیا جائے کہ کہ حضرت عمارؓ صفین میں شہید ہوئے اور جن لوگوں ان کو شہید کیا وہ حضرت معاویہ کے ساتھ تھے، اوران کے ساتھ صحابہ کی ایک جماعت تھی تو بھلا ان کیلئے جہنم کی جانب بلانے والی جماعت کیسے کہا جاسکتا ہے؟۔

اس کا جواب یہ ہے وہ لوگ (حضرت معاویہ اوران کی جماعت) کا خیال یہ تھا کہ وہ جنت کی طرف بلا رہے ہیں ان پر اس بارے میں کوئی ملامت نہیں کی جاسکتی کیونکہ کہ وہ اس امر میں مجتہد تھے۔۔۔اسی طرح حضرت عمارؓ ان لوگوں کو امامِ واجب الاتباع کی پیروی کی طرف بلا رہے تھے، جبکہ فریق مخالف ان کو دوسری جانب دعوت دے رہا تھا لیکن وہ اپنی اس تأویل میں معذور تھے)۔

مولانا محترم کے علم میں ہونا چاہیے کہ "فئة باغية" جس کے ذریعہ مولانا محترم نے بہت شدومد کے ساتھ حضرت معاویہ کو زمرۂ صحابیت سے نکالنے کی کوشش کی ہے اور ہر قسم کے احترام اور قدر کے جذبات کو کم کرنا چاہا ہے اور شاید ان کے ایمان واسلام پر بھی ان کو کلام ہے اللہ تبارک وتعالی نے قرآن کریم میں "فئة باغية" کو اسلامی جماعت کا ایک حصہ قرار دیا ہے اور ان کے مابین قتال کی صورت میں اصلاح کے عمل کو لائق تحسین اور محمود عمل قرار دیا ہے، قرآن کا ارشاد ہے: "فإن بغت إحداهما على الأخرى فقاتلوا التي تبغي حتى تفيء إلى أمر الله فإن فاءت فأصلحوا بينهما بالعدل وأقسطوا إن الله يحب المقسطين، إنما المؤمنون إخوة فأصلحوا بين أخويكم واتقوا الله لعلكم ترحمون"۔ (الحجرات:۱۰-۹)

(اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے دریمان اصلاح کرادو، پھر اگر ان میں کا ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ھے، یہانتک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے، پھر اگر رجوع ہو جائے تو ان دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرادو انصاف کا خیال رکھو اور اللہ تعالی سے ڈرتے رہا کرو، تا کہ تم پر رحمت کی جائے)۔

یہ دونوں جماعتیں جو باہم متصادم ہیں اور دونوں کے درمیان قتال جاری ہے اللہ رب العزت نے جب انہیں زمرۂ مسلمین میں شامل رکھا ہے اور یہ آیت عام ہے تو کیا اس کے عموم میں

حضرت علیؓ وحضرت معاویہؓ کی جماعتیں شامل نہیں ہوسکتیں؟

لہٰذا جمہور اہلِ سنت کا موقف یہ ہے جنگ صفین وغیرہ میں امارت وخلافت کی وجہ سے جو جنگیں ہوئیں، ان میں حضرت علی حق پر تھے، جب سے حضرت عمارؓ کی شہادت کا حادثۂ جانکاہ رونما ہوا تب سے جمہور اہلِ سنت نے ہمیشہ یہی موقف اختیار کیا کہ حضرت معاویہؓ کے حق میں تفسیق ونفاق اور تکفیر وغیرہ کا حکم ثابت کرنا درست نہیں، اس معاملہ میں وہ ایک مجتہد تھے، اور مجتہد کبھی صواب تو کبھی خطا کا مرتکب ہوتا ہی ہے، اس لئے وہ اپنے گمان کے مطابق حق پر تھے، اور اپنے مخالفین کے سلسلہ میں ان کا خیال تھا کہ وہ ناحق پر ہیں، اور خود حضرت معاویہؓ کو جب حضرت عمارؓ کی شہادت کی اندوہناک خبر پہونچی تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ قتل میں نے نہیں کیا ہے، بلکہ درحقیقت قاتل وہ ہے جو ان کو اس جنگ میں لے کر آیا ہے (یعنی حضرت علیؓ جن کی جماعت کی جانب سے وہ برسرپیکار تھے)، یعنی حضرت معاویہؓ نے گویا حضرت علیؓ کو قتل کا حقیقی سبب قرار دیا فرمایا "إنما قتله من جاء به" (أحمد: ٦٩٢٦) اور یہ عذر عذر لنگ نہیں ہے، جیسا کہ مولانا محترم کے انداز بیان سے ظاہر ہوتا ہے، قرآن کریم نے بھی اس کا اعتبار کیا ہے قرآن کریم کی یہ آیت ملاحظہ ہو

ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله فيسبوا الله عدوا بغير علم"۔

صرف قرآن کریم میں نہیں بلکہ احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بھی اس قسم کی مثالیں موجود ہیں، صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ

"من الكبائر أن يشتم الرجل والديه، قالوا يارسول الله! وهل يشتم الرجل والديه؟ قال: نعم يسب أبا الرجل، فيشتم أباه، ويشتم أمه، فيسب أمه"۔ (سنن ترمذی: ١٩٠)

اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کو حضرت عمارؓ کی شہادت کی وجہ سے کسی قسم کی مذمت کا اہل قرار دینا صحیح نہیں، قرآنی قرائن، احادیث نبویہ اور خود حضرت علیؓ کا موقف بھی یہی ہے جیسا کہ ہم ذیل کی سطروں میں بیان کریں گے۔

حضرت علی کا حضرت معاویہ کے تعلق سے واضح موقف:

حضرت علیؓ کے نزدیک حضرت معاویہؓ ایک مؤمن اور صحابی اور کاتبِ رسول ہیں، وہ نہ تو فاسق ہیں اور نہ ہی مشرک اور نہ فاسق ومنافق، اپنے دعوی کی دلیل کے طور پر ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چند اقوال پیش کریں گے تاکہ معلوم ہو جائے کہ جب فریق حقیقی ان کو ایک صاحبِ ایمان تسلیم کرتا ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ یہ جنگیں اجتہاد کی بنیاد پر ہو رہی ہیں، حضرت علیؓ سے جب اہل نہروان اور ان کی جماعت کے بارے میں سوال کیا گیا کہ

"أمشركون هم؟ قال: من الشرك فروا، فقيل منافقون؟ قال: المنافقون لايذكرون الله إلا قليلا، قيل فما هم؟قال: قوم بغوا علينا فقاتلناهم"۔
(العصواصم والقواصم قال شعیب أرناؤوط - صحیح علی شرط مسلم)۔

(حضرت علیؓ سے جب اہلِ نہروان کے بارے میں سوال کیا گیا تو کہ کیا وہ مشرک ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ شرک سے تو انہوں نے فرار اختیار کیا ہے، تو سوال کیا گیا کہ کہ وہ منافق ہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ منافقین اللہ تعالی کو بہت تھوڑا یاد کرتے ہیں، سوال کیا گیا کہ پھر ان کا کیا معاملہ ہے؟ تو حضرت علی نے فرمایا کہ ان لوگوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی اس لئے ہم نے ان سے قتال کیا)۔

ایک قول اور ملاحظہ ہو

"سمع علی یوم الجمل أو یوم صفین رجلاً یغلو فی القول، فقال: لا تقولو، إنما قوم زعموا أنا بغينا عليهم، وزعمنا أنهم بغوا علينا، فقاتلناهم"۔

(تاریخ دمشق، ۱/ ۳۴۳)۔

(حضرت علی نے ایک شخص کو جمل یا صفین کے موقع پر بہت سخت بات کہتے ہوئے سنا تو فرمایا کہ ایسا نہ کہو، ان لوگوں کا خیال ہے کہ ہم نے ان کے خلاف بغاوت کی ہے اور ہمارا خیال ہے ان لوگوں نے ہمارے خلاف بغاوت کی ہے، اس لئے ہم نے ان سے قتال کیا ہے)۔

نعیم بن ابی ہند کے عم محترم نے صفین میں حضرت علی سے سوال کیا کہ "ما تقول فی

قتلانا وقتلاهم؟ فقال: من قتل منا ومنهم يريد وجه الله والدار الآخرة دخل الجنة"۔ (سنن سعيد بن منصور ۳/ ۳۷۴، رقم: ۲۹۶۸)۔

(ہمارے اوران کے مقتولین کے بارے میں آپ کی کیارائے ہے؟ تو فرمایا کہ جو اللہ کی رضا اور آخرت کی طلب میں فریقین کی جانب سے قتل ہوا وہ جنتی ہے)۔

ایک شخص نے حضرت علی سے دریافت کیا تو فرمایا کہ "قتلانا وقتلاهم في الجنة"۔ (مصنف ابن ابی شیبة: رقم: ۳۹۰۳۵)

عدی بن حاتم قبیلۂ طیء کے ایک شخص کو حضرت علی کی جماعت نے قتل کیا تھا تو یہ دیکھ کر کہنے لگے کہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ یہ بے چارہ کل مسلمان تھا اور کا فرمرا پڑا ہے، حضرت علی نے فرمایا ایسا مت کہو، یہ کل بھی مؤمن تھا اور آج بھی مؤمن ہے۔

(تاریخ دمشق لابن عساکر: ۱/ ۳۴۴)

دوسری روایات میں ہے حضرت علی کی جماعت نے حضرت معاویہ کے مقتولین کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ مؤمن ہیں"۔

(تاریخ دمشق لابن عساکر: ۱/ ۳۴۴، وبغیۃ الطالب فی تاریخ حلب: ۱/ ۹۹۲)

حضرت علیؓ حضرت معاویہ کے بارے میں بیان فرماتے ہیں "أيها الناس لا تكرهوا إمارة معاوية، والله لو قد فعلتموه لقد رأيتم الرؤوس من كواهلها تندر كالحنظل"۔ (المصنف لابن أبي شيبة: ۳۰۰۰۹)

ترجمہ "اگر حضرت معاویہ نہ ہوں تو لوگوں کے سروں کو ان کے کندھوں سے گرتے ہوئے دیکھوگے"۔

خود اہلِ تشیع کی نزدیک بھی ان کی مقدس کتاب "نہج البلاغۃ" کے بیان کے مطابق حضرت علی ومعاویہ میں اختلاف خونِ عثمان کی وجہ سے تھا، حضرت علی کا قول نہج البلاغۃ میں ہے کہ

"والظاهر أن ربنا واحد، ودعوتنا في الإسلام واحدة، ولا نستزيدهم في الإيمان بالله والتصديق برسوله، ولا يستزيدونا، الأمر واحد إلا ما اختلفنا من دم عثمان ونحن منه براء"۔ (نهج البلاغة: ۲/ ۱۱۴، وشرح نهج البلاغة: ۵/ ۱۹۴)

(ظاہر ھے کہ ہمارا اور ان کا رب ایک ہے اور ہماری دعوت کی بنیاد یعنیا سلام ایک ہے، ایمان باللہ اور تصدیق رسول سے زیادہ کے نہ ہم ان سے طالب ہیں اور نہ وہ ہم سے طالب ہیں، ہمارے درمیان صرف خون عثمانؓ کے بارے میں اختلاف ہے، اور ہم ان کے قتل سے بری ہیں)

امام ابوزرعہ رازی کے پاس ایک شخص آیا ہے اور اس نے کہا کہ اسے حضرت معاویہؓ سے نفرت ہے اور وہ ان سے بغض رکھتا ہے، تو امام ابوزرعہ نے اس سے سوال کیا کہ آخر کیوں؟ تو اس نے کہا کہ چونکہ انہوں نے حضرت علی سے قتال کیا، تو امام ابوزرعہ نے اسے بہت شاندار جواب دیا فرمایا کہ "ويحك إن رب معاوية رحيم، وخصم معاوية خصم كريم، فأيش دخولك أنت فيهما؟ رضي الله عنهما۔ (ابن عساکر)

(خدا تجھے غارت کرے حضرت معاویہؓ کا رب رحیم ہے، اور ان کا فریق مخالف بھی کریم ہے، تو تم ان دونوں کے درمیان کہاں سے آ کودے)۔

لیکن اس سب کے باوجود روافض اور اہلِ تشیع کو چین وقرار حاصل نہیں ہوتا، ان کی ہر ممکن کوشش یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح حضرت معاویہؓ اور ان کی جماعت کو دائرہ ایمان سے خارج کر دیں، کبھی ان پر تفسیق تو کبھی نفاق اور کبھی تکفیر کے حملے ہوتے ہیں، اور کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت عثمان کے ولی نہیں تھے تو انہوں نے خونِ عثمان کے بدلہ کا دعوی کیوں کیا؟ ہمارا جواب بھی امام ابوزرعہ رازیؒ ہی طرح ہے، کہ حضرت علی جب حضرت معاویہؓ کو نہ کافر کہتے ہیں اور نہ منافق کہتے ہیں، اور نہ ہی فاسق قرار دیتے ہیں، تو آخر ہم ان دونوں کے معاملات میں مداخلت کیوں کرتے ہیں؟ اور حضرت علیؓ کی مظلومیت ثابت کر دینے اور حضرت معاویہؓ کو منافقین وفاسقین کی صف میں لا کھڑا کرنے سے ہمارا کیا دینی ودنیوی مقصود وابستہ ہے؟۔

قسط نمبر۔ ۱۲

سوال: ''کیا حضرت حسنؓ کو یزید کی سازش کے نتیجے میں ان کی بیوی جعدہ نے زہر نہیں دیا تھا؟ (اہلِ سنت مؤرخین ومحدثین کی کتابوں میں کیا یہ حقائق درج نہیں ہیں)''۔

جواب:

وعين الرضا عن كل عيب كليلة

كما أن عين السخط تبدى المساويا

مولانا محترم کا اندازِ سوال یہاں کافی بہتر ہے، بہتر اس وجہ سے کہ انہوں نے دیگر روافض کی طرح یہاں طعن وتشنیع کا ہدف براہ راست امیر المؤمنین سیدنا حضرت معاویہؓ کو نہیں بنایا، ہمارا بنیادی اختلاف مولانا محترم اور ان کے ہمنواؤں سے ان مسائل میں ہے جن کا تعلق حضرات صحابۂ کرام اور حضرت معاویہؓ جیسے نفوس قدسیہ سے ہے، البتہ وہ مواقع جہاں حضرات صحابہؓ کرام کے علاوہ دیگر لوگ مولانا محترم کے تیر وتفنگ کا نشانہ ہیں، وہ ہمارے موضوع سے خارج ہے، لیکن چونکہ اس سوال میں بھی اہلِ تشیع سے مرعوبیت یا متأثر ہونے کا احساس جھلکتا نظر آتا ہے اس لئے مناسب محسوس ہوا کہ سیدنا حضرت حسنؓ کے واقعۂ زہر خورانی کی تحقیق، تاریخی وعلمی اصول وآئین کی روشنی میں کرلی جائے۔

سیدنا حضرت حسنؓ کی وفات:

جمہور اہلِ سنت اور اہلِ تشیع کے نزدیک سیدنا حضرت حسنؓ کی وفات ۴۹ھ میں ہوئی، اس کے علاوہ ۵۰ھ اور ۵۱ھ کے اقوال بھی ہیں۔

زہر کس نے دیا؟

''مولانا محترم نے اپنے سوال میں یہ فیصلہ فرما دیا ہے کہ زہر یزید بن معاویہ کی سازش سے

حضرت حسنؓ کی بیوی جعدہ بنت اشعث نے دیا، اور مولانا محترم نے اسے تاریخی حقیقت قرار دیا ہے''۔

اور اس ''تاریخی حقیقت'' کا حال یہ ہے کہ قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وفات کا سبب زہر خورانی ہی ہے یا نہیں؟ اور یہ واقعہ واقعی کسی سازش کے تحت ظہور میں آیا ہے یا نہیں؟ اور اگر زہر خورانی ہی سبب ہے تو اس کے پس پردہ سیاسی عناصر کارفرما تھے یا اور کوئی وجہ تھی جسے تاریخ کی عقابی نگاہیں محفوظ نہ رکھ سکیں۔

اس واقعہ کو، حاکم نے مستدرک (۶/ ۸۴) میں ابونعیم نے حلیہ (۲/ ۳۸) ذکر کیا ہے۔ لیکن زہر دینے والے کا ذکر نہیں۔

حلیۃ الأولیاء میں ان کا بیان ہے

"قال الحسن بن علی: إنی ألقیت طائفة من کبدی وإنی سقیت السم مرارا فلم أسق مثل هذه المرة"۔

(حضرت حسنؓ کہتے ہیں کہ میرے جگر کے ٹکڑے ٹکڑے گر رہے ہیں، مجھے کئی بار زہر دیا گیا لیکن اس جیسا پہلی بار مجھے دیا گیا)۔

جبکہ علامہ ابن حجر وغیرہ نے واقعۂ زہر خورانی کو ہی صیغۂ تمریض سے بیان کیا ہے، کہتے ہیں کہ ویقال: إنه مات مسموما" (إصابه) علامہ ابن جریر طبری خطیب بغدادی، وغیرہ نے زہر کی وجہ سے وفات پانے کا تذکرہ نہیں کیا۔ البتہ حضرت حسنؓ کے بیان سے جو بعض تاریخ کی کتابوں میں درج ہے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی وفات زہر خورانی کی وجہ سے ہوئی، زہر کس نے دیا اور کیوں دیا؟ کس کے اشارہ پر دیا؟ اس بات کا علم نہیں ہوتا، ایسی صورتحال میں کسی کی ذات پر اتہام لگانا درست نہیں، جبکہ تک اس کے شرعی دلائل موجود نہ ہوں، مولانا محترم نے جس قطعیت اور حتمی انداز میں یزید کے خلاف فیصلہ سنایا ہے کہ وہ اس سازش میں شریک تھا یہ شاید شیعیت سے متأثر ہو جانے اور بنوامیہ وخاندان معاویہؓ سے قلبی نفرت کی وجہ سے ہے۔

اہلِ سنت کی کتابوں میں حضرت معاویہؓ کے سلسلہ میں کہیں یہ ذکر نہیں زہر انہوں نے دیا، یا وہ زہر خورانی کی سازش میں شریک تھے، اور قرائن وسیاسی صورتحال بھی اس امر کی نفی کرتی ہیں

کہ حضرت معاویہؓ کی ذات محترم کو اس واقعہ میں (اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو) شریک کیا جائے، یہ اہلِ تشیع کی جانب سے ان پر ایک تہمت ہے جس کا کوئی ثبوت ان کے پاس نہیں۔

ابن خلدون کا بیان واقعہ زہر خورانی کے سلسلہ میں یہ ہے کہ:

"وما نقل من أن معاوية دس إليه السم مع زوجته جعدة بنت الأشعث، فهو من أحاديث الشيعة، حاشا لمعاوية من ذلك". (تاریخ ابن خلدون: ۶۴۹)

(یہ جو منقول ہے کہ حضرت معاویہ نے حضرت حسن کی بیوی جعدہ کے ساتھ مل حضرت حسن کو زہر دیا تو یہ شیعوں کی وضع کردہ بات ہے، حضرت معاویہ کا مقام اس سے بہت بلند ہے)۔

ابن سعد نے طبقات میں ۳۳۶/۱، ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں ۲۸۳/۱۳ ۲۸۳۲ میں حافظ ابن حجر نے ۶۶/۲ پر حاکم کی روایت پر جس میں زہر خورانی کا واقعہ موجود ہے یہ اضافہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت حسین کے پوچھنے پر کہ آپ کو زہر کس نے دیا؟ حضرت حسن نے بتلانے سے انکار کر دیا، علامہ ذہبیؒ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حسن کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ زہر کس نے دیا۔

ابن اثیر نے اسد الغابہ میں بلا سند زہر دینے کی نسبت حضرت حسن کی زوجہ جعدہ کی جانب کی ہے، اور اس پر علامہ ابن عبد البر نے استیعاب میں "قالت طائفۃ" کہہ کر اور لوگوں کو بھی اس جرم میں شریک کر دیا ہے، اور انہوں نے یہ اضافہ کیا ہے کہ یہ جرم حضرت معاویہ کے اشارہ پر ہوا، جبکہ علامہ ذہبی نے ابن عبد البر کے اس قول کی سخت تردید کی ہے ذہبی کا قول ہے کہ: هذا شيء لا يصح، فمن الذي اطلع عليه". (تاريخ الإسلام للذهبي ۴۰/۴).

غرض کہ سیدنا حضرت حسنؓ کی وفات کے سلسلہ میں تاریخ کے بیانات میں بہت اختلاف ہے، اور سبب کا تعین کرنا مشکل ہے، اس کا سبب کیا تھا کسی کو معلوم نہیں، تاریخ کی کتابوں میں جہاں کسی امر کی صراحت ہے وہ کتابیں خود وفات سے تقریبا دو تین صدیوں بعد مدون ہوئی ہیں اور ان میں رطب و یابس سب کچھ موجود ہے اس لئے قطعیت کی ساتھ کوئی فیصلہ سنا دینا، ایک اعتدال و انصاف پسند شخص کو زیب نہیں دیتا، ہوسکتا ہے کہ زہر کی وجہ سے وفات ہوئی ہو، یہ بھی ممکن ہے زہر اس کا سبب نہ ہو، اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ زہر کی وجہ سے وفات ہوئی تو بھی

ضروری نہیں کہ جعدہ نے زہر دیا ہو، اور یہ مان یا جائے کہ زہر جعدہ نے دیا تب بھی یہ ضروری نہیں کہ وہ یزید یا کسی اور کی سازش کی وجہ سے ہو۔

پتہ نہیں یزید کو قاتلِ حسنین ثابت کرنے میں مولانا محترم کے کیا مقاصد کارفرما ہیں؟ اور ان کو اتنی دلچسپی آخر کیوں ہے؟ کہ بعض مختلف فیہ تاریخی روایات کو اس قطعی اور یقینی صورت میں اس طور پر پیش فرماتے ہیں کہ جیسے یہ کوئی مسلمہ حقیقت ہو۔

غالب گمان یہ ہے کہ جن اہلِ سنت کی کتابوں میں واقعہ زہر خورانی کا تذکرہ ہے، یا اس فعلِ شنیع کی نسبت حضرت معاویہ یا ان کے فرزند یزید کی جانب کی گئی ہے، یہ شیعی روایات کو قبول کرنے کا نتیجہ ہے، اور یہ اہلِ تشیع کی بدگمانی وافترا پردازی ہے جسے بعض مصنفین نے بلا سند اور بے دلیل ذکر ڈالا ہے، اہلِ تشیع کی کتاب مثلاً شیخ مفیدی کی ال ارشاد، ۲/ ۲۴، احمد امینی شیعی کی الغدیر: ۵/ ۲۴، ابوالحسن اربلی شیعی: کی کشف الغمۃ ۱/ ۲۰۸ میں یہ واقعہ موجود ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے یہ روایت من گھڑت ہے اور بغض معاویہ و بنی امیہ کی وجہ سے اس کو وضع کیا گیا ہے۔

مولانا محترم علم و فضل کا بحرِ زخار ہیں، اور نادر و شاذ تحقیق پیش کرنا ان کا دلچسپ مشغلہ ہے، ان کے علم میں تو ہوگا ہی محض تذکیر کے لئے عرض کرنا ہے کہ حقائق کی جستجو کا اصولِ اولین عدمِ عصبیت کے جذبات ہیں، تعصب وغیر جانبداری تحقیق وانصاف کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنتے ہیں، مولانا محترم کو چاہئے تاریخ کی ورق گردانی کرتے ہوئے اولا وہ تعصب و گروہ بندی کے جذبات سے، اور بغض و نفرت سے آئینۂ قلب و نظر پاک وصاف کر لیں حقائق ان کے سامنے آفتاب نصف النہار کی طرح روشن نظر آئیں گے، دوسری درخواست یہ ہے کہ مولانا محترم! تاریخ کا ہر بیان معتبر نہیں ہوا کرتا، اور نہ ہی تاریخ کی ہر کتاب حقائق کی کتاب ہوتی ہے، تاریخ میں بے شمار رطب و یابس بیانات موجود ہیں ہر ایک کو تاریخی حقیقت نہیں کہتے، تاریخ کے کسی واقعہ کو تاریخی حقیقت تک کا سفر طے کرانے میں دلیل کی ضرورت پیش آتی ہے، اسے اصولِ تحقیق و معیارِ تنقید کے مطابق پرکھا جاتا ہے تب کہیں جا کر وہ تاریخی حقیقت بنتا ہے، یہ عجیب و غریب اصولِ تحقیق ہے کہ حضرت معاویہؓ اور ان کے ہمنواؤں کے حق میں مولانا محترم کو بخاری و مسلم اور ترمذی کی روایات بھی قبول نہیں اور دوسری طرف ان کے خلاف تاریخ کا ہر بیان خواہ بے دلیل

و بے سند ہی کیوں نہ ہو قبول ہے، قبول ہی نہیں بلکہ ان کے نزدیک ایک تسلیم شدہ حقیقت اور امر واقعی بن جاتا ہے۔ یا للعجب !!

مولانا محترم نے فرمایا ہے کہ یہ حقائق اہلِ سنت کی کتابوں میں درج ہیں، پتہ نہیں اہلِ سنت سے مراد مولانا محترم کے نزدیک کون لوگ ہیں؟ جب صحابہ کرام کی معروف و متداول تعریف ہی ان کو تسلیم نہیں تو ہوسکتا ہے کہ ''اہلِسنت'' کی تعریف بھی مولانا کے نزدیک کچھ اور ہو، اس کے بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

قسط نمبر۔ ۱۳

مولانا محترم کا عنایت نامہ اور اس کا جواب

مولانا محترم کا عنایت نامہ

”جناب نصر فاروقی صاحب اور ان کے پیچھے اور آگے جو مولوی صاحبان ہیں، حدیث کی تخریج دیکھ لیں:

قال الحافظ ابن حجر:

وأما حديث من كنت مولاه فعلى مولاه، فقد أخرجه الترمذى والنسائى، وهو كثير الطرق جداً، وقد استوعبها ابن عقدة فى كتاب مفرد، و كثير من طرقها صحاح وحسان، وقد روينا عن الإما م أحمد قال:ما بلغنا عن أحد من الصحابة ما بلغ عن على بن أبى طالب۔ (فتح البارى:۷/۷۴)

۱۷۵۰-(صحيح) من كنت مولاه فعلى مولاه، اللهم وال من والاه، وعاد من عاداه)۔ صحيح۔

انظر طرقه وشواهده فى الكتاب فهى كثيرة۔وأولها عن أبى الطفيل عنه قال: لما دفع النبى ﷺ من حجة النبى ﷺ من حجة الوداع، ونزل غدير خم أمر بدوحات فقمن ثم قال: كأنى دعيت فأجبت وإنى تارك فيكم الثقلين أحدهما أكبرمن الآخر: كتاب الله وعترتى أهل بيتى، فانظروا كيف تخلفونى فيهما، فإنهما لن يترفرقا حتى يردا على الحوض ثم قال:إن الله مولاى وأنا ولى مؤمن۔ ثم إنه أخذ بيد عليرضى الله عنه فقال:من كنت مولاه فهذا وليه، اللهم وال من والاه وعاد من عاداه، صحيح۔ وأما ما يذكره الشيعة فى هذا الحديث وغيره أن النبى ﷺ قال فى على رضى الله

عنه: إنه خليفتي من بعدي، فلا يصح بوجه من الوجوه، بل هو من أباطيهم الكثيرة۔ تابع الموضوع في الكتاب (السلسلة الصحيحة: ۲۳۰/۴)

قال الإمام الذهبي:

هذا حديث عال جدا ومتنه فمتواتر ۔ (سير أعلام النبلاء، ۳۳۵/۸)۔

-۲۵۹۱ من كنت مولاه فعلي مولاه، رواه الطبراني وأحمد والضياء في المختارة عن زيد بن أرقم وعلي وثلاثين من الصحابة بلفظ اللهم وال من والاه وعاد من عاداه، فالحديث متواتر أو مشهور (كشف الخفاء ۲۷۴/۲)۔

اس کو پڑھنے کے بعد نصر فاروقی ندوی صاحب! ذرا حدیث پر اپناوہ تبصرہ دیکھ لیں جو آپ کو کسی متملق سلفی اور سعودی چمچہ نے دیا ہے، اگر فاروقیت کی نسبت صحیح ہے، اور ندویت کی سند بھی صحیح ہے، تو اس کی لاج رکھیں!۔

جواب: مولانا محترم کا یہ عنایت نامہ موصول ہوا تو ہم نے اس سے صرف نظر کرنا اور جواب نہ دینا کئی وجوہ سے مناسب سمجھا، ایک تو یہ کہ اس میں نہ مولانا کا نام ہے اور نہ ان کے لیٹر پیڈ اور دستخط سے مزین ہے، دوسرے اس وجہ سے بھی کہ اس میں ہمارے اور مولانا محترم کے درمیان جو بنائے اختلاف ہے اس سے تعرض ہی نہیں کیا گیا، اور نہ اس میں ہمارے پیش کردہ کسی سوال کا جواب ہے، لیکن پھر شوشل میڈیا میں احباب اور مولانا کے متعلقین کے بار بار تقاضے کے بعد ہم مجبور ہوئے کہ اس کا جواب دے دیا جائے، لہذا تعمیلِ حکم میں حدیثِ مذکور پر اپنے تبصرہ پر نظر ثانی کی تا کہ حدیث کی صحت وعدم صحت کا یقینی طور پر علم ہو سکے ہم نے حدیثِ زیر بحث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

''یہ حدیث ترمذی ۳۷۱۳، ابن ماجہ ۱۲۱، اور مسند احمد وغیرہ میں منقول ہے، علامہ زیلعی نے نصب الرایہ فی تخریج الہدایہ میں: ۱۸۹۱، میں کہتے ہیں: وكم من حديث كثرت رواته وتعددت طرقه وهو حديث ضعيف كحديث "من كنت مولاه فعلي مولاه"۔

علامہ ابن تیمیہ منہاج السنۃ ۱۳۹/۷، میں رقمطراز ہیں: ''یہ روایت صحاح میں موجود نہیں، لیکن دیگر کتب حدیث میں علما نے اسے روایت کیا ہے، اس کی صحت اور عدمِ صحت کے بارے

میں ناقدینِ حدیث کے مابین اختلاف ہے، امام بخاری ابراہیم حربی وغیرہ نے اس پر کلام کیا ہے، البتہ اس روایت پر جو اضافہ ہے یعنی اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ، تو بلاشبہ یہ کذب بیانی ہے"۔ البتہ علامہ البانی نے اس حدیث کو السلسلۃ الصحیحۃ ۱۷۵۰ میں صحیح کہا ہے)
خلاصہ یہ کہ روایت صحیح ہے۔

قارئین کرام غور فرمائیں!

اس حدیث پر ہمارا تبصرہ صرف یہ تھا کہ یہ روایت صحیح ہے، اس کے علاوہ علامہ زیلعیؒ اور ابن تیمیہؒ کا تبصرہ پیش کیا گیا ہے، جو ان کی کتابوں میں مذکور ہے، اور اس کا حوالہ بھی دیا گیا ہے، اگر یہ حوالے غلط ہوتے تو ہم پر زیادتی کرنے کا اعتراض صحیح ہوتا، ہم نے اس حدیث پر صحت کا حکم ذہبی والبانی اور دیگر محققین کی متابعت ہی میں نقل کیا ہے، رہی ان تبصروں کے نقل نہ کرنے کی بات جن سے اس حدیث کی حیثیت ذرا مضبوط ہوتی ہے ان کو ہم نے اختصار کی وجہ سے ذکر نہیں کیا، اسی طرح بعض وہ تبصرے بھی ذکر نہیں کئے جن سے اس حدیث کی حیثیت مجروح ہوتی ہے، وجہ وہی تھی کہ بنائے اختلاف حدیث کی صحت اور عدم صحت نہیں ہے، اختلاف مفہومِ حدیث کی تحدید میں ہے، مولانا محترم نے بھی نقاد محدثین کی ان آراء سے اعتنا نہیں برتا، جس سے اس حدیث کی صحت مجروح ہوتی ہے، حالانکہ ان کی آراء اس باب میں کافی اہمیت کی حامل ہیں ذیل میں ہم ان میں سے چند آراء کا ذکر کرتے ہیں:

قال ابن حزم:

"وأما من كنت مولاه فعلي مولاه" فلا يصح من طريق الثقات أصلا، وأما سائر الأحاديث التي يتعلق به الروافض فهي موضوعة، يعرف له ذلك من له أدنى علم بالأخبار ونقلها"۔ (منهاج السنة، ۷/۱۳۹)

خلاصہ یہ کہ اس روایت پر کلام کرنے والے ناقدینِ حدیث میں امام بخاری، ابراہیم حربی، علامہ زیلعی، ابن حزم اور ابن تیمیہ رحمہم اللہ جمیعاً ہیں، اور اس روایت کی توثیق وتصحیح، وتحسین اور بسا اوقات تواتر کا حکم لگانے والوں میں متأخرین محدثین میں ابن حجر حافظ ذہبی، عجلونی وغیرہ ہیں۔ یعنی اس حدیث پر دونوں قسم کے آراء متقدمین ومتأخرین محدثین کے یہاں

موجود ہیں، اسی لئے ہم نے اس حدیث پر موضوع یا ضعیف ہونے کا تبصرہ نہیں کیا۔ بلکہ یہ کہا ہے کہ یہ روایت صحیح ہے۔

غور فرمائیں جن محدثین نے اس پر کلام کیا ہے وہ امام بخاری وابن حزم اور علامہ زیلعی جیسے ناقدین حدیث ہیں، جن کی علم حدیث اور نقل حدیث میں حزم واحتیاط اور ثقاہت کی دنیا معترف ہے، انہوں نے اس پر کلام کیا ہے، اور حدیث ''غدیر'' جو متأخرین کے یہاں مشہور ومتواتر تک پہنچ رہی ہے کیا وجہ ہے کہ شیخین نے صحیحین میں اس کا تذکرہ نہیں کیا، بلکہ امام مسلم نے جہاں حدیث غدیر نقل فرمائی، وہاں بھی "وعترتي أهل بيتي" کے الفاظ ذکر نہیں کئے؟۔ ہمیں اعتراف ہے کہ شیخین کا صحیحین میں کسی حدیث کو ذکر نہ کرنا عدمِ صحت کی دلیل نہیں، لیکن غور وفکر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آخر جو حدیث متأخرین کے یہاں مشہور اور متواتر کے درجہ کی ہو، اس پر متقدمین محدثین امام بخاری، ابراہیم حربی اور ابن حزم جیسے اساطینِ علم حدیث اور ائمۂ جرح وتعدیل کے اتنے سخت تبصرہ ہیں؟ بلکہ علامہ زیلعی تو یہاں تک کہتے ہیں کہ "ولا يزيد كثرة الطرق إلا ضعفا"۔ ع کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ ہمارا تبصرہ یہ ہے کہ یہ روایت صحیح ہے اور اس کا متن متواتر ہے۔

جرح وتعدیل مولانا کا موضوع ہے، ان کو ضرور معلوم ہوگا کہ کسی حدیث یا روای کے بارے میں صرف اپنے مطلب کی بات بیان کرنا اور دوسرے پہلو سے آنکھ بند کر لینا خود ناقل کی شخصیت کو مجروح کر دیتا ہے، علامہ عبدالحئ لکھنوی ''الرفع والتکمیل'' میں لکھتے ہیں:

"قلت: هذه النصوص لعلها لم تقرع صماخ أفاضل عصرنا وأماثل دهرنا، فإن شيمتهم أنهم حين قصدهم بيان ضعف روايةينقلون من كتب الجرح والتعديل، الجرح دون التعديل، فيوقعون العوام في المغلطة، لظنهم أن هذا الرواى عار عن تعديل الأجلة، والواجب عليهم أن ينقلوا الجرح والتعديل كليهما، ثم يرجحوا -حسبما يلوح لهم- أحدهما، ولعمري تلك شيمة محرمة وخصلة مخرمة"۔ (الرفع والتكميل:٦٦)

الزام ان کو دیتے تھے، قصور اپنا نکل آیا

اہم ترین سوال مولانا محترم کی خدمت میں:

عرض یہ کرنا ہے کہ ہمیں مولانا محترم سے اختلاف اس حدیث کی صحت اور عدم صحت کے باب میں نہیں یہ تو ایک ضمنی بحث ہے جو درمیان کلام میں آ گئی، یہ حدیث خواہ صحیح ہو مشہور ہو یا متواتر ہو، یا ضعیف غیر صحیح اور موضوع ہو، ہمیں اس سے کوئی واسطہ نہیں، ہمارا اختلاف درحقیقت حدیث کے مفہوم کی تحدید میں ہے۔

مولانا محترم فرماتے ہیں ذہبی ابن عقدۃ اور عجلونی کی کتابیں ہیں، یاد رہے کہ ان کتابوں میں روایت کے طرق جمع کئے گئے ہیں، مفہوم کی تحدید نہیں کی گئی، مولانا محترم سے درخواست ہے کہ ذرا یہ بتائیں حدیث کا یہ مفہوم جو آپ کے نزدیک ہے، ابن حجر، ذہبی اور عجلونی وغیرہ نے بھی اسی مفہوم کی تحدید کی ہے؟ یا مولانا محترم کے بیان کردہ مفہوم کی تردید کی ہے؟ مولانا محترم کو یہ تو معلوم ہے کہ ذہبی نے اس حدیث پر مستقل تصنیف کی ہے، تو پھر ان کی نگاہوں سے یہ بات کیسے اوجھل ہوگئی کہ ذہبی نے ''منہاج السنۃ فی نقض کلام الشیعۃ والقدریۃ'' کی تلخیص ''المنتقی'' کے نام سے کی ہے۔

ابن عقدۃ:

مولانا محترم نے اس حدیث کی صحت پر ایک حوالہ ابن عقدہ جیسی شخصیت کا بھی دیا ہے اور وہ شیعہ ہے، عقدہ کون ہیں ذرا ملاحظہ کریں:

دارقطنی کا تبصرہ یہ ہے:

''اس کے یہاں مناکیر کی کثرت ہے'' مزید کہتے ہیں ''لم یکن فی الدین أقوی وأکذب من یتهمه بالوضع، إنما بلاؤہ هذہ الوجادات''۔

ابن عدی کا تبصرہ یہ ہے:

''صاحب معرفة وحفظ، وتقدم فی الصنعة، رأیت مشایخ بغداد یسیئون الثناء علیه''۔

ابوعمرو بن حیوہ کا قول ہے:

"كان ابن عقدة يملي مثالب الصحابة أو قال:مثالب الشيخين، فتركت حديثه"۔

خلاصہ یہ کہ ابن عقدہ ایک شیعہ راوی ہے اور ظاہر ہے کہ جب کوئی راوی کسی حدیث میں اپنے فکر ونظر کی تائید کررہا ہوتو اس کا بھلا کیسے اعتبار ہوسکتا ہے؟۔

محدثین کے یہاں ابن عقدہ کے تعلق سے دونوں قسم کے اقوال ہیں، وہ متوسط درجہ کا راوی ہے، بعض نے اس کی توثیق کی ہے تو بعض نے اس کی تجریح۔

مولانا محترم نے سوالنامہ میں فرمایا تھا کہ ان سوالوں کا جواب علمی انداز میں دیں اِدھر اُدھر کی بات نہ کریں، مولانا محترم سے سوال یہ ہے کہ کیا علمی بحث کا یہی انداز ہوتا ہے؟ اور کیا یہی تحقیقی متانت ہے کہ کسی کو ناصبی اور سعودی چمچہ جیسے خطابات دئے جائیں؟ مولانا محترم نے فرمایا ہے:

''اس کو پڑھنے کے بعد جناب فاروقی ندوی صاحب! ذرا حدیث پر اپنا تبصرہ دیکھ لیں جو آپ کو کسی متملق سلفی اور سعودی چمچہ نے دیا ہے، اگر فاروقیت کی نسبت صحیح ہے، اور ندویت کی سند بھی صحیح ہے، تو اس کی لاج رکھیں!''۔

کسی حدیث پر اساطینِ فنِ حدیث اور ائمۂ جرح وتعدیل کے اقوال نقل کرنا کیا ناصبیت ہے؟ یا اس سے کوئی سعودی چمچہ ہوجاتا ہے؟۔

مولانا محترم سے درخواست ہے کہ انہوں نے علمی بحث وتمحیص کی دعوت دی ہے تو تحقیقی متانت اور علمی شان کا خیال رکھتے ہوئے بنائے اختلاف پر توجہ مرکوز فرمائیں، اور حدیث غدیر کا صحیح مفہوم جو ان کے نزدیک معتبر ہے بیان فرمائیں۔

مولانا محترم کو حدیث "من كنت مولاه فعلي مولاه" کی صحت اور اس کے تواتر پر اصرار شدید ہے اور ہم نے پہلے بھی اعتراف کیا تھا کہ وہ حدیث صحیح ہے لیکن اس سے حضرت علیؓ کا خلیفۂ بلا فصل ہونا ثابت نہیں ہوتا اور اگر مان لیا جائے کہ اس سے خلیفۂ بلا فصل ہی مراد ہے تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہؓ کے سلسلہ میں مولی کا لفظ استعمال کیا ہے تو کیا حضرت زید بن حارثہؓ بھی خلیفۂ بلا فصل ہیں؟ یہ بخاری کے طلبہ کا سوال ہے، بخاری کی روایت ہے کہ:

"فقضى بها النبى صلى الله عليه وسلم وقال: الخالة بمنزلة الأم، وقال لعلى: أنت منى وأنا منك، وقال لجعفر: أشبهت خَلقى وخُلقى، وقال لزيد: أنت أخونا ومولانا"۔ (صحيح البخاری: ۲۶۹۹)

(آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ خالہ ماں کی جگہ ہوتی ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی سے فرمایا کہ تو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے ہوں نیز حضرت جعفر سے فرمایا کہ تو صورت و سیرت میں میری مانند ہو، اور حضرت زید بن حارثہ سے فرمایا کہ تم میرے بھائی اور میرے مولی ہو)۔

قسط نمبر - ۱۴

سوال: ''کیا معاویہ کے مقابلہ میں علی وعمار اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ رہنے کی ہدایت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واضح الفاظ میں نہیں دی تھی''؟

جواب: مولانا محترم سے درخواست ہے اگر واقعی کوئی ایسی واضح ہدایت ہے کہ جس میں حضرت معاویہؓ کے ساتھ رہنے کی ممانعت اور سیدنا حضرت علیؓ وعمارؓ کے ساتھ رہنے کا حکم ہے، تو بجائے بیشمار سوالات، اشکالات، اتہامات وغیرہ کے آپ کو اولا وہ ہدایت پیش کرنی چاہئے کہ ''اے امتِ مسلمہ کے جانثارو! معاویہ کے ساتھ نہ رہنے کا حکم موجود ہے، اور سیدنا حضرت علی وعمار کی رفاقت کا حکم نبوی موجود ہے، لہذا اس نبوی حکم کی تعمیل ہونی چاہئے''۔ حضور والا ہمارے علم میں تو ایسی کوئی واضح ہدایت موجود نہیں، اور آپ نے بھی اس واضح ہدایتِ نبوی کو واضح انداز میں ذکر نہیں فرمایا، تو یہ واضح ہدایت ہمارے لئے تو اب بھی غیر واضح ہے، اور جمہور اہلِ سنت کے نزدیک تو صدیوں سے اب تک غیر واضح ہی ہے، خدا کے واسطے اس واضح ہدایت کی وضاحت مع حوالہ ذکر فرمائیں، تاکہ جمہور اہلِ سنت کے ذہن وخرد بھی اس سے آشنا ہو سکیں۔

ہمیں تو اس واضح ہدایت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم ہے جو حضرت ابو ہریرۃ، حضرت ابو ذر، حضرت ابوموسی اشعری، وحضرت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہم وغیرہ کے حوالہ سے مروی ہے فرماتے ہیں:

''عن أبي بكرة عن رسول الله ﷺ قال:إنها ستكون فتن، ثم تكون فتنة، ألا فالماشي فيها خير من الساعي إليها، ألا والقاعد فيها خير من القائم فيها، ألا والمضطجع فيها خير من القاعد، ألا فإذا نزلت فمن كانت له غنم فليلحق بغنمه، ألا ومن كانت له أرض فليلحق بأرضه، ألا ومن كانت له إبل فليلحق بإبله، فقال رجل من القوم، يا نبي الله جعلني فداءك، أرأيت من ليس له غنم ولا إبل كيف يصنع؟ قال:فليأخذ سيفه، ثم ليعمد به إلى صخرة ثم ليدقه على

حده بحجر، ثم لينجو به، إن استطاع النجاة، اللهم هل بلغت، اللهم هل بلغت، فقال رجل يا نبي الله، جعلني الله فداء ك، أرأيت إن أخذ بيدي مكرها، حتى ينطلق بي إلى أحد الصفين، أو أحد الفريقين، - عثمان يشك - فيحذفني بسيفه، ماذا يكون من شأني؟ قال: يبوء بإثمك وإثمه ويكون من أصحاب النار"۔ (أخرجه مسلم من أوجه عن عثمان الشحام: ۸۲۸)۔

(میں نے (اپنے والد) ابوبکرۃ ؓ کو حدیث بیان کرتے ہوئیسنا، انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''عنقریب فتنے برپا ہوں گے، سن لو! پھر (اور) فتنے برپا ہوں گے، ان (کے دوران) میں بیٹھا رہنے والا چلنے سے بہتر ہوگا اور چلنے والا ان کی طرف دوڑ کر جانے والا سے بہتر ہوگا۔ یادرکھو! جب وہ نازل ہوں گے یا واقع ہوں گےتو جس کسی کے پاس اونٹ ہوں وہ اپنے اونٹوں کے پاس چلا جائے، اور جس کے پاس زمیں ہو وہ زمیں پر چلا جائے،،۔حضرت ابوبکرۃ ؓ کہتے ہیں تو ایک شخص نے عرض کیا کہ اللہ کے رسول! اس کے بارے میں کیا خیال ہے جس کے پاس نہ اونٹ ہوں، نہ بکریاں اور نہ زمین،؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا'' وہ اپنی تلوار لے، اس کی دھار کو پتھر سے کوٹے، (کند کردے) اور پھر اگر بچ سکےتو بچ نکلے، اے اللہ! کیا میں نے حق پہنچا دیا؟ اے اللہ! کیا میں نے پہنچا دیا؟،، کہا: تو ایک شخص نے کہا: اللہ کے رسول! اگر مجھے مجبور کر دیا جائے، اور لے جا کر ایک صف میں یا ایک فریق کے ساتھ کھڑا کر دیا جائے اور کوئی آدمی مجھے اپنی تلوار کا نشانہ بنالے یا کوئی تیر آئے اور مجھے مار ڈالےتو؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: '' (اگر تم نے وار نہ کیا ہوا) تو وہ اپنے اور تمھارے گناہ سمیٹ کر لے جائیگا، اور جہنمی ہوگا)۔

امام طبری فرماتے ہیں:

یہ اور ان جیسی روایات جن میں فتن وملاحم کا تذکرہ ہے، بعض حضرات نے اسے عموم پر محمول کیا ہے، اور بعض نے بین المسلیمن قتال کی صورت میں شرکت سے اجتناب پر محمول کیا ہے، یعنی ان کے نزدیک جب بھی دو مسلم جماعتوں کے درمیان قتال پیش آئے تو دونوں جماعتوں سے مطلقاً اجتناب اور عدم اشتراک ضروری ہے، یہ رائے حضرت سعد، عبداللہ بن عمر، محمد بن مسلمہ، ابو بکرۃ، اور دیگر حضرات کی ہے''۔ (فتح الباری، شرح حدیث: ۷۰۸۱)۔

اس ہدایت پر صحابہ کرام نے بایں طور عمل فرمایا کہ دس ہزار صحابہ میں سے صرف ایک معمولی سی تعداد کے علاوہ کسی نے شرکت نہیں کی، اور یہ تعداد بھی دو تین درجن سے زائد نہیں، آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں، اور جن لوگوں نے شرکت کی وہ بھی اپنے اس عمل میں یا تو مجتہدِ مصیب تھے یا مجتہد مخطئ، اور دونوں صورتوں میں نبوی ہدایت کے مطابق وہ نفوسِ قدسیہ اجرِ الٰہی کے مستحق ہیں، کیونکہ ان کی یہ شرکت کسی اتباعِ نفس، اور مال وجاہ کی حرص میں نہیں تھی، اور نہ ہی دنیا کی ظاہری شان وشوکت، یا جاہ واقتدار کی خاطر مشاجرات میں شریک ہوئے تھے، بلکہ ان میں خالص اتباعِ حق وحمایت حق کا جذبہ تھا، وہ اپنے قول وعمل اور ارادوں میں مخلص تھے، قرآن کریم نے اسی لئے ان کو "**رحماء بینهم**" قرار دیا، اور آپ نے تو ان کی اسی صفت پر ضرب کاری لگائی ہے، اور انہیں امت کی نگاہوں میں قابلِ نفرت اور لائقِ طعن وتنقید بنانے کی ناکام سعی فرمائی ہے۔

علامہ ابن سیرین فرماتے ہیں

"**هاجت الفتنة وأصحاب رسول الله ﷺ عشرة آلاف، فما حضر فيها مأة بل لم يبلغوا ثلاثين**"۔

(ابن سیرین کہتے ہیں کہ فتنے کے زمانے میں دس ہزار صحابہ حیات تھے، لیکن ۱۰۰ صحابہ بلکہ تیس صحابہ بھی ان جنگوں میں شریک نہیں ہوئے)۔

(روى الإمام أحمد في العلل ۳/ ۱۸۲، ۴۷۸۷، والخلال في السنة ۲/ ۴۴۶، وابن شبة في أخبار المدينة: ۲۲۸۶ من طريق اسماعيل بن علية عن ابن سيرين)۔

علامہ ابن تیمیہ منہاج السنۃ میں ابن سیرین کی اس قول کی سند کو سب سے بہترین سند قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

هذا الإسناد من أصح إسناد على وجه الأرض"۔ (منهاج السنة: ۶/ ۲۳۶)۔

مولانا محترم غور فرمائیں کہ اگر سیدنا حضرت علیؓ کے ساتھ ہونے کا حکم نبوی ہے، اور یہ واضح نبوی ہدایت ہے تو پھر مشاجرات میں شریک نہ ہونے کا یہ حکم نبوی (جو ہم نے حدیث کی روشنی میں کیا ہے) کیا نبوی حکم نہیں ہے؟ اور وہ واضح ہدایت (جس کی جانب آپ نے اشارہ فرمایا

ہے) کس کتاب میں مذکور ہے؟ ذرا اس کی وضاحت فرمائیں؟ مولانا محترم جوشِ خطابت میں ایک موقع پر فرماتے ہیں کہ: میں ۹۹٪ فیصد بدریین وحدبیین صحابہ کا نمائندہ ہوں اور وہ سب حضرت علی کے ساتھ تھے اور ان کے موقف کے مؤید تھے سوال یہ ہے کہ تو پھر ابن سیرین اور دیگر تابعین ومؤرخین کی رائے باطل سمجھی جائے جنہوں نے یہ کہا کہ معدودے چند بدری صحابہ کے اور کوئی صفین میں شریک نہیں تھا''۔؟

علامہ ابن کثیر کہتے ہیں:

لم یکن فی الفریقین من الصحابۃ إلا القلیل" البدایۃ والنہایۃ:۱۱/۴۷۴)۔

قسط نمبر - ۱۵

سوال: ''کیا حضرات حسنین کو "سیدا شباب أهل الجنة" نہیں قرار دیا''؟۔

جواب: یہ روایت مختلف کتب حدیث میں موجود ہے، اور محدثین کے نزدیک صحیح اور متواتر درجہ کی ہے، کیونکہ تقریباً ۱۸ صحابہ سے مختلف طرق سے مروی ہے، اور اس سے حضرات حسنین ؓ کے مقام مرتبہ اور ان کے فضل وکمال پر روشنی پڑتی ہے، اس حدیث کا مفہوم بھی جمہور اہلِ سنت کے نزدیک واضح ہے، اور اس حدیث کے مطابق ان کا عمل بھی ہے، علامہ مبارکپوری شرح ترمذی میں اس کے مفہوم کی تعیین کرتے ہوئے کہتے ہیں:

قال المظهر: يعني هما أفضل من مات شابا في سبيل الله من أصحاب الجنة، ولم يرد به سن الشباب، لأنهما ماتا وقد كهلا بل ما يفعله الشباب من المروء ة، كما يقال: فلان فتى وإن كان شيخاً يشير إلى مروء ته وفتوته، أو أنهما سيدا أهل الجنة سوى الأنبياء والخلفاء الراشدين، وذلك لأن أهل الجنة كلهم في سن واحد، وهو الشباب وليس فيهم شيخ ولا كهل، قال الطيبي: ويمكن أن يراد هما الآن سيدا شباب من هم من أهل الجنة من شبان الزمان"۔

(تحفة الأحوذي، شرح حديث: ۳۷۶۸)۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرات حسنین ؓ کو اہل جنت پر سیادت وقیادت حاصل ہوگی، لیکن یہ سیادت عام نہیں ہوگی، بلکہ ایک خاص اور محدود سیادت ہوگی، نصوص قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے مطابق جن حضرات کے مقام ومرتبۂ بلند کا تذکرہ کردیا گیا ہے، اور ان کو حضرات حسنین ؓ سے بلند مقام کا حامل قرار دیا گیا ہے، ان پر یہ سیادت حاصل نہیں ہوگی، مثلا حضرات حسنین کے مقابلہ میں حضرات شیخین سیدنا حضرت ابوبکر ؓ وسیدنا حضرت عمر ؓ وسیدنا عثمان ؓ وسیدنا علی ؓ بلند مرتبہ کے حامل ہیں اور خلفائے راشدین کے مقابلہ میں حضرات انبیا کرام علیہم

السلام بلند مرتبہ کے حامل ہیں، لہذا ان حضرات پر ان کی سیادت وقیادت نہیں ہوگی، اور زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس سیادت وقیادت کا تعلق جنت سے ہے دنیا سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔

یہ اور قسم کی احادیث نبویہ جن سے حضرات حسنین واہلِ بیت اطہار کی فضیلت وبرتری کا علم ہوتا ہے، ان تمام احادیث وآثار کو حضرات محدثین عظام نے اہلِ بیت اطہار سے محبت وتعلق اور حسنِ عقیدت پر محمول کیا ہے، بلکہ اہلِ بیت اطہار کی محبت کو واجب قرار دیا ہے، ان کی ایذارسانی کو عظیم ترین گناہ قرار دیا ہے، اور اسی اظہار محبت وتعلق کی خاطر جمعہ کے خطبوں میں "سيدا شباب أهل الجنة" کی تذکیر اہلِ سنت کا شعار بن گئی ہے، اور ہر سنی مسلمان اپنی دعاؤں میں اہلِ بیت اطہار پر سلام کو قبولیتِ دعا کا ذریعہ سمجھتا ہے، اور ہر دعا کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے "وصلى الله وسلم على خير خلقه محمد وآله وصحبه أجمعين" اتنا ہی نہیں ان کی پنجگانہ نمازیں بھی آلِ بیت پر صلوۃ وسلام سے خالی نہیں ہوتیں۔

مولانا محترم یہ جمہور اہلِ سنت کے دلوں میں حبِ آل بیت کی محبت کا مظہر نہیں تو اور کیا ہے؟ اور کیا جمعہ کے خطبوں اور اہلِ سنت کی دعاؤں میں اہلِ بیت پر درود وسلام کے یہ زمزمے آپ کے کانوں سے نہیں ٹکرائے؟ نمازوں میں "صل على محمد وعلى آل محمد... اور بارك على محمد وعلى آل محمد" کے ورد کی تعلیم موجود نہیں، اہلِ بیت سے محبت وحسنِ عقیدت جمہور اہلِ سنت کا روزِ اول سے وطیرہ رہا ہے، ان سے غایت درجہ محبت، عقیدت اور قلبی وارفتگی کا حال یہ ہے تاریخ کے ہر موڑ پر اہلِ سنت کے قافلہ کا کوئی نہ کوئی سپاہی اہلِ بیت کی خاطر جان وتن کی قربانی پیش کرتا نظر آئیگا، اہلِ بیت کے ساتھ اہلِ سنت کی عشق ومحبت سے معمور تاریخ کی ورق گردانی کیجیئے، اس داستان عشق ووفا کا ہر ورق محبت وفدائیت کا ترجمان نظر آئیگا، اور اس والہانہ تعلق کی داستانیں دیوارچمن سے زندانوں تک کا سفر طے کرتی نظر آئیں گی، اور اس کا اعتراف تو خود آپ کو بھی ہے، آپ فرماتے ہیں

''امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ سب کتاب اللہ وعترتی کے تقاضوں پر عامل تھے، اس لئے انہوں نے اہلِ بیت کے لیے کوڑے کھائے، اور امام ابوحنیفہ کی اسی جرم میں جیل میں شہادت ہوئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور امام نسائی نے بھی اسی جرم محبت میں قید وبند کی

صعوبتیں برداشت کیں اور شہید ہوئے''۔(والفضل ما شهدت به الأعداء)۔

مولانا محترم!

اہلِ بیت اطہار کی محبت وعقیدت اہلِ ایمان کا شعار ہے، ان کے قلوب اہلِ بیت کی عظمتوں کے ثنا خواں ہیں، ان کا ہر بنِ مو ان کے بلندیٔ مقام کا معترف ہے، ان پر درود وسلام سے زبانیں تر رہتی ہیں، اور خود آپ نے بھی ایک خالص سنی گھرانے میں پرورش پائی ہے جہاں اہلِ بیت اطہار کی عظمت ومحبت اور ان سے عقیدت وتعلق کے مظاہر خوب مشاہدہ کئے ہوں گے، اب آخر محبت کا کون سا ایسا تقاضا باقی رہ گیا ہے جس کا مطالبہ آپ کر رہے ہیں؟ اور عشق ومحبت کی کون سی ایسی بازی ہے جو اہلِ سنت نے نہ جیت لی ہو؟ اہلِ سنت صحیح مفہوم میں اہلِ بیت کے عاشقِ حقیقی ہیں اور ان کو اس عشق ووارفتگی کی سند آپ سے نہیں چاہیے۔

رہا آپ کا یہ ارشاد کہ

''صریح احادیث کی روشنی میں حسن وحسین کو سیادت وقیادت کے مقام پر رکھنا امت پر فرض تھا فرض ہے اور فرض رہے گا''۔

مولانا محترم!

کیا اس سیادت سے آپ کی مراد سیادتِ دنیا ہے، اگر یہی مراد ہے تو عربی درجات کا ابتدائی طالب علم بھی سمجھ جائے گا کہ آپ حدیث کے مفہوم میں تحریفِ معنوی کے مرتکب ہوئے ہیں جہاں صاف یہ قید مذکور ہو "سیدا شباب أهل الجنة" بھلا اس سے دنیوی سیادت وقیادت کا مفہوم کیسے لیا جا سکتا ہے؟۔

ہاں جہاں سیادتِ دنیا پر استدلال ہوتا ہے وہ ملاحظہ فرمائیے

''حضرت ابو بکرۃ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خطاب جاری تھا کہ اسی دوران سیدنا حضرت حسن رضی اللہ عنہ تشریف لائے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ

"إن ابني هذا سيد، ولعل الله أن يصلح به بين فئتين عظيمتين من المسلمين"۔ (بخاری:۴۱۰۹)

مولانا محترم!

یہاں بھی نہایت واضح انداز میں زبانِ نبوت سے حضرت حسن کی سیادت وقیادت کا راز بیان فرمادیا گیا ہے کہ ان کی سیادت وقیادت کا راز حکومت وامارت نہیں، بلکہ "صلح بین المسلمین" میں مضمر ہے، اوراس سیادت وقیادت کو عامۂ اہلِ سنت نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا ہے، حضرات حسنینؓ کی اس صلح اور حضرت معاویہؓ کے حق میں بیعت کے فیصلہ کو بسروچشم تسلیم کیا ہے، اور حضرت حسنؓ نے اس صلح کے ذریعہ اپنی سیادت وقیادت کا حقیقی ثبوت پیش کیا ہے، اس صلح کے بعد اہلِ حق کے حلقوں میں مسرت وشادمانی کے شادیانے بجائے گئے، اس سال کو''عام الجماعۃ'' یعنی اتحاد واتفاق کا سال کہا گیا، اوراس صلح پر تمام موجود صحابہ کا اجماع ہوگیا، اس کے باوجود یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ حضرات حسنینؓ کے اس فیصلہ پر بھی چیں بہ جبیں ہیں، صحابہ کرام کا اجماع آپ کو پسند نہیں، ورنہ حضرت معاویہؓ اوران کے ہمنوا حضرت عمرو، وبسر بن اُرطاۃ وغیرہ (رضی اللہ عنہم) کے خلاف آپ کی اس محاذ آرائی کے کیا معنیٰ؟؟۔

مولانا محترم!

حضرات حسنینؓ کے فیصلہ کے خلاف آواز اٹھانا حسینیت نہیں، سبائیت ہے، رافضیت ہے، حضرت حسنؓ نے جب مصالحت کرلی تھی تواس وقت صلح کی مخالفت کس نے کی تھی؟ سیدنا حضرت حسنؓ کو''یاعار المسلمین'' کا طعنہ کس نے دیا تھا؟ اوروہ کون لوگ تھے جنہوں نے حضرت حسنؓ کو قتل کرنے کوشش کی تھی؟ اورکون تھے جنہوں نے ان کے گھوڑے کی زین تک نوچ ڈالی تھی؟ اورآج اس صلح کا مخالف کون ہے؟

مولانا محترم!

تاریخ کا مطالعہ غیر جانبداری سے کرئے، اشکالات رفع ہوجائیں گے، شک وارتیاب اور بدگمانیوں سے اوپر اٹھ کر حقیقت پسندی سے تحقیق کرئے، قاتلانِ عثمانؓ وقاتلانِ حسنینؓ سب کا سراغ مل جائیگا، اوراس سب کے درمیان حضرت معاویہؓ کی پاکیزگی آفتاب نصف النہار کی طرح روشن نظر آئیگی، آپ کو معلوم ہوگا عثمانؓ وعمارؓ اور حضرات حسنینؓ کے قاتل کئی نہیں ایک ہی گروہ اورایک ہی مقصد کے حامل لوگ ہیں جن کے پاس خونِ صحابہ کے الزام سے بچنے کا سوائے حب اہلِ بیت کے بلند بانگ جھوٹے دعووں اورشور وہنگامہ کے، اورکوئی راستہ نہ پہلے تھا اور نہ

آج ہے۔

اس جواب کے آخر میں مولانا محترم کی خدمت میں صحیحین کے بعد اب ترمذی شریف کے طلباء کا ایک سوال پیش کیا جاتا ہے اور امید ہے جواب عنایت فرمائیں گے، ترمذی شریف کی ایک روایت ہے

"عن علی عن النبی ﷺ قال: أبو بکر وعمر سیدا کھول أھل الجنة من الأولین والآخرین"۔ (ترمذی:۳٦٦٦)

مولانا محترم کا حدیث "سیدا شباب أھل الجنة" سے اگر حضرات حسنینؓ کے حق میں امارت وسیادتِ دنیوی پر استدلال ہے، تو سوال یہ ہے کہ "سیدا کھول أھل الجنة" یعنی ابوبکر وعمر کی امامت وامارت کے خلاف آپ نے محاذ آرائی پھر کیوں فرمائی؟ اور ان کی خلافت واولیت پر کبارِ صحابہ کے اتفاق کے باوجود شبہات کیوں اٹھائے گئے؟؟۔

قسط نمبر-۱۶

سوال: ''کیا معاویہ کے ایک گورنر بسر بن اَرطاۃ نے حضرت عبیداللہ بن عباسؓ کے دو ننھے بچوں کو ماں کی گود سے چھین کر نہیں مار دیا تھا، اور کیا ذہبی نے ان کے بارے میں سخت تبصرہ نہیں کیا''۔

جواب: مولانا محترم کا یہ سوال بھی کوئی نیا سوال نہیں ہے، اس قسم کے شکوک وشبہات روزِاول سے اہلِ تشیع کی جانب سے اٹھائے گئے ہیں، روافض واہلِ تشیع کی کوئی بھی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجئے وہاں صحابہ کرام پر اس قسم کے اتہامات ایک دو نہیں سیکڑوں کی تعداد میں مل جائیں گے، ہم یہ دعوی کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتے کہ مولانا محترم کے شبہات وسوالات کس شیعہ کی کتابوں سے ماٴخوذ ہیں، البتہ سوالات کا لب ولہجہ اسی کا ترجمان ہے، یہاں مولانا محترم کے شبہات کا ہدف حضرت معاویہؓ کے گورنر بسر بن اَرطاۃ ہیں، اوران پر روافض کا اتہام یہ ہے کہ انہوں نے حضرت عبیداللہ بن عباسؓ کے دو معصوم بچوں کو قتل کر دیا ہے۔

آیئے عقل وانصاف کی کسوٹی پر مولانا محترم کے عائد کردہ اتہام اور صحیح صورتحال کا جائزہ لیا جائے۔

بسر بن اَرطاۃ کون ہیں؟

بسر بن اَرطاۃ کے بارے میں اہلِ علم کی آراء مختلف ہیں بعض کے نزدیک وہ زمرۂ صحابہ میں شامل ہیں اور بعض ان کو صحابی نہیں تسلیم کرتے، ہم (مولانا محترم کے منہجِ تحقیق کے برخلاف) دونوں قسم کی آراء نقل کرتے ہیں۔

(۱) وہ زمرۂ صحابہ میں شامل نہیں۔ یہ رائے ائمۂ محدثین میں امام یحی بن معین، ابن عدی اور واقدی کی ہے، اہلِ مدینہ بھی یہی کہتے ہیں کہ ان کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سماع ثابت نہیں، امام ابن معین کی رائے ان کے حق میں بہتر نہیں تھی، وہ ان کو برا آدمی قرار دیتے ہیں۔

(۲) جبکہ اہلِ شام اور دیگر مایہ ناز محدثین ومؤرخین ان کو صحابہ میں شامل سمجھتے ہیں، یہ رائے امام مسلم، امام دارقطنی، ابن یونس، ابن حجر، علامہ ابنِ ماکولا، امام ابوحاتم، امام ترمذی، ابن حبان، علامہ بغوی، ابونعیم، عبدالباقی ابن اثیر، اور حافظ ذہبی وغیرہ کی ہے۔

صحیح بات یہ معلوم ہوتی ہے وہ صحابیِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، اسلئے کہ ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور مسند احمد وغیرہ میں ان کی دو حدیثیں مرفوعاً مروی ہیں، اور علامہ ابن حجرؒ نے "الإصابة فی معرفة الصحابة" کی قسم اول میں ان کا شمار کر کے ان کے صحابی ہونے کا موقف اختیار کیا ہے۔ ان کی بیان کردہ حدیث مع حوالہ پیش ہے۔

"عن جنادة بن أبی أمية قال: كنا مع بسر بن أرطاة فی البحر، فأتی بسارق يقال له:بختية، فقال سمعت رسول الله ﷺ يقول:لا تقطع الأيدی فی السفر، ولولا ذلك لقطعته"۔ (سنن نسائی:۴۹۷۹، سنن ابوداؤد:۴۴۰۸، مسند أحمد، بیہقی اور سنن دارمی وغیرہ میں مذکور ہے)۔

اس روایت پر اہل علم کے دونوں قسم کے اقوال ہیں البتہ علامہ البانی اور دیگر محدثین نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

(۲) دوسری روایت ملاحظہ ہو

"حدثنی يزيد مولی بسر بن أبی أرطاة عن بسر بن أبی أرطاة أن النبی ﷺ كان يدعو "اللهم أحسن عاقبتنا فی الأمور كلها، وأجرنا من خزی الدنيا وعذاب الآخرة"۔

یہ روایت امام أحمد کی مسند:۱۷۶۲۸، حاکم کی مستدرک علی الصحیحین ۵۹۱/۳، طبرانی کی المعجم الکبیر ۲/ ۳۳، ۱۱۶۹/، وغیرہ میں موجود ہے، حافظ ہیثمی نے مجمع الزوائد میں ۱۰/ ۱۷۸، میں اس روایت کے بارے میں لکھا ہے "رجال أحمد وأحد أسانيد الطبرانی ثقات"۔ مسند أحمد کے معلق شعیب أرناؤط کا مسند أحمد کی تعلیق میں یہ قول ہے: رجاله موثقون"۔

(نوٹ: واضح رہے کہ بعض کتابوں میں بسر بن أرطاة کے بجائے بسر بن ابی أرطاة بھی ذکر کیا گیا ہے، اور شیخ الإسلام ابن تیمیہ بسر بن ابی ارطاة ہی لکھتے ہیں)۔

حضرت بسر بن ارطاۃؓ حضرت معاویہ کے ہمنوا اور جنگ صفین میں ان کے طرفدار تھے، حضرت عثمانؓ سے ان کو شدید محبت اور تعلق تھا، نہایت فیاض اور سخی تھے، حضرت عثمانؓ کی شہادت کو مظلومانہ وفات قرار دیتے، حضرت عثمانؓ کا خوب تذکرہ فرماتے اور قاتلانِ عثمانؓ جن کی اکثریت حضرت علیؓ کی جماعت میں شامل ہوگئی تھی بلکہ حب علیؓ کا دعوی کرنے سے ان کو حضرت علیؓ کی صورت میں گویا ایک محفوظ پناہ گاہ مل گئی تھی، ان کے تعلق سے حضرت بسر بن اُرطاۃ کا رویہ سختی کا تھا، اور شاید حضرت عثمان کی تبیّں اور ہمدردی ہی کا نتیجہ ہے کہ روافض اور اہلِ تشیع کی جانب سے ان پر طرح طرح کے الزامات عائد کئے گئے ہیں، اور باطل روایات وضع کی گئیں اور ہر ممکن طریقہ سے ان کو متہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور ان ہی میں سے ایک الزام مولانا محترم کا بھی ہے، یہ الزام اصلا مولانا محترم کا نہیں بلکہ شیعوں کا ہے۔

حضرت بسرؓ اور عبید اللہ بن عباس کے بیٹوں کا قتل:

اس واقعہ کا سب سے قدیم مأخذ علامہ طبری کی تاریخ ہے، پہلے ہم تاریخ طبری سے یہ واقعہ نقل کریں گے، اور پھر اس کی تاریخی حیثیت کی تحقیق پیش کریں گے، امام طبری نے ۴۰ھ کے واقعات کے ضمن میں یہ واقعہ لکھا ہے، واقعہ کا تسلسل کافی طویل ہے ہم کافی اختصار سے طبری کے الفاظ نقل کرتے ہیں:

"فذكر عن زياد بن عبد الله البكائي عن عوانة.................ولقي بسر ثقل عبيد الله بن عباس وفيه ابنان له صغيران، فذبحهما، وقد قال بعض الناس إنه وجد ابني عبيد الله بن عباس عند رجل من بني كنانة من أهل البادية، فلما أراد قتلهما قال الكناني، علام تقتل هذين ولاذنب لهما! فإن كنت قاتلهما فاقتلني، قال: أفعل، فبدأ الكناني فقتله، ثم قتلهما، ثم رجع بسر إلى الشام"۔

(زیاد بن عبد اللہ البکائی عن عوانہ کی سند سے منقول ہے کہ۔۔۔۔۔۔ بسر عبید اللہ بن عباس کے کجاوہ سے جاملا اس کجاوہ میں ان گے دو ننھے بچے تھے، ان کو ذبح کر دیا، بعض لوگوں کا

کہنا ہے کہ عبید اللہ بن عباس کے دو بیٹے ایک دیہاتی کے پاس تھے اس کا تعلق بنی کنانہ سے تھا، جب بسر نے ان کو قتل کرنا چاہا تو کنانی نے کہا ان کو کس بنیاد پر قتل کر رہے ہو حالانکہ ان کا کوئی گناہ نہیں ہے، اگر تم ان کو مرنا چاہتے ہو تو پہلے مجھے مارو، اس نے کہا کہ ٹھیک ہے اور پہلے کنانی کو قتل کیا پھر ان دونوں کو قتل کیا، پھر بسر شام واپس پہنچا)۔

یہ روایت صحیح نہیں، کیونکہ اس کی سند ساقط ہے، اور اس میں بیشمار علل موجود ہیں، اور اہلِ ایمان دینی معاملات میں صحیح وحسن درجہ کی روایات ہی قبول کرتے ہیں اور خاص طور پر جب کوئی اہم معاملہ درپیش ہو یا صحابہ کرام پر تہمت کا معاملہ ہو، تو ایسی بے سروپا اور مجہول روایات پر اعتماد نہیں کرتے۔ اس روایت میں مندرجہ ذیل علل ہیں:

(۱) امام طبری اور زیاد بکائی کے درمیان انقطاع ہے، اور امام طبری اور زیاد بکائی کے درمیان تقریباً ۱۴۰ برس عمر کا فرق ہے۔

(۲) زیاد بن عبداللہ البکائی ابن اسحٰق کے علاوہ سے روایت کرنے میں ثقہ نہیں، ضعیف ہے۔

ابن مدینی کہتے ہیں "لا أروی عنه حديثاً"، امام نسائی کہتے ہیں، ليس بالقوی، ابوحاتم کہتے ہیں لا يحتج به، امام ترمذی کا قول ہے: کثیر المناکیر"۔

(سیر أعلام النبلاء: للذہبی: ۹/ ۵)

امام ابوزرعہ نے اسے صدوق تسلیم کیا ہے، امام شافعی نے بھی ابن اسحٰق سے روایت کرنے میں اس کی توثیق کی ہے۔

خلاصہ یہ کہ زیاد بکائی کی روایت اگر محمد بن اسحٰق کے واسطے سے تو اس وقت وہ ثقہ ہے، اور اس کے علاوہ میں اس کا بیان معتبر نہیں۔

(۳) اسی طرح ابوعوانہ بن الحکم الکلبی اور اس واقعہ کے راوی کے درمیان بھی انقطاع ہے، ابن عوانہ کی کسی صحابی سے ملاقات ثابت نہیں، وہ صرف تابعین سے نقل کرتے ہیں، لہٰذا عقلاً اس بات کا امکان ہی نہیں کہ ۴۰ھ کے واقعات وہ سند متصل سے بیان کرسکیں، تاریخ طبری کے دونوں محققین نے بھی اس روایت کو ذکر کرنے بعد لکھا ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے۔

(ملاحظہ ہو ضعیف تاریخ الطبری للشیخین محمد صبحی حسن حلاق، محمد طاہر البرزنجی ۸/ ۴۷۸ ط دار

ابن کثیر بیروت)۔

اور سب اہم بات یہ کہ اس واقعہ کو خود امام طبری نے ''ذُکر'' صیغۂ مجہول سے ذکر کر کے اس کے ضعف کی جانب اشارہ کیا ہے۔

اب اگر کوئی یہ اشکال کرے کہ تو پھر طبری میں یہ روایت کیوں ذکر کی گئی تو اس کا جواب یہ ہے کہ علامہ طبری جیسے دیگر علما کے پیش نظر صرف واقعات کو من وعن نقل کر دینا ہے، ان کے پیش نظر واقعات کی تاریخی وعلمی اصولوں کے مطابق تحقیق وتمحیص نہیں ہے، وہ محض ایک امانت دار ناقل ہیں، لہذا ان کے بیان کو پہلے تاریخی وعلمی اصولوں کے مطابق پرکھا جائیگا اور پھر اس کی صحت اور عدم صحت کا مرتبہ متعین ہوگا، خود امام طبری کا بیان ان کے مقدمہ تاریخ میں مذکور ہے فرماتے ہیں:

"فما یکن فی کتابی هذا من خبر ما ذکرناه عن بعض الماضین، مما یستنکره قارئه أو یستشنعه سامعه من أجل أنه لم یعرف له وجها فی الصحة، ولا معنی فی الحقیقة، فلیعلم أنه لم یؤت ذلك من قبلنا، وإنما أتی من قبل بعض ناقلیه إلینا، وإنما أدینا ذلك علی نحوما أدی إلینا"۔ (تاریخ الرسل والملوك از امام طبری:۸/۱ ط دار المعارف-القاهرة)۔

(ہماری کتاب میں ایامِ رفتہ کے لوگوں کے سلسلہ میں ہم نے بعض عجیب وغریب باتیں ذکر کی ہیں ان باتوں کو پڑھنے والے پسند نہیں کریں گے اور سننے والے اسے برا کہیں گے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ باتیں کسی اعتبار سے صحیح نہیں، اور نہ ان کا حقیقت سے کوئی واسطہ ہے، یہ ذہن میں رہے کہ یہ ہماری جانب سے نہیں ہے، بلکہ بعض ناقلین سے ہم نے نقل کر دیا ہے، ہم نے تو بطور امانت جیسا ہمیں معلوم ہوا ہم نے نقل کر دیا)۔

دیگر کتب جن میں اس واقعہ کا تذکرہ ہے:

تاریخ طبری کے علاوہ اس واقعہ کا دوسرا بڑا ماٴخذ ابن عبد البر کی کتاب ''الاستیعاب'' ہے۔

ابن عبد البر نے اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے، استیعاب کی عبارت ذیل میں درج کی جاتی ہے:

"ذکر الأنباری عن أبیه عن أحمد بن عبید، عن هشام بن محمد عن أبی

مخنف قال:لما توجه بسر بن أرطاةإلی الیمن أخبر عبید الله بن العباس وھو عامل لعلی علیھا، فھرب ودخل بسر الیمن، فأتی بابنی عبید الله بن العباس، وھما صغیران فذبحھما، فنال أمھما عائشة بنت عبد المدان من ذلك أمر عظیم"۔ (الاستیعاب فی معرفة الأصحاب لابن عبد البر:۱/۱۵۹ط دار الجیل-بیروت)۔

قبل اس کے ابن عبدالبرؒ کے بیان کردہ اس واقعہ کی تاریخی تحقیق ہوخود فن جرح وتعدیل کے نامور امام ابن الصلاح کا تبصرہ ابنِ عبدالبر کی کتاب ''الاستیعاب'' پر ملاحظہ ہو ابن الصلاح فرماتے ہیں:

"ومن أجلھا وأکثرھا فوائد کتاب الاستیعاب لابن عبد البر لولا ماشأنه به من إیراد ہ کثیراً مما شجر بین الصحابةوحکایاته عن الإخباریین لا المحدثین، وغالب علی الإخباریین الإکثار والتخلیط فیما یروونه"۔

(علوم الحدیث از ابن صلاح:۲۶۲)۔

(صحابہ کے بارے میں لکھی جانے والی کتابوں میں سب سے عمدہ اور کثیر الفوائد کتاب ''استیعاب،، ہے اگر انھوں نے اپنی کتاب کی علمی حیثیت کو مشاجرات صحابہ کے طویل تذکرہ سے مجروح نہ کردیا ہوتا، یہ تذکرے انہوں نے محدثین سے نہیں بلکہ مؤرخین سے لئے ہیں اور مؤرخین کے یہاں نقل میں حزم واحتیاط نہیں ہوتا بلکہ ان کی روایتوں میں طوالت، خلط ملط اور گڈ مڈ کا معاملہ رہتا ہے)۔

ابن عبدالبر کی ذکر کردہ روایت بھی طبری کی روایت کی طرح حد درجہ ضعف کا شکار ہے بلکہ ضعفاء وکذابین کا اس میں تسلسل ہے، اس میں بھی بیشمار علل موجود ہیں۔

(۱) اس میں ایک روای احمد بن عبید ہیں، ابن حجر نے اسے ''لین الحدیث کہا ہے

(۲) ھشام بن محمد بن السائب الکلبی ہے، دارقطنی وغیرہ نے اسے متروک کہا ہے، ابن عساکر کی رائے یہ ہے کہ ''وہ رافضی غیر ثقہ ہے'' ذہبی کہتے ہیں کہ ''ھشام لا یوثق بہ'' احمد بن حنبل کا فیصلہ ہیکہ ھشام اخباری اور قصہ گو ہے میں نہیں سمجھتا کہ کوئی اس سے بھی روایت اخذ کرتا ہوگا۔

(۳) ابومخنف لوط بن یحی ہے:

قال الذهبی "لوط بن يحی أبو مخنف أخباری تالف لا يوثق به، تركه ابوحاتم وغيره، دارقطنی کا قول ہے "ضعیف" ابن معین کہتے ہیں "ليس بشیء"۔ ابن عدی کا قول ہے: "شيعی محترق صاحب أخبارهم"۔

(۴) انقطاع ہے، ہر ایک کو معلوم ہے کہ ابومخنف اس واقعہ کے وقت موجود نہیں تھا، حسب صراحت امام ذہبی ۱۵۷ھ میں اس کا انتقال ہو۔

قارئین کرام!

اس روایت میں چار چار علتیں موجود ہیں، جبکہ اس میں صرف ایک علت ہی واقعہ کی تکذیب کے لیے کافی ہے، سوچئے جب چار علتیں جمع ہوں تو اس روایت کا کیا بنے گا۔

اسی لئے علامہ ابن کثیر ۴۰ھ کے واقعات اور بسر بن اُرطاۃ کے تعلق سے شیعوں کی فتنہ پردازی کا پردہ پاش کرتے ہوئے کہتے ہیں،

"وهذا الخبر مشهور عند أصحاب المغازی والسير وفی صحته عندی نظر"۔

(البداية والنهاية: ۷/۳۲۲)

اگر ان واقعات کو صحیح تسلیم کر بھی لیا جائے تو ان واقعات کو حضرت عثمان کی شہادت اور حضرت علیؓ وحضرت معاویہؓ کے مابین مشاجرات کے تناظر میں دیکھا جانا چاہئے، اگر حضرت بسر بن اُرطاۃ کی سخت گیری کے واقعات تاریخ کی کتابوں میں ملتے ہیں تو اسی قسم کی سخت گیری کے واقعات حضرت جاریہ بن قدامہ السعدیؓ کے سلسلہ میں بھی مذکور ہیں، اور حضرت جاریہؓ حضرت علیؓ کے ہمنواؤں میں ہیں۔

اب یہ کتنی ستم ظریفی ہے کہ حضرت بسر بن اُرطاۃ کے اقدامات کو تو ظالمانہ اقدامات کہا جائے اور ان کو ساقط العدالۃ اور متہم کرنے کی کوشش کی جائے، اور ان سے باز پرس نہ کرنے پر حضرت معاویہؓ پر طعن وتنقید کی جائے، مگر حضرت جاریہ بن قدامہؓ کا تذکرہ تک نہ ہو، اور ان کے اقدامات سے صرف نظر کر لیا جائے، جمہور اہلِ سنت کا ماننا ہے کہ حضرت بسرؓ بھی صحابی اور حضرت جاریہؓ بھی صحابی ہیں، اور اس حیثیت سے دونوں احترام وقدر کے مستحق ہیں، ان کے تعلق سے تاریخ کی

کتابوں میں مذکور تمام روایات کی علمی اور تاریخی اصول تنقید کے مطابق تحقیق کی جائے گی اور تاریخی اعتبار سے ثابت ہونے کے بعد ان میں تأویل کی جائے، ضعیف اور موضوع روایات کا سہارا لے کر ان کو اہلِ ارتداد میں شامل نہیں کیا جائیگا اور نہ ان پر طعن وتنقید کی اجازت ہوگی۔

حضرات صحابہ کرام اور جمہور اہلِ سنت کا موقف:

علامہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

واتفق أهل السنة على وجوب منع الطعن على أحد من الصحابة بسبب ما وقع لهم من ذلك، ولو عرف المحق منهم لأنهم لم يقاتلوا فى تلك الحروب إلا عن اجتهاد، وقد عفاالله تعالى عن المخطىء فى الاجتهاد، بل لو ثبت أنه يؤجر أجرا واحداوأن المصيب يؤجر أجرين"۔ (فتح الباری:۱۳/ ۳۴)

علامہ بدرالدین عینی فرماتے ہیں:

والحق الذى عليه أهل السنة الإمساك عما شجر بين الصحابة وحسن الظن بهم والتأويل لهم، وأنهم مجتهدون متأولون لم يقصدوا معصيةولا محض الدنيا، فمنهم المخطئى فى اجتهاده والمصيب، وقد رفع الله الحرج عن المجتهدا لمخطئى فى الفروع، وضعف أجر المصيب"۔ (عمدة القاری۱/ ۲۱۲)

امام ذہبی کا سخت تبصرہ:

رہا امام ذہبی کا حضرت بسرؓ کے تعلق سے سخت تبصرہ تو ہم نے عرض کیا ہے کہ ان واقعات میں اولاتو صداقت نہیں جیسا کہ ابن کثیرؒ وغیرہ کے حوالہ سے ہم نے بیان کیا، اور اگر ان کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو ان کو مشاجرات صحابہؓ کے تناظر میں دیکھنا چاہئے، اور مشاجرات صحابہ کے بارے میں سلف کی موقف کی ہم نے وضاحت کی ہے کہ ان واقعات کی تأویل کی جائے گی، اس لئے بعض محدثین مثلاً ذہبی وغیرہ نے جو ان کے بارے میں تبصرہ کیا ہے ان کے ان ہی اقدامات کے تناظر میں تبصرہ کیا ہے، اور وہ تبصرہ محل نظر اور شاذ ہے، اس لئے ایک درجن سے زائد محدثین ان کی

روایت بیان کرتے ہیں اوران روایات کی بنیاد پر ہی ان کوصحابی قرار دیتے ہیں، اس لئے ابن عبدالبراور دیگراہل علم نے جوموقف اختیار کیا ہے اسے قطعا درست نہیں قرار دیا جا سکتا۔

مولانا محترم کی عجیب وغریب منطق ہے کہ ان کو اپنے مخالفین پر جب طعن وتشنیع کا موقع ملتا ہے تو وہ ضعیف وموضوع روایات کو بھی تسلیم کر کے رائی کا پربت بنا دیتے ہیں، اور اگر ان کے فضل وکمال اورخوبی کے تذکرہ میں بخاری ومسلم کی روایات بھی مل جائیں تو نا قابلِ اعتبار ٹھہرتی ہیں، اوران میں دوراز کارتاویلات سے کام لیا جاتا ہے، آخر یہ کون سا تحقیقی منہج ہے؟ اوراس کے اصول وقواعد کیا ہیں؟ کیا مؤرخین ومحدثین کے وضع کردہ قواعدِ تحقیق اور معیارِنقد آپ کو تسلیم نہیں؟ اورکیا آپ کے منہجِ تحقیق کی کوئی معتبر بنیاد بھی ہے یا نہیں؟۔

قسط نمبر-۱۷

مولانا محترم کے خدشات اور سوالات

’’آپ (مفتی عتیق صاحب بستوی) کا صحابہ کرام کا دفاع قابلِ قدر ہے، لیکن آپ یہ مانتے ہیں کہ جو صحابی مرتد ہو گئے، وہ صحابی نہیں رہے، ظاہر ہے کہ وہ تو کافر ہو گئے، لیکن یہ آپ نے مان لیا کہ صحابی مرتد ہو گئے، اور یہ آخری درجہ کا جرم ہے، تو اس سے ادنی درجہ کے جرائم پھر کیوں نہیں ہو سکتے، فاسق کیوں نہیں ہو سکتے؟ ظالم کیوں نہیں ہو سکتے؟ جو آخری درجہ کا جرم کر سکتا ہے وہ اس سے کم درجہ کا جرم کیوں نہیں کر سکتا؟ کیا عادل قاذف ہو سکتا؟ کیا حضرت حسان کے جرم قذف میں کوڑے نہیں لگائے گئے تھے؟ کیا دیگر صحابہ سے کبائر نہیں ہوئے؟ نہ قرآن انہیں معصوم کہتا ہے نہ نبی، تو پھر آپ کے جمہور ان کی فضیلت کے لئے ایڑی چوٹی کا زور کیوں لگاتے ہیں؟۔

آپ کا کہنا ہے جو منافق تھے وہ صحابہ نہیں تھے آپ منافقوں کی کوئی لسٹ بنا سکتے ہیں؟ احد کے موقع پر تین سو بھگوڑے کون تھے؟ آپ کے پاس کوئی فہرست ہے؟ وہ مسلمان تھے مسلمان مرے، مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہوئے تو صحابہ کی تعریف ان پر منطبق ہو رہی ہے یا نہیں؟ کیا آپ کے پاس ان کے بارے میں علم غیب ہے؟ تبوک کے سفر میں کن صحابہ کو منافق کہا گیا؟ وہ سفر جہاد میں شرارتیں کر رہے تھے، قرآنی آیات میں ان کا بیان ہے، اُحادیث میں بغیر نام کے ان کے تذکرہ ہیں، کسی کسی کا نام بھی آ گیا ہے، ان کو صحابہ سے الگ کس کالونی میں بسایا گیا تھا؟ یا وہ عام صحابہ کے ساتھ رہتے تھے؟ نمازوں میں آتے تھے، حضور اپنی تقریر میں ان پر سخت نکیر فرماتے تھے، کیا وہ صحابہ نہیں تھے؟ کیا وہ مسلمان شمار نہیں ہوتے تھے؟ کیا حضور ان کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھا رہے تھے؟ کیا سردار منافقین مسلمانوں میں شمار نہیں ہوتا تھا؟‘‘۔

جواب: روافض کی جانب سے اہلِ سنت کے سادہ مزاج لوگوں میں یہ شبہ ہمیشہ پیدا کرنے

کوشش کی گئی ہے کہ صحابہ اور منافقین میں فرق نہیں کیا جا سکتا، اور نہ ہی اسے معلوم کرنے کا کوئی طریقہ ہے، اور بسا اوقات بعض کم تعلیم یافتہ طبقہ، اور مدرسوں کے ناپختہ مولوی حضرات بھی اس شبہ کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان سے جواب نہیں بن پڑتا، لیکن افسوس کہ مولانا محترم جیسی عبقری اور نادرۂ روزگار شخصیت بھی اس شبہ کا شکار ہو گئی، وہ شخص جو تہذیبِ مغرب اور افکارِ یورپ پر عقابی نگاہیں رکھتا تھا، وہ جو باطل تصورات وعقائد کی بخیہ دری کرتا تھا آج وہ شاہین بھی روافض کی زیرِ دام آ گیا، شیعوں کی زبان بولنے لگا، افسوس کہ مولانا محترم کے پیش کردہ سوالات اور خاص طور پر اس سوال کی ہر ہر سطر سے یہ نمایاں ہے اور اس کا انکار کوئی حق پرست انسان نہیں کر سکتا۔

عہد نبوی اور عہد راشدی میں کیا منافقین کی تعیین ہو گئی تھی؟

جی ہاں عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں منافقین کی مختلف قرائن سے تعیین ہو جاتی تھی۔

(۱) کبھی ان آیات وسورتوں سے جن میں منافقین کا تذکرہ ہوتا اور ان کی علامات وخصائص کا ذکر ہوتا، خاص طور قرآن کریم کی وہ مدنی سورتیں جن میں ان کا تفصیل سے تذکرہ ہے مثلا سورہ بقرہ، نساء، توبہ اور منافقون وغیرہ۔

(۲) اور کبھی ان احکامات کے ذریعہ جو خاص منافقین کے تعلق سے قرآن کریم میں مذکور ہیں، مثلا منافقین سے جہاد، ان سے احتیاط برتنا، اور ان کے جنازہ میں شریک نہ ہونا۔

(۳) اللہ تعالی نے قسم کھا کر اپنے حبیب سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان سے ضرور با خبر کرے گا قرآن کریم کا ارشاد ہے "ولو نشاء لأريناكهم فلعرفتهم بسيماهم ولتعرفنهم في لحن القول، والله يعلم أعمالكم"۔

علامہ طبری اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"فلتعرفنهم بعلاماتهم الظاهرة منهم في فحوى كلامهم، وظاهر أفعالهم، ثم إن الله تعالى ذكره عرفه إياهم"۔

(آپ ان کو ان کے طور وطریقے اور انداز گفتگو سے جان لیں گے، پھر اللہ تعالی نے آپ کو ان کے بارے میں باخبر کر دیا ہے)۔

(۴) اصحاب سیر نے تذکرہ کیا ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حذیفہ کو ان کی نام بتادئے تھے، اوراحادیث نبویہ سے بھی معلوم ہوتا ہے صحابہ کرام ان سے اچھی طرح واقف تھے، صحیح بخاری کی روایت ہے، اسرارِ نبوت کے امین حضرت حذیفہ فرماتے ہیں: ما بقی من أصحاب هذه الآية إلا ثلاثة ولا من المنافقين إلا أربعة. فقال: أعرابي إنكم أصحاب محمد ﷺ تخبرونا. فلا ندري فما بال هولاء الذين يبقرون بيوتنا، ويسرقون أعمالنا قال: أؤلئك الفساق، أجل، لم يبق منهم إلا أربعة، أحدهم شيخ كبير، لو شرب الماء لما وجد برده"۔ (بخاری:۵۸۴۶)

اسی طرح صحابہ کرام بھی قرآن میں ان کی بیان کردہ علامات وخصائص کی بنیاد پر ان کو پہچانتے تھے، مسلم شریف کی روایت ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نماز باجماعت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں"ولقد رأيتنا وما يتخلف منها إلا منافق معلوم النفاق۔ (مسلم ۶۵۴)

غزوہ تبوک میں حضرت کعب بن مالک پیچھے رہ گئے تھے، ان کا بیان ہے،:

كنت اذا خرجت في الناس بعد خروج رسول الله صلى الله عليه وسلم فطفت فيهم أحزنني أني لا أرى إلا رجلا مغموصاً عليه النفاق أو رجلاً ممن عذر الله من الضعفاء"۔ (بخاری ۴۴۱۸، مسلم ۲۷۶۹)

ابنِ سعد طبقات کبری میں قرآن کریم کی آیت لئن لم ينتهِ المنافقون والذين في قلوبهم مرض۔۔۔" (أحزاب:۶۰) کے تحت لکھتے ہیں:" عرف المنافقون بأعيانهم"۔

ہماری پیش کردہ اس بحث سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منافقین کا علم تھا اور صحابۂ کرام ان کی علامات وخصائص سے ان کو پہچانتے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال کے بعد حضرت حذیفہ ان کے واقفِ کار رہے، ان کو سب کے نام معلوم تھے، رہی غزوۂ احد اور دیگر موقعوں پر جنگوں سے استدلال کہ ان کی تعیین نہ تھی تو نہایت احمقانہ اعتراض واستدلال ہے، جس کا مقصد سوائے خدشات واتہامات اور حضرت معاویہؓ اور ان کے ہمنواؤں کو سب وشتم کرنے اور ان کو منافقین کے گروہ میں داخل کرنے کی سعی نامسعود کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

آپ نے دریافت کیا ہے کہ ''کیا منافقوں کی کوئی لسٹ بنا سکتے ہیں؟

مولانا محترم! ہمیں منافقین کی لسٹ بنانے کی چنداں ضرورت نہیں، کیا آپ کے علم میں نہیں کہ منافقین کی لسٹ خود سرورِ کائنات ؐ نے بنا کر حضرت حذیفہ کو دیدی تھی، صحابہ ؓ ان سے معلوم کر لیتے تھے، ان کے بعد تابعین کرام بھی دین وشریعت کے اخذ واستفادہ میں پہلے اس امر کی تحقیق کر لیتے تھے، اسی لئے آپ دیکھیں گے کہ پورے ذخیرۂ حدیث میں کسی روایت میں کوئی منافق نہیں ملے گا، البتہ اس امر کا افسوس ہے اور رہے گا کہ رافضیوں کی کوئی لسٹ موجود نہیں، اس لئے جمہور اہلِ سنت محققین ومحدثین کو یہاں کافی تحقیق وتدبر اور ذہنی کدوکاوش سے کام لینا پڑا ہے لیکن اس کی باوجود بھی سندِ حدیث میں کوئی نہ کوئی سبائی اور رافضی در ہی آتا ہے۔

علامہ مزیؒ اسی لئے فرماتے ہیں: کسی منافق سے کوئی روایت منقول نہیں''۔

"من الفوائد أنه لم يوجد قط رواية عمن لمز بالنفاق"۔

(التحبير شرح التحرير: ۴/ ۱۹۹۵)۔

آپ دریافت فرماتے ہیں کہ ''کیا منافقوں کا سردار مسلمان شمار نہیں ہوتا تھا؟۔

جناب عالی! جب اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں سورہ منافقون نازل کر دی، تو بھلا اسے کوئی مسلمان کیوں شمار کرے گا؟۔

(ملاحظہ فرمائیں بخاری تفسیر سورہ منافقون حدیث نمبر ۴۹۰۰)

یہ سعادت تو صرف آپ کے مقدر میں ہے کہ قرآن جس کو منافق کہے، اسے آپ مسلمان سمجھیں بلکہ زمرۂ صحابہ میں شامل کرانے کی کوشش کریں، اور جسے قرآن اور زبانِ نبوت مسلمان اور صحابی قرار دیں اسے آپ گروہ صحابہ سے نکال باہر کریں۔ سچ کہا ہے کسی نے ''ایں سعادت بزور بازو نیست''۔

مولانا محترم کے سوالات پڑھتے جایئے اور سر دھنتے جایئے، ان کی قوت استدلال پر عش عش کرئے، یوں محسوس ہوتا ہے کہ مولانا محترم اپنے سوالات واشکالات کو ابن رشد وارسطو پر بھی مشکل گردانتے ہوں گے، مولانا محترم کا ایک مشکل ترین سوال آپ بھی سنئے، حضور والا فرماتے ہیں ''کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان (منافق) کی نماز جنازہ نہیں پڑھتے تھے''۔

حضور والا! آیت شریفہ "ولا تصل علی أحد منهم" کے ربانی حکم کے نزول کے بعد بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی نماز جنازہ پڑھائی ہے کیا؟؟۔

حضور والا یہ تو ایسے ہی ہوا کہ آپ کہیں ''کیا حضرت عباسؓ سودی کاروبار نہ کرتے تھے،؟اور کیا حضرت حمزہؓ نے شراب کے نشہ میں مخمور ہوکر دوسرے کا اونٹ نہ ذبح کیا تھا؟ اور فلاں صحابی نے زنا کا، اور فلاں نے فلاں نے جرم کا ارتکاب نہ کیا تھا؟۔حضور والا اسے تحقیق نہیں کچھ اور کہتے ہوں گے۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا - کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

مولانا محترم فرماتے ہیں'' جو صحابی تھے منافق نہیں تھے۔

حضور والا جمہور اہلِ سنت کے مکتب کے طالب علم کو معلوم ہے کہ صحابی کی راجح تعریف یہ ہے "الصحابي من لقي النبي ﷺ مؤمنا به ومات على الإسلام ولو تخللت ردة في الأصح۔ (نزہۃ النظر)

ظاہر ہے کہ'' مؤمناً بہ'' کی قید منافقین کو خارج کرنے ہی کے لیے ہے، یقینا جو صحابی تھے وہ صحابی تھے، اور جو منافق تھے وہ منافق تھے، دونوں جداگانہ حقیقتوں کے نام ہیں، صحابی منافق نہیں تھے

حضور والا آپ نے اپنے سوالات اور تقریر و تحریر سے جو تأثر دینے کی کوشش کی ہے کہ عہد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس کے بعد مسلمان اور منافق باہم اس قدر شیر و شکر تھے کہ ان میں تفریق ممکن نہ تھی، کیا آپ کو قرآن کریم کا یہ ارشاد یاد نہ رہا کہ "وما كان الله ليذر المؤمنين على ما أنتم عليه حتى يميز الخبيث من الطيب"۔

ترجمہ: یقینا اللہ تعالی اہلِ ایمان کو اس حال میں جس میں تم (اہلِ ایمان) ہیں یہانتک کہ خبیث (منافق) کو طیب (مؤمن) سے الگ نہ کردے،،۔

مولانا محترم آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ اُحد سے تین سو لوگ بھاگ گئے تھے اور وہ منافق تھے، غور فرمایئے کہ جن کے درمیان سے وہ بھاگ گئے تھے کیا ان کو معلوم نہیں ہوگا وہ کون تھے؟؟۔ یقینا معلوم تھا اسی لئے حضرت ابن مسعود نے فرمایا تھا کہ''

ولقد رأيتنا وما يتخلف منها إلا منافق معلوم النفاق۔ (مسلم ۶۵۴)
(نماز میں وہی منافق پیچھے رہ جاتا تھا جس کا نفاق سب کو معلوم تھا)۔

مولانا محترم کا سوال ہے کہ کیا عادل قاذف ہوسکتا ہے؟

جی بالکل ہوسکتا ہے، شہادت اور روایت میں بہت امور میں فرق ہے، علامہ سیوطیؒ تدریب الراوی میں فرماتے ہیں:

"إذا شهد دون أربعة بالزنا حدوا للقذف، فى الأظهر ولا تقبل شهادتهم، قبل التوبة، وفى قبول روايتهم وجهان المشهور منهما القبول"۔

(تدريب الرواى:۵۰۶)

حضور والا آپ کو احساس بھی ہے کہ آپ سے کیسا شنیع جرم صادر ہوا؟ آپ نے شعوری یا لا شعوری طور پر درحقیقت اسلام کی بنیادوں پر تیشہ زنی کی ہے، آپ فرماتے ہیں کہ جمہور اہلِ سنت صحابہ کے دفاع میں ایڑی چوٹی کا زور کیوں لگاتے ہیں؟

جمہور اہل سنت صحابہ کرام کے دفاع میں اس لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں کہ وہی دینِ متین کے ناقل ہیں، اگر ان پر انگلی اٹھا دی گئی تو پورا دین مشکوک ہوجائے گا بلکہ دین اسلام کا قصرِ فلک بوس بھی زمین پر آرہے گا، پھر نہ قرآن کی حقانیت باقی رہیگی اور نہ اسلام کا قانونِ ابدی ودائمی محفوظ رہ پائے گا۔

اسی لئے امام ابوزرعہ رازی نے یہ فرمایا ہے کہ

"إذا رأيت الرجل ينتقص أحداً من أصحاب رسول الله ﷺ فاعلم أنه زنديق، لأن رسول الله حق، والقرآن حق، وإنما أدى إلينا هذا القرآن والسنن أصحاب رسول الله ﷺ وإنما يريدونا أن يجرحوا شهودنا ليبطلوا الكتاب والسنة والجرح بهم أولى فهم زنادقة"۔ (الكفاية فى علم الرواية:۴۹)

(جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ کسی صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین کررہا ہے تو جان لو کہ یہ زندیق ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے نزدیک حق ہیں، قرآن بھی حق ہے اور ہم تک یہ

قرآن اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کے ذریعہ پہنچی ہیں، یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہمارے گواہوں کو مجروح کردیں تاکہ قرآن وسنت کو باطل قرار دے سکیں، اور خود ان کو مجروح کرنا زیادہ ضروری ہے، کیونکہ یہ درحقیقت زندیق ہیں)۔

حضور والا! آپ نے صحابہ کرام کی مقدس نفوس کو تہمتوں کا نشانہ بنایا ہے، وہ قدسی صفات، ذوات طاہرہ جن کی ثنا خوانیاں قرآن نے کی ہیں، جن کی پاکیزگی و پاکیزہ نفسی کی گواہی قرآن نے دی ہے، آپ نے ان کے خلاف بھٹیاروں کی زبان استعمال کی ہے، کیا یہ علمی زبان ہے؟ اور تحقیق ونقد کی یہی زبان ہوتی ہے؟ آنجناب نے صحابہ کرام کا تذکرہ جس لب ولہجہ میں کیا ہے کوئی شریف انسان کسی سے جنگ وجدال کے موقع پر یہ زبان استعمال کرنا پسند نہیں کرے گا چہ جائیکہ کہ صحابہ جیسے اعلی وارفع نفوس کا تذکرہ ہو۔

مولانا محترم!

آپ کو منافقین کی تلاش ہے، اور اس کی خاطر آپ زمین وآسمان کے قلابے ملائے دے رہے ہیں، ہم اس سلسلہ میں ذرا سی آپ کی رہنمائی کئے دیتے ہیں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کی ایک روایت ملاحظہ کیجئے وہ منافقین کا پتہ دیتی ہے:

"أربع من كن فيه كان منافقاً خالصاً، ومن كانت له خصلة كانت فيه خصلة من النفاق حتى يدعها، إذا اؤتمن خان، وإذا حدث كذب، وإذا عاهد غدر، وإذا خاصم فجر"۔ (بخاری:۳۴)

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

مولانا محترم جس انداز میں آپ نے صحابہ کرام کے خلاف مقدمہ دائر کیا ہے، اور ان کے خلاف سوالات واتہامات کی ایک لسٹ تیار کی ہے، اور اس کی دلیل یہ ہے جب ان سے بڑے جرم کا صدور ہوسکتا ہے تو کم درجہ کا کیوں نہیں ہوسکتا؟ حضور والا یہ انداز سوال کیا آپ اپنے حق میں برداشت کرپائیں گے؟ کہ جب آپ توہینِ صحابہ جیسے شنیع جرم کے مرتکب ہوسکتے ہیں تو آپ زنا کیوں نہیں کرسکتے؟ آپ چوری کیوں نہیں کرسکتے؟ آپ یہ کیوں نہیں کرسکتے؟ آپ وہ کیوں نہیں کرسکتے؟۔

(لا حول ولا قوة إلا بالله العلی العظیم)

مولانا محترم یقینا آپ یہ لب ولہجہ پسند نہیں فرمائیں گے، اور ہم خود بھی نہ اپنے لئے اور نہ آپ کے لیے یہ لب ولہجہ اور یہ کلمات پسند کرتے ہیں خدارا غور فرمائے کہ یہ کلمات تحریر کرتے ہوئے آپ کے ہاتھوں میں ارتعاش کیوں نہیں پیدا ہوا؟ دل خوفِ خدا سے لرزہ کیوں نہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ خداوند قدوس نے توفیق سلب کر لی ہے، رجوع کرئے قابل التوب کی جانب، اور حسنِ خاتمہ کی دعا فرمائے، کیونکہ یہ سادات عظام اور شرفا کی زبان نہیں یہ خالص تبرائی لب ولہجہ ہے جس نے پتہ نہیں کیسے آپ تک رسائی حاصل کر لی۔

استاد محترم!

آپ ایک طویل مدت سے درس وتدریس اور تعلیم وتصنیف وتحقیق سے وابستہ ہیں، آپ کتاب الحدود وغیرہ کے ابواب کا مطالعہ کر کے ذرا بتائیں کہ آخر صحابہ میں زنا اور چوری کے کتنے واقعات پیش آئے، آپ کے انتقال کے وقت صحابہ کی تعداد ایک لاکھ چودہ ہزار تھی اور وہ صحابہ جن کی آپ ﷺ کی حیات میں شہادت یا موت ہوئی ان کی تعداد اس پر مستزاد۔

خطیب بغدادی امام ابوزرعہ رازی سے نقل کرتے ہیں کہ

"قضی رسول الله ﷺ عن مأة ألف وأربعة عشر ألفا من الصحابة ممن روی عنه وسمع منه"۔ (الجامع لأخلاق الروای ۲/۲۹۳)

آپ شاہ ولی اللہ کی مایہ ناز کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کا درس بھی دیتے ہیں، اس لئے اسرارِ شریعت پر بھی آپ کی نظر وسیع وعمیق ہوگی، کیا آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ ﷺ جس دین کی تعلیم وتبلیغ کے لیے مبعوث ہوئے وہ ایک ابدی، آفاقی عالمی اور لازوال دین ہے، اور ظاہر ہے کہ اس کی تفسیر وتوضیح بہتر انداز میں ہونی چاہئے تھی کہ دین میں کوئی غموض وابہام باقی نہ رہ جائے، اس لئے قرآن کریم میں حدود وتعزیرات کے احکام بتانے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ حدود وتعزیرات کے ہر باب کے بعض جرائم کی عملی ارتکاب اور تنفیذ حد کے مراحل سے گذار کر ان کی توضیح کی گئی ہے، کیونکہ اگر صرف احکام بیان کئے جاتے اور عملی تفسیر موجود نہ ہوتی تو نبوی اسوہ ناقص رہ جاتا، اسی لئے ہر باب کی ایک دو مثالیں پیش کر دیں لیکن اس کے ساتھ جب تک ان

صحابہ نے توبہ نہ کرلی چین کا سانس نہ لیا احادیث وسیر میں ان کے واقعات موجود ہیں، اور یہ خود الٰہی مشیت تھی، قرآن کریم اس کی جانب واضح انداز میں اشارہ کرتا ہے، غزوہ بدر پر تبصرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"ثم صرفكم عنكم ليبتليكم ولقد عفا عنكم"۔

یہ ابتلاء اور پھر معافی درحقیقت تکمیلِ دین وشریعت کی خاطر مشیت الٰہی کی جانب سے گویا ایک طے شدہ نظام تھا، حضرت ماعز اسلمیؓ کے حسن قبولِ توبہ کی سند نبوی پر ذرا نگاہِ کرم فرمائیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"لقد تاب توبة لو قسمت بين أمة لوسعتهم"۔ (مسلم: ۱۶۹۵)

صحابی اور عام مسلمان میں فرق:

حضور والا ہم ان کو معصوم نہیں کہتے، اور نہ ان کو نبی یا فرشتہ کہتے ہیں، ہاں عام انسانوں جیسا بھی ان کو نہیں سمجھتے، عام انسانوں میں اور صحابہ میں زمین وآسمان کا فرق ہے، یقینا ان سے گناہوں کا صدور ہوا لیکن کیا آپ کسی ایسے صحابی کا نام بتا سکتے ہیں جس سے گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہوا ہو، اور اس نے توبہ نہ کرلی ہو، اور اس کی توبہ قبول نہ ہوئی ہو۔

حضور والا صحابہ معصوم نہیں لیکن مغفور ضرور تھے، ان میں اور عام مسلمانوں میں بہت فرق ہے، اور اس فرق کا راز یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو گناہ کے ارتکاب کے بعد توبہ کی توفیق ضرور بخشی، جبکہ دیگر عام مسلمانوں کے حق میں یہ ضروری نہیں۔

صحابہ پر طعن درحقیقت دین پر طعن ہے:

امام ذہبی کتاب الکبائر کی ۷۰ ویں فصل "صحابہ کو گالی دینا" کے تحت لکھتے ہیں:

"فمن طعن فيهم أوسبهم فقد خرج من الدين ومرق من ملة المسلمين لأن الطعن لا يكون إلا عن اعتقاد مساويهم وإظهار الحق فيهم وانكار ما ذكره الله تعالىٰ فى كتابه من الثناء عليهم وبيان فضائلهم ومناقبهم وحبهم، ولأنهم أرضى الوسائل من المأثور والوسائط من المنقول والطعن فى الوسائل

طعن فی الأصل۔ الازدراء بالناقل ازدراء بالمنقول، هذا ظاهر لمن تدبره، وسلم من النفاق ومن الزندقة والالحاد فی عقیدته، انتهی۔

(لہذا جو شخص ان پاکیزہ ومقدس ہستیوں پر طعن کرے یا ان پر سب وشتم کرے، تو وہ دین سے خارج ہے، کیونکہ یہ طعن وتشنیع درحقیت ان کے تعلق سے ان کے فساد عقیدہ اور بد باطنی کا مظہر ہے، اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے بارے میں ان کا عقیدہ وتصور برا ہے، اور دل میں کینہ ہے، نیز اللہ تعالی نے اپنی کتاب میں جو کچھ ان کی تعریف میں فرمایا اور نبی کریم ﷺ نے جو ان کے فضائل ومناقب اور ان سے محبت رکھنے کے بارے میں جو ارشادات فرمائے ہیں اس سے اس کو انکار ہے، علاوہ ازیں جو کچھ ہم تک منتقل ہوا اس کا سب سے عمدہ وسیلہ وذریعہ صحابۂ کرام ہیں اور وسائل میں طعن وتشنیع درحقیقت اصل میں طعن وتشنیع کے مرادف ہے، اور ناقل کی تحقیر دراصل منقول کی تحقیر ہے، یہ بات ہر اس صاحب فہم کیلئے واضح ہے جو عقائد کے باب میں نفاق والحاد اور زندقہ سے محفوظ ہو)۔

اسی لئے امام الحرمین جوینی فرماتے ہیں:

قال إمام الحرمین "السبب فی عدم الفحص عن عدالتهم انهم حملة الشریعة فلو ثبت توقف فی روایتهم لانحصرت الشریعة علی عصره صلی الله علیه وسلم ولما استرسلت علی سائر الأعصار۔ (تدریب الراوی النوع التاسع والثلاثون)۔

(صحابہ کی عدالت کے بارے میں عدم تفحص کے حکم کا راز یہ ہے کہ وہ حاملین شریعت ہیں اگر ان کو بھی جرح وتنقید کے دائرے میں لایا جائے گا تو شریعت صرف آپ ﷺ کے عہد تک محصور ہو کر رہ جائیگی اور وہ ہر زمان ومکان کیلئے نہ ہوگی)۔

قسط نمبر-۱۸

مولانا محترم کا سوال: ''حُجر بن عدی جیسے صحابیٔ جلیل کو اپنے دورِ حکومت میں معاویہ نے اس لئے قتل کرا دیا کہ وہ حضرت علی کے ساتھ تھے، اور ان پر لعن طعن کے لیے تیار نہیں تھے، کیا اہلِ سنت نے یہ نہیں لکھا ہے کہ حضرت عائشہ نے ان کے حق میں سفارش بھیجی تھی معاویہ نے اس کو بھی نہیں سنا، اور ان کے خونِ ناحق سے زمین لالہ زار کردی، ''حب صحابہ'' کا حوالہ دے کر چیخنے والو، قتلِ صحابہ جائز ہے؟''۔

جواب: حجر بن عدی صحابیٔ جلیل؟:

وہی قاتل، وہی منصف، عدالت اس کی وہ شاہد
بہت سے فیصلوں میں اب طرفداری بھی ہوتی ہے

مولانا محترم کا منہجِ تحقیق نہایت نرالا، اور اصولِ تنقید بڑے عجیب وغریب ہیں، اہلِ علم کے نزدیک جن امور کو مسلمات وثوابت کی حیثیت حاصل ہے، مولانا محترم اسے بے حیثیت اور غیر معتبر قرار دیتے ہیں، اب مسئلہ یہ ہے کہ آخر قرآن وسنت، احادیثِ صحیحہ، ائمۂ فن حدیث کی آراء وتحقیقات ہی ان کے نقد وتحقیق کی بنیاد ہیں یا نہیں؟ اس کے بارے میں ہمیں کافی تردد ہے؟ اور اس تردد کی وجہ مولانا کے متضاد فیصلے ہیں، اب ہم یہ کہنے کی جسارت تو نہیں کر سکتے مولانا محترم کا مطالعہ ناقص ہے، اور ہم جو بیان ان کو سنائیں گے وہ کوئی نئی تحقیق ہوگی، اس لئے ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ اہلِ علم کے مابین رائج نقد وتحقیق کے یہ مسلمہ اصول جن پر امت صدیوں سے قائم ہے، اور اسی کے مطابق وہ اپنا تحقیقی سفر طے کر رہی ہے وہ مسلمات مولانا محترم کے یہاں معتبر نہیں ورنہ ان کے فیصلوں میں ایسا تضاد نہ ہوتا! شاید مولانا محترم کے اصولِ تحقیق خانہ زاد ہیں یا پھر شہنشاہِ اکبر کی طرح تحقیقی مسلمات ان کے تابعِ فرماں ہیں کہ جلالِ اکبری کو جوش آیا نہیں کہ منصوص احکام کے خلاف فیصلہ سنا دیا، اور سارے دربار میں آمنا وصدقنا کی صدائیں سنائی دینے

لگیں،اور وہاں گویا یہ سماں بن گیا کہ **"لا يسئل عما يفعل وهم يسألون"**۔

جمہور اہلِ سنت کے خلاف مرتب کردہ ''سوالنامہ'' میں مولانا محترم کی حیثیت بیک وقت ایک وکیل ومشیر، شاہد ودلیل اور قاضی ومنصف کی ہے، اور سوالنامہ گویا ان کی عدالت ہے، جسے چاہا صحابی کہا، جسے مرضی ہوئی جماعتِ صحابہ سے خارج کردیا، کبھی معیارِ صحابیت اور متفق علیہ جماعت صحابہ کو منافقین کی صف میں لا کھڑا کیا، یہاں نہ کسی دلیل وبرہان کی ضرورت ہے اور نہ قانونی اصول وضوابط کی یہاں بس معتبر وہی ہے زبانِ شیخ جسے معتبر کہے۔

مثلاً مولانا محترم کا فیصلہ ہے کہ ''حجر بن عدی صحابی ہیں، صحابی ہی نہیں صحابیٔ جلیل ہیں'' اور گذشتہ قسط میں آپ نے پڑھا ہوگا کہ مولانا محترم کے نزدیک بسر بن ارطاۃ صحابی نہیں ہیں''۔ اگر آپ دلیل کا مطالبہ کریں تو جواب شاید یہی ہو کہ مولانا محترم کا فیصلہ محتاجِ دلیل نہیں ہوتا۔

گویا مستند ہے میرا فرمایا ہوا

خیر ہم جمہور اہلِ سنت تو بہر حال دلائل ہی کی بنیاد پر کسی کو صحابی تسلیم کرتے ہیں اور بلا دلیل کسی کو دائرہ صحابہ سے باہر نہیں کرتے، چلئے ذرا جمہور کے ''کچے دھاگوں'' جیسے تحقیقی اصول کی روشنی میں حجر بن عدی کی صحابیت کا جائزہ لیتے ہیں۔

حجر بن عدی کیا صحابی ہیں؟

حجر بن عدی کو ائمۂ تاریخ وسیر نے صحابہ میں شمار نہیں کیا، اکثر محدثین وعلمائے جرح وتعدیل کا بھی یہی موقف ہے، اس رائے کے قائل کبار علماء میں امام ابن معین، امام بخاری، ابن ابی حاتم، خلیفہ بن خیاط اور ابن حیان وغیرہ جیسی مایہ ناز شخصیات ہیں، ان سب کا متفقہ فیصلہ ہے وہ تابعی ہیں، صحابی نہیں، اور ثبوتِ صحابیت کے لئے جن شرائط کی ضرورت ہے وہ ان کے تعلق سے موجود نہیں۔

البتہ حاکم نے مستدرک میں ابن سعد کا بیان نقل کیا ہے کہ حجر بن عدی اور ان کے بھائی ہانئ بن عدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے تھے ابن سعد کی الطبقات الکبری کا بیان حسب ذیل ہے:

"وذكر بعض رواة العلم أنه وفد إلى النبي ﷺ مع أخيه هانىء بن عدي

وشهد حجر القادسية"۔

علامہ ابن عبد البر، اور حاکم نے ابن سعد کے اس خیال کی بنیاد پر حجر بن عدی کو صحابہ میں شمار کیا ہے، ابن عبد البران کو" فضلائے صحابہ" میں شمار کرتے ہیں، حاکم کا رجحان بھی یہی ہے اسی لئے انہوں نے حجر بن عدی نہ صرف یہ کہ صحابی شمار کیا ہے بلکہ مستدرک میں "ذكر مناقب حجر بن عدی رضی اللہ عنہ وهو راهب أصحاب محمد ﷺ" کے عنوان سے ان کے فضائل بھی جمع کئے ہیں۔

راجح یہ ہے کہ وہ صحابی نہیں، بلکہ تابعی ہیں، حضرت علیؓ کی معیت میں جنگ صفین میں شریک رہے، نہایت عابد وزاہد اور شب زندہ دار بزرگ تھے۔ ذیل میں ہم ان کے صحابی نہ ہونے اور تابعی ہونے کی وجوہات ذکر کریں گے۔

صحبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معیار:

شرف صحابیت کے لئے مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک شرط کا پایا جانا ضروری ہے۔

(۱) خود صحابی کی زبان سے صراحت موجود ہو کہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا ہے، یا کوئی حدیث مرفوعا روایت کرتا ہو۔

(۲) کسی تابعی کا اس کے حق میں کوئی بیان موجود ہو کہ وہ زمرۂ صحابہ میں شامل ہے۔

(۳) اہلِ علم کے مابین اس کے صحابیت پر اجماع ہو یا کم از کم اکثریت کا اتفاق ہو کہ مخالفت کرنے والے کو شاذ کہا جا سکے۔

اگر ان میں سے کوئی صورت نہ پائی جائے تو بالجزم و بالیقین اسے صحابی نہیں کہا جا سکتا۔

حجر بن عدی کے سلسلہ میں ان تینوں امور میں سے کوئی ایک بات بھی ثابت نہیں، نہ ان کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لقاء وسماع ورؤیت ثابت ہے اور نہ کسی تابعی کا بیان، اور نہ ہی علما کا اجماع، یا اکثریت کا اتفاق۔

ابواحمد عسکریؒ فرماتے ہیں کہ: "اکثر المحدثین لا یصحون له صحبة "۔

ترجمہ: "اکثر محدثین ان کا صحابی ہونا صحیح نہیں قرار دیتے"۔

ظاہر ہے اس صورت میں ان کو زمرۂ تابعین ہی میں شمار کیا جائے گا، رہا ابنِ سعد، ابن عبد البراور حاکم کا بیان کہ وہ صحابی ہیں تو واضح رہے کہ خود ابن سعد کے یہاں حجر بن عدی کی صحابیت کو تسلیم کرنے میں تردد ہے، کیونکہ وہ طبقات میں ان کو ایک جگہ صحابی کہتے ہیں اور دوسری جگہ تابعی، اور ابن عبد البراور حاکم کے قول کو اکثر علماء کے خلاف ہونے کی وجہ سے شاذ تسلیم کیا جائے گا اور خصوصاً اس صورت میں کہ ان کے مقابلہ میں بہر حال ابن معین امام بخاری، ابو حاتم رازی، اور ابن حبان کا مقام بلند ہے اور ان کی رائے زیادہ معتبر ہے۔

ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ تلاش بسیار کے باوجود بھی ذخیرۂ حدیث میں حجر بن عدی کی کوئی حدیث صحیح مرفوع نہ مل سکی، ان کی سب مرویات صحابہ کرام مثلاً حضرت علیؓ حضرت عمارؓ اور عامر بن شرحبیل کے واسطہ سے ہیں، حاکم نے ان کی ایک روایت مرفوعاً ذکر کی ہے، لیکن اس پر سخت کلام ہے، اور اس کی سند میں انقطاع وغیرہ کے علاوہ دیگر علل ہیں، لہذا اس سے استدلال کرنا درست نہیں۔

قارئین کرام!

حجر بن عدی اور بسر بن ارطاۃؓ کے تعلق سے جو بیانات ہم نے سے پیش کئے اس کی روشنی میں ذرا آپ خود فیصلہ کریں کہ حضرت بسرؓ کی صحابیت پر علماء کی اکثریت متفق ہے، ان کی روایات بھی موجود ہیں، لقاء وسماع بھی ثابت ہے، لیکن چونکہ وہ حضرت معاویہؓ کے ہمنوا ہیں، حضرت عثمانؓ سے سچی محبت رکھتے ہیں اس لئے مولانا محترم کا فیصلہ ہے (انداز تخاطب سے یہی معلوم ہوتا ہے) وہ صحابی نہیں، اور دوسری طرف حجر بن عدی کے حق میں کوئی ثبوت موجود نہیں پھر بھی (چونکہ وہ حضرت علیؓ کے طرفدار ہیں) حضور والا کے نزدیک نہ صرف یہ کہ صحابی ہیں بلکہ صحابئ جلیل ہیں، کیا یہ انصاف ہے؟ کیا حب آلِ بیت کے یہی تقاضے ہیں؟ آخر مولانا محترم کے نزدیک صحابی کی حقیقی تعریف کیا ہے؟ اور کیا جمہور کے برخلاف آپ صحابی اسے تسلیم کرتے ہیں جو گروہ حضرت علیؓ میں شامل ہو؟ مولانا محترم سے درخواست ہے کہ وہ اس امر کی وضاحت فرمائیں کہ ان کے نزدیک صحابی سے مراد کیا ہے صحابئ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا صحابی حضرت علیؓ؟ اور منافق سے کیا مراد ہے دشمنِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دشمنِ اسلام یا دشمنِ حضرت علیؓ؟۔

حجر بن عدی کے قتل کا پس منظر:

حضرت حجر بن عدی کے قتل کے معاملہ میں مفتی تقی عثمانی صاحب نے کافی طویل اور سیر حاصل بحث کی ہے ہم حتی الامکان اختصار کے ساتھ مفتی صاحب کی پیش کردہ تحقیق کی تلخیص پیش کرتے ہیں۔

''حجر بن عدی شیعانِ علیؓ میں سے تھے، اور بلا شبہ تمام تاریخی روایات ان کی بزرگی اور عبادت وزہد پر متفق ہیں، لیکن ان کے ساتھ کچھ غالی اور فتنہ پرداز قسم کے روافض لگ گئے تھے جو ان کی بزرگی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر امت مسلمہ میں انتشار برپا کرنا چاہتے تھے۔

حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

"وقد التف علی حجر جماعات من شیعة علی، یتولون أمره ویشدون علی یده، ویسبون معاویة ویتبرأون منه"

ترجمہ ''حضرت حجرؒ کے اردگرد شیعانِ علیؓ کی ایک بڑی تعداد مجتمع ہوگئی تھی، حضرت حجر کے فیصلوں اور تمام حرکات وسکنات پر گویا ان کو کنٹرول حاصل ہوگیا تھا، حضرت معاویہؓ کو برا بھلا کہتی تھیں''

تقریباً یہی بات علامہ ابن خلدونؒ نے بھی لکھی ہے۔

غالباً ان ہی لوگوں کے کان بھرنے کی وجہ سے ان کی طبیعت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے اس قدر مکدر تھی کہ جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ سے صلح فرمائی تو یہ حضرت معاویہؓ کی امارت پر کسی طرح راضی نہیں تھے، تیسری صدی کے مشہور مؤرخ ابو حنیفہ الدینوریؒ اس صلح کا واقعہ لکھنے کے بعد لکھتے ہیں:

"قالوا: وکان أول من لقی الحسن بن علی رضی اللہ عنه فندمه علی ما صنع ودعاه الی رد الحرب حجر ابن عدی، فقال له یا ابن رسول اللہ لوددت انی مت قبل ما رأیت، أخرجتنا من العدل الی الجور فترکنا الحق الذی کنا علیه ودخلنا فی الباطل الذی نهرب منه، وأعطینا الدنیة من أنفسنا وقبلنا الخسیسة التی لم

تلق بنا"

"مورخین کا کہنا ہے کہ (صلح کے بعد) حضرت حسن بن علیؓ کی ملاقات سب سے پہلے حجر بن عدیؒ سے ہوئی، انہوں نے حضرت حسنؓ کو ان کے اس فعل پر شرم دلائی اور دعوت دی کہ حضرت معاویہؓ سے لڑائی دوبارہ شروع کر دیں، اور کہا کہ اے رسول اللہ کے بیٹے! کاش کہ میں یہ واقعہ دیکھنے سے پہلے مر جاتا، تم نے ہمیں انصاف سے نکال کر ظلم میں مبتلا کر دیا، ہم جس حق پر قائم تھے، ہم نے وہ چھوڑ دیا اور جس باطل سے بھاگ رہے تھے اس میں جا گھسے، ہم نے خود ذلت اختیار کر لی، اور اس پستی کو قبول کر لیا جو ہمارے لائق نہیں تھی۔

اس کے بعد الدینوریؒ لکھتے ہیں کہ حضرت حسنؓ کو حجر بن عدیؒ کی یہ بات ناگوار گزری اور انہوں نے جواب میں اس صلح کے فوائد سے آگاہ فرمایا، لیکن حجر بن عدیؒ راضی نہ ہوئے اور حضرت حسینؓ کے پاس پہنچے اور ان سے کہا کہ:

یا عبداللہ شریتم الذل بالعز وقبلتم القلیل وترکتم الکثیر اطعنا الیوم واعصنا الدھر، دع الحسن وما رأی من ھذا الصلح واجمع الیك شیعتك من أھل الکوفة وغیرھا والتی وصاحبی ھذہ المقدمة فلا یشعر ابن ھند الا ونحن نقدرہ بالسیوف

"اے ابوعبداللہ! تم نے عزت کے بدلے ذلت خرید لی، زیادہ کو چھوڑ کر کم کو قبول کر لیا، بس آج ہماری بات مان لو پھر عمر بھر نہ ماننا، حسنؓ کو ان کی صلح پر چھوڑ دو اور کوفہ وغیرہ کے باشندوں میں سے اپنے شیعہ (حامیوں) کو جمع کر لو اور یہ مقدمہ میرے اور میرے دوست کے سپرد کر دو، ہند کے بیٹے (حضرت معاویہؓ) کو ہمارا پتہ صرف اس وقت چلے گا جب ہم تلواروں سے اس کے خلاف جنگ کر رہے ہوں گے۔

لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بھی انہیں یہی جواب دیا کہ: انا قد بایعنا فلیس سبیل الی نقض بیعتنا۔ ہم بیعت کر چکے، عہد ہو چکا، اب اسے توڑنے کی کوئی سبیل نہیں۔

اس کے بعد یہ کوفہ میں مقیم ہو گئے تھے، کوفہ اس وقت فتنہ پرداز قسم کے غالی سبائیوں کا مرکز بنا ہوا تھا جو یوں تو حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ کی محبت ومودت کا دعویٰ کرتے تھے لیکن

ان کا اصل مقصد حضرت معاویہؓ کی حکومت کو ناکام بنانا تھا، حضرات حسنینؓ حضرت معاویہؓ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے اور اسے کسی قیمت پر توڑنے کے لیے تیار نہ تھے، دوسری طرف حضرت معاویہؓ کا معاملہ بھی یہ تھا کہ بقول علامہ ابوحنیفہ الدنیوریؒ

"لم یرحسن ولا الحسین طول حیاۃ معاویۃ منه سوء اً فی انفسهما ولا مکروها، ولا قطع عنهما شیئاً مما کان شرط لهما ولا تغیر لهما عن بر"

''حضرت معاویہ کی پوری زندگی میں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو ان کی طرف سے کوئی تکلیف اٹھانی نہیں پڑی، نہ انہوں نے ان کی طرف سے اپنے بارے میں کوئی بری بات دیکھی، حضرت معاویہؓ نے ان سے جو عہد کئے تھے ان میں سے کسی کی خلاف ورزی نہیں کی، اور کبھی ان کے ساتھ حسن سلوک کے طرز کو نہ بدلا۔

گویا اصل فریقین میں مکمل صلح ہو چکی تھی اور اب کسی کو کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی لیکن ان لوگوں کے دل میں بغض معاویہؓ کی آگ برابر سلگ رہی تھی، اور یہ ہر ایسے موقع کی تاک میں رہتے تھے، جس میں حضرت معاویہؓ اور ان کی حکومت کے خلاف کوئی شورش کھڑی کی جا سکے اور چونکہ حضرات حسنینؓ اس فتنہ پردازی میں ان کے ساتھ نہیں تھے، اس لئے یہ دل میں ان سے بھی خوش نہ تھے، یہاں تک ان میں سے ایک صاحب نے ایک موقع پر حضرت حسنؓ کو ان الفاظ میں خطاب کیا کہ:

"یا مذل المومنین"

اے مومنوں کو ذلیل کرنے والے

چنانچہ جب حضرت حسنؓ کا انتقال ہوا تو انہوں نے کوفہ سے حضرت حسینؓ کو خط لکھا کہ:

"فان من قبلنا من شیعتك متطلعة انفسهم الیك، لا یعدلون بك احدا وقد کانوا عرفوا رأی الحسن اخیك فی دفع الحرب، وعرفوك باللین لأ ولیائك والغلظة علی اعدائك، والشدة فی امر الله فان کنت تحب أن تطلب هذا الامر فاقدم الینا فقد وطنا انفسنا علی الموت معك"

''ہمارے یہاں جتنے آپ کے شیعہ (حامی) ہیں، ان سب کی نگاہیں آپ پر لگی ہوئی ہیں،

وہ آپ کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے، آپ کے بھائی حسنؓ نے جنگ کو دفع کرنے کی جو پالیسی اختیار کی تھی یہ لوگ اس سے واقف ہیں، اور یہ بھی جانتے ہیں کہ آپ اپنے دوستوں کے حق میں نرم اور دشمنوں کے لئے سخت ہیں، اور اللہ کے کام میں اٹل ہیں، لہٰذا اگر آپ اس معاملے (خلافت) کو طلب کرنا پسند کرتے ہوں تو ہمارے پاس جایئے، اس لئے کہ ہم لوگ آپ کے ساتھ مرنے کے لئے اپنی جانوں کو تیار کر چکے ہیں۔

لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ بدستور اپنے عہد پر قائم رہے، ان کو اس انتشار انگیزی سے روکا اور جواب میں حضرت معاویہؓ کے بارے میں یہاں تک لکھا کہ:

"فلن یحدث اللہ بہ حدثا و أنا حی"

''جب تک میں زندہ ہوں، اللہ ہرگز ان پر کوئی نئی آفت نہیں بھیجے گا''

اس قماش کے لوگ تھے جو کوفہ میں بقول حافظ ابن کثیرؒ حضرت حجر بن عدیؓ کے ارد گرد جمع ہو گئے تھے، حالات کے اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر اب زیر بحث واقعے کی طرف آیئے۔

حجر بن عدی کے قتل کی وجوہات:

واقعہ یہ ہے کہ حضرت حجر بن عدیؓ اور ان کے ساتھیوں کا معمول ہی یہ بن گیا تھا کہ بقول ابن جریرؒ و ابن اثیرؒ

"إنهم كانوا ينالون من عثمان ويطلقون فيه مقالة الجور وينتقدون على الأمراء ويسارعون فى الإنكار عليهم ويبالغون فى ذلك ويتولون شيعة على ويتشددون فى الدين"

''یہ لوگ حضرت عثمانؓ کی بدگوئی کرتے تھے، اور ان کے بارے میں ظالمانہ باتیں کرتے تھے، اور امراء پر نکتہ چینی کیا کرتے تھے، اور ان کی تردید کی تاک میں رہتے تھے، اور اس معاملے میں غلو کرتے تھے، اور شیعان علیؓ کی حمایت کرتے اور دین میں تشدد کرتے تھے۔''

ابن جریر طبریؒ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ کوفہ کے گورنر حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے اپنے خطبہ میں حسب معمول حضرت عثمان کے لئے رحم و مغفرت کی دعا فرمائی اور ان کے قاتلوں کے حق میں بددعا فرمائی۔ اس پر حجر بن عدیؓ کھڑے ہو گئے اور حضرت مغیرہؓ کے خلاف اس زور کا نعرہ لگایا

کہ مسجد کے اندر اور باہر سب لوگوں نے سنا اور حضرت مغیرہؓ سے خطاب کر کے کہا۔

"إنك لا تدری بمن تولع من هرمك ایها الانسان مولنا یا رزاقنا اعطیا تنا فانك قد حبستها عنا ولیس ذلك لك ولم یكن یطمع فی ذلك من كان قبلك وقد أصبحت مولعاً بذم امیر المؤمنین وتقریظ المجرمین۔

''اے انسان تجھے سٹھیا جانے کی وجہ سے یہ پتہ نہیں کہ تو کس سے عشق کا اظہار کر رہا ہے، ہماری تنخواہوں کی ادائیگی کا حکم جاری کر، کیونکہ وہ تو نے روک رکھی ہیں حالانکہ تجھے اس کا حق نہیں اور تجھ سے پہلے گورنروں نے کبھی ہماری تنخواہوں کی لالچ نہیں کی تھی اور تم امیر المؤمنین (حضرت علیؓ) کی مذمت اور مجرموں (حضرت عثمانؓ) کی مدح کرنے کے بڑے شوقین ہو۔''

لیکن اس پر حضرت مغیرہؓ نے انہیں کچھ نہیں کہا اور گھر تشریف لے گئے، لوگوں نے انہیں سمجھایا بھی کہ ایسے شخص کو تنبیہ کئے بغیر چھوڑنا مناسب نہیں، مگر حضرت مغیرہؓ نے فرمایا: میں خطاکار سے درگزر کرنے والا ہوں''۔

حضرت مغیرہؓ کے بعد زیاد کوفہ کا گورنر ہو گیا تو اس نے اپنے خطبہ میں حضرت عثمان کی تعریف کی اور ان کے قاتلوں پر لعنت بھیجی، اس پر حجر حسب معمول کھڑے ہو گئے اور جو باتیں حضرت مغیرہؓ سے کہی تھیں وہی زیاد سے بھی کہیں، زیاد نے اس وقت انہیں کچھ نہ کہا۔

اس کے بعد امام ابن سعد کا بیان ہے کہ زیاد نے حضرت حجر بن عدیؒ کو تنہائی میں بلا کر ان سے کہا کہ:

''اپنی زبان اپنے قابو میں رکھیے اور اپنے گھر کو اپنے لئے کافی سمجھئے، اور یہ میرا تخت حاضر ہے، یہ آپ کی نشست ہے، آپ کی تمام ضروریات میں پوری کروں گا، لہٰذا آپ اپنے معاملے میں مجھے مطمئن کر دیجئے اس لئے کہ آپ کی جلد بازی مجھے معلوم ہے، اے ابوعبدالرحمن! میں آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں، ان پست فطرت اور بے وقوف لوگوں سے بچئے، یہ لوگ کہیں آپ کو آپ کی رائے سے پھسلا نہ دیں، لہٰذا اب اگر آپ کی قدر میری نگاہ میں کم ہوئی یا میں نے آپ کے حقوق میں کوتاہی کی تو یہ میری طرف سے ہرگز نہیں ہوگی۔

حجر بن عدیؒ نے یہ بات سن کر کہا کہ ''میں سمجھ گیا'' پھر وہ اپنے گھر چلے گئے، وہاں ان سے

ان کے شیعہ دوست آ کر ملے اور پوچھا کہ ''امیر نے کیا کہا۔؟ انھوں نے پوری گفتگو بتلا دی اس پر شیعہ ساتھیوں نے کہا کہ ''اس نے آپ کی خیر خواہی کی بات نہیں کی۔

اس کے بعد حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ زیاد حضرت عمرو بن حریثؓ کو کوفہ میں اپنا نائب بنا کر بصرہ جانے لگا تو اس نے حجر بن عدیؓ کو بھی ساتھ لے جانے کا ارادہ کیا تاکہ پیچھے کوئی فتنہ کھڑا نہ ہو، لیکن حجر بن عدیؓ نے یہ عذر کر دیا کہ ''میں بیمار ہوں'' اس پر زیاد نے جل کر کہا کہ ''تم دین، قلب اور عقل ہر اعتبار سے بیمار ہو، خدا کی قسم! اگر تم نے کوئی ہنگامہ کیا تو میں تمہارے قتل کی کوشش کروں گا۔

امام ابن سعدؒ لکھتے ہیں کہ جب زیاد بصرہ چلا گیا تو شیعہ صاحبان حجر بن عدیؓ کے پاس بکثرت آتے جاتے تھے، اور ان سے کہتے تھے کہ:

انك شيخنا وأحق الناس بانكار هذا الامر ''

آپ ہمارے شیخ ہیں، اور تمام لوگوں سے زیادہ اس بات کے حقدار ہیں کہ اس معاملے (خلافت معاویہؓ) کا انکار کریں۔

حجر بن عدیؓ مسجد میں جاتے تو یہ لوگ بھی ان کے ساتھ جاتے، زیاد کے نائب حضرت عمرو بن حریثؓ نے جب یہ دیکھا تو ایک قاصد کے ذریعہ حجرؓ کو پیغام بھیجا کہ ''اے ابوعبدالرحمن! آپ تو امیر سے اپنے بارے میں عہد کر چکے ہیں، پھر یہ جماعت آپ کے ساتھ کیسی ہے؟ حجر نے جواب میں کہلا بھیجا کہ جن چیزوں میں تم مبتلا ہو، تم ان کا انکار کرتے ہو، پیچھے ہٹو، تمہاری خیریت اسی میں ہے۔

اس پر حضرت عمرو بن حریثؓ نے زیاد کو لکھا کہ ''اگر تم کوفہ کو بچانے کی ضرورت سمجھتے ہو تو جلدی آجاؤ۔

علامہ ابن جریر طبری وغیرہ فرماتے ہیں کہ زیاد کو یہ اطلاع ملی کہ حجر کے پاس شیعان علی جمع ہوتے ہیں اور حضرت معاویہؓ پر علی الاعلان لعنت کرتے اور ان سے برأت کا اظہار کرتے ہیں اور انھوں نے حضرت عمرو بن حریثؓ پر پتھر بھی برسائے ہیں۔

امام ابن سعد فرماتے ہیں کہ زیاد یہ اطلاع پا کر بڑی برق رفتاری سے کوفہ پہنچا، یہاں آ کر

اس نے مشہور صحابہ حضرت عدی بن حاتمؓ، حضرت جریر بن عبداللہ البجلیؓ اور حضرت خالد بن عرفطہ الازدی رضی اللہ عنہم اور کوفہ کے بعض دوسرے شرفاء کو بلایا اور ان سے کہا کہ آپ جا کر حجر بن عدیؒ کو اتمام حجت کے طور پر سمجھائیں کہ وہ اس جماعت سے باز رہیں اور جو باتیں وہ کہتے رہتے ہیں ان سے اپنی زبان قابو میں رکھیں۔ یہ حضرات ان کے پاس گئے مگر حجر بن عدیؒ نے نہ کسی سے بات کی، نہ کسی کی بات کا جواب دیا بلکہ ان کا ایک اونٹ گھر کے ایک کونے میں کھڑا تھا اس کی طرف اشارہ کر کے اپنے غلام سے کہا کہ ''لڑکے! اونٹ کو چارہ کھلاؤ۔ جب انہوں نے ان حضرات کی بات اس طرح سنی ان سنی کر دی تو حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''کیا تم دیوانے ہو؟ میں تم سے بات کر رہا ہوں، اور تم کہتے ہو کہ لڑکے! اونٹ کو چارہ کھلاؤ۔

اس کے بعد حضرت عدی بن حاتمؓ نے اپنے ساتھیوں سے خطاب کر کے فرمایا ''مجھے گمان بھی نہ تھا کہ یہ بے چارہ ضعف کے اس درجہ کو پہنچ گیا ہوگا جو میں دیکھ رہا ہوں۔

اس طرح یہ حضرات واپس آئے اور زیاد کے پاس آ کر حجر کی کی کچھ باتیں بتائیں اور کچھ چھپالیں، اور زیاد سے درخواست کی کہ ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرے، زیاد نے جواب میں کہا کہ ''اگر میں اب ان کے ساتھ نرمی کروں تو میں ابوسفیان کا بیٹا نہیں۔

علامہ ابن جریر طبریؒ وغیرہ نے حضرت عدی بن حاتمؓ کا یہ واقعہ نقل نہیں کیا اس کے بجائے انہوں نے لکھا ہے کہ زیاد نے کوفہ میں ایک خطبہ دیا غالباً یہ خطبہ حضرت عدی بن حاتمؓ کی واپسی کے بعد دیا ہوگا، بہرحال! ابن جریرؒ وغیرہ کے بیان کے مطابق زیاد جمعہ کے دن منبر پر پہنچا، اس وقت حجر بن عدیؒ اور ان کے ساتھی حلقہ بنائے بیٹھے تھے، زیاد نے کہا:

''حمد وصلوٰۃ کے بعد' یاد رکھو کہ ظلم اور بغاوت کا انجام بہت برا ہے، یہ لوگ (حجر اور ان کے ساتھی) جتھہ بنا کر بہت اترا گئے ہیں، انہوں نے مجھے اپنے حق میں بے ضرر پایا تو مجھ پر جری ہو گئے اور خدا کی قسم! اگر تم سیدھے نہ ہوئے تو میں تمہارا علاج اسی دوا سے کرادوں گا جو تمہارے لائق ہے، اور اگر میں کوفہ کی زمین کو حجر سے محفوظ نہ کر دوں اور اس کو آنے والوں کے لئے سامان عبرت نہ بنا دوں تو میں بھی کوئی چیز نہیں۔

حافظ ابن اثیر لکھتے ہیں کہ اس کے بعد زیاد نے خطبہ میں یہ بھی کہا کہ:

"إن من حق أمير المؤمنين يعني كذا و كذا"۔

تم پر امیر المؤمنین کے فلاں اور فلاں حقوق ہیں۔

اس پر حجر بن عدیؓ نے کنکریوں سے ایک مٹھی بھری اور زیاد پر دے ماری اور کہا کہ:

كذبت! عليك لعنة الله

تم پر خدا کی لعنت! تم نے جھوٹ کہا

اس پر زیادہ منبر سے اترا اور نماز پڑھی۔

بعض راویوں نے اس خطبہ میں یہ قصہ ذکر کیا ہے کہ جب زیاد کا خطبہ طویل ہو گیا اور نماز کو دیر ہونے لگی تو حجر بن عدیؓ نے مٹھی بھر کنکریاں زیاد پر دے ماریں تب زیاد منبر سے اترا اور نماز پڑھی۔

بہر کیف! اس خطبے میں حجر بن عدیؓ کے کنکریاں مارنے کی وجہ خواہ کچھ ہو، اسی خطبے کے بعد زیاد نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو حجر بن عدیؓ کے تمام حالات تفصیل کے ساتھ بھیجے، اس پر حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ "حجر کو گرفتار کر کے میرے پاس بھیج دو"۔

اس مرحلے پر زیاد نے اپنے امیر شرطہ (پولیس سپرنٹنڈنٹ) شداد بن الہیثم کو حکم دیا کہ حجر کو بلا کر لاؤ، حسین بن عبداللہ ہمدانی کہتے ہیں کہ جس وقت زیاد کا یہ حکم آیا، میں شداد کے پاس بیٹھا تھا۔ شداد نے مجھ سے کہا کہ تم جا کر حجرؓ کو بلا لاؤ، میں نے حجرؓ کے پاس جا کر کہا کہ "امیر آپ کو بلاتے ہیں، اس پر ان کے ساتھیوں نے کہا "یہ اس کے پاس نہیں جائیں گے" میں نے واپس آ کر شداد کو ان کا جواب سنایا تو اس نے میرے ساتھ کچھ اور آدمی بھیج دیئے ہم سب نے جا کر ان سے کہا کہ امیر کے پاس چلئے۔"

فسبونا وشتمونا

تو حجر کے ساتھیوں نے ہمیں گالیاں دیں اور برا بھلا کہا۔

جب صورت حال اس درجہ سنگین ہوگئی تو زیاد نے شرفاء کوفہ کو جمع کر کے ایک جوشیلی تقریر کی اور کہا کہ ہر شخص اپنے اپنے رشتہ داروں کو حجرؓ کی جماعت سے الگ کرنے کی کوشش کرے، اس

کے بعد پھر امیر شرطہ شداد بن الہیثم کو زیادہ آدمی دے کر بھیجا اور تاکید کی کہ اگر حجرؓ تمہارے بات مان لیں تو انہیں لے آؤ، ورنہ ان سے لڑائی کرو، چنانچہ شداد نے تیسری بار جا کر حجرؓ سے کہا کہ ''امیر کے پاس چلو'' مگر حجرؓ کے ساتھیوں نے جواب میں کہا کہ ''ہم پلک جھپکنے کی دیر کے لئے بھی امیر کا یہ حکم نہیں مانیں گے۔ اس پر فریقین میں لاٹھیوں اور پتھروں سے سخت لڑائی ہوئی، مگر زیاد کی پولیس حجرؓ اور ان کے ساتھیوں پر غالب نہ آسکی اور وہ گرفتار نہ ہوئے۔

اس کے بعد حجرؓ بن عدی جائے واردات سے فرار ہو کر کندہ کے محلے میں پہنچ گئے، کندہ میں سب حجر بن عدی کی قوم کے افراد آباد تھے، حجرؓ کے ساتھیوں نے یہاں کے تمام لوگوں کو جنگ پر آمادہ کیا، حجرؓ کا ایک ساتھی قیس بن فہدان ایک گدھے پر سوار ہو کر یہ اشعار پڑھتا پھر رہا تھا کہ

یا قوم حجر دافعوا وصاولوا

وعن اخیکم ساعة فقاتلوا

لایلفین منکم لحجر خاذل

أليس فیکم رامح ونابل

وفارس مسلئم وراجل

وضارب بالسیف لا یزائل

''اے حجر کی قوم! دفاع کرو اور آگے بڑھ کر حملے کرو، اور اسی وقت اپنے بھائی کی طرف سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ، تم میں کوئی شخص ایسا نہ ہو جو حجر کو بے یار و مددگار چھوڑ جائے، کیا تم میں کوئی تیر انداز اور نیزے کا دھنی نہیں؟ کیا تم میں کوئی جم کر بیٹھنے والا سوار نہیں؟ کیا تم میں کوئی ایسا تیغ زن نہیں جو ہٹنا نہ جانتا ہو؟

زیاد نے کوفہ کے مختلف باشندوں کو کندہ پر چڑھائی کرنے کے لئے بھیجا، یہاں بھی سخت جنگ ہوئی، مگر حجر بن عدیؓ فرار ہو کر روپوش ہو گئے، جب ان کو پکڑنے کی کوئی اور صورت نہ رہی تو زیاد نے محمد بن الاشعث کو بلا کر ان سے کہا کہ تم تین دن کے اندر حجرؓ کو تلاش کر کے پہنچا دو ورنہ تمہاری خیر نہیں، محمد بن الاشعث سواروں کی ایک جماعت کے ساتھ ان کو تلاش کرتے رہے بالآخر حجرؓ نے خود ہی اپنے آپ کو اس شرط پر حاضر ہونے کے لئے پیش کیا کہ ''مجھے امان دی جائے''

اور معاویہؓ کے پاس بھیج دیا جائے۔'' زیاد نے اس شرط کو منظور کرلیا تو حجرؓ اس کے پاس پہنچے، زیاد نے انہیں دیکھ کر کہا:

''مرحبا! ابوعبدالرحمن! تم جنگ کے زمانے میں تو جنگ کرتے ہی تھے، اس وقت بھی جنگ کرتے ہو جب سب لوگ صلح کر چکے ہیں۔

اس کے جواب میں حجرؓ نے کہا:

میں نے اطاعت نہیں چھوڑی، اور نہ جماعت سے علیحدگی اختیار کی ہے میں اب بھی اپنی بیعت پر قائم ہوں۔

زیاد نے کہا:

''حجر: افسوس ہے کہ تم ایک ہاتھ سے زخم لگاتے ہو اور دوسرے سے مرہم، تم یہ چاہتے ہو کہ جب اللہ نے تم پر قابو دیا تو ہم تم سے خوش ہو جائیں۔

حجرؓ نے کہا: ''کیا تم نے معاویہؓ کے پاس پہنچنے تک مجھے امن نہیں دیا؟

زیاد نے کہا: کیوں نہیں ہم اپنے عہد پر قائم ہیں''

یہ کہہ کر زیاد نے انہیں قید خانہ بھیج دیا اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ''اگر مجھے امانت کا خیال نہ ہوتا تو یہ شخص جان بچا کو یہاں سے نہ جا سکتا۔

اس طرح حجر بن عدیؓ تو گرفتار ہو گئے، لیکن ان کے دوسرے ساتھی جو اصل فتنے کا سبب تھے، بدستور روپوش رہے، اس کے بعد زیاد نے کوفہ کے چار سرداروں حضرت عمرو بن حریثؓ، حضرت خالد بن عرفطہؓ حضرت ابو بردہ بن ابی موسیٰؓ اور قیس بن الولید کو جمع کر کے ان سے کہا:

''اشهدوا علی حجر بما رأیتم منه''

''حجر کے بارے میں تم نے جو کچھ دیکھا ہے اس کی گواہی دو''

ان چاروں حضرات نے جو گواہی دی، اس کے الفاظ طبریؒ نے اس طرح نقل کئے ہیں

''حجر نے اپنے گرد بہت سے جتھے جمع کر لئے ہیں اور خلیفہ کو کھلم کھلا برا بھلا کہا ہے اور امیر المؤمنین کے خلاف جنگ کرنے کی دعوت دی ہے اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ خلافت کا آل ابی طالب کے علاوہ کوئی مستحق نہیں، انہوں نے ہنگامہ برپا کر کے امیر المؤمنین کے گورنر کو نکال باہر کیا

اور یہ ابوتراب ؓ (حضرت علیؓ) کو معذور سمجھتے اور ان پر رحمت بھیجتے ہیں اور ان کے دشمن ان سے جنگ کرنے والوں سے برأت کا اظہار کرتے ہیں، اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ ان کے ساتھیوں کے سرگروہ ہیں، اور ان ہی جیسی رائے رکھتے ہیں۔

پھر زیاد نے چاہا کہ ان چار حضرات کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اس گواہی میں شریک ہوں، چنانچہ اس نے ان حضرات کی گواہی لکھ کر لوگوں کو جمع کیا، ان کو یہ گواہی پڑھ کر سنائی اور لوگوں کو دعوت دی کہ جو لوگ اس گواہی میں شریک ہونا چاہیں وہ اپنا نام لکھوادیں، چنانچہ لوگوں نے نام لکھوانے شروع کئے، یہاں تک کہ ستر افراد نے اپنے نام لکھوائے لیکن زیاد نے کہا کہ ان میں سے صرف وہ نام باقی رکھے جائیں جو اپنی دینداری اور حسب ونسب کے اعتبار سے معروف ہوں، چنانچہ چوالیس نام لکھے گئے اور باقی ساقط کردیئے گئے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان چوالیس گواہوں میں سے بعض حضرات کا مختصر تعارف کرادیا جائے۔

جن چار گواہوں نے ابتدائً گواہی دی ان میں سب سے پہلے تو حضرت عمرو بن حریث رضی اللہ عنہ ہیں یہ باتفاق صحابہ میں سے ہیں۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ان کی عمر کیا تھی؟ بعض حضرات نے بارہ سال عمر بتائی ہے مگر ابوداؤد میں ان ہی کی ایک روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک مکان کی جگہ عطا فرمائی تھی۔ اس سے حافظ ابن حجرؒ نے استدلال کیا ہے کہ یہ کبار صحابہ میں سے ہیں، انہوں نے بعض احادیث براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں اور بعض حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ وغیرہ کبار صحابہؓ کے واسطے سے۔

دوسرے حضرت خالد بن عرفطہ رضی اللہ عنہ ہیں یہ بھی مشہور صحابی ہیں، انہوں نے بھی براہ راست آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی حدیثیں روایت کی ہیں، جنگ قادسیہ میں حضرت سعدؓ نے ان کو نائب سپہ سالار بنایا تھا، اور حضرت عمرؓ نے بذات خود حضرت سعد کو یہ حکم دیا تھا کہ ان کو امیر لشکر بنایا جائے، ایک مرتبہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ان کو کوفہ میں اپنے نائب بھی بنایا تھا۔

تیسری حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صاحبزادے حضرت ابو بردہؒ ہیں جو صحابی تو نہیں، مگر جلیل القدر تابعی ہیں، اعلیٰ درجے کے فقہاء میں سے ہیں، اور بے شمار احادیث کے راوی ہیں، حضرت علی کے شاگردوں میں سے ہیں، ان کے علاوہ بہت سے جلیل القدر صحابہ سے بکثرت احادیث روایت کی ہیں، کوفہ کے قاضی بھی رہے ہیں، امام ابن سعد فرماتے ہیں کہ کان ثقۃ کثیر الحدیث (ثقہ ہیں اور بہت سی احادیث کے راوی ہیں) امام عجلیؒ فرماتے ہیں: کوفی تابعی ثقۃ۔

چوتھے صاحب قیس بن الولید ہیں، ان کے حالات ہمیں کہیں نہ مل سکے، اس کے بعد جن ستر حضرات نے اپنے نام لکھوائے ان میں سے حضرت وائل ابن حجر حضرمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جو معروف صحابہ میں سے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سی احادیث روایت کی ہیں۔

حضرت معاویہؓ کو حجر بن عدیؒ اور ان کے ساتھیوں کی شورشوں کا پہلے ہی کافی علم ہو چکا تھا، اب ان کے پاس چوالیس قابل اعتماد گواہیاں ان کی باغیانہ سرگرمیوں پر پہنچ گئیں، ان گواہوں میں حضرت وائل بن حجرؓ، حضرت کثیر بن شہابؓ، حضرت عمرو بن حریثؓ اور حضرت خالد بن عرفطہؓ جیسے جلیل القدر صحابہ بھی تھے اور حضرت ابو بردہؒ، حضرت موسیٰ بن طلحہؒ اور حضرت اسحاق بن طلحہؒ جیسے فقہاء و محدثین اور صلحائے امت بھی، حجر بن عدیؒ اور ان کے ساتھیوں کے جرم بغاوت کو ثابت کرنے کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے؟ ان کا یہ جرم روز روشن کی طرح ثابت ہو گیا اور ظاہر ہے کہ بغاوت کی سزا ''موت'' ہے؟

لیکن حضرت معاویہؓ نے اپنے طبعی حلم اور بردباری کی بناء پر قتل کے فیصلے میں جلدی نہیں کی، چنانچہ زیاد کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا کہ:

''حجرؒ اور ان کے اصحاب کے بارے میں جو واقعات تم نے لکھے وہ میں نے سمجھ لئے، تم نے جو شہادتیں بھیجیں ان سے بھی باخبر ہو گیا، اب میں اس معاملے میں غور کر رہا ہوں، کبھی سوچتا ہوں کہ ان لوگوں کو قتل کروا دینا ہی بہتر ہے اور کبھی خیال آتا ہے کہ قتل کی بہ نسبت معاف کر دینا افضل ہے۔ والسلام

زیاد نے اس کے جواب میں لکھا کہ:

حجرؒ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں آپ کی رائے مجھے معلوم ہو گئی، مجھے تعجب ہے کہ

آپ کو اس معاملے میں تردد کیوں ہے، حالانکہ ان لوگوں کے خلاف ان حضرات نے گواہی دی ہے جو ان لوگوں کو زیادہ جانتے ہیں لہٰذا اگر آپ کو اس شہر (کوفہ) کی ضروت ہو تو آپ حجر اور ان ساتھیوں کو میرے پاس واپس نہ بھیجیں''۔

اس کے باجود حضرت معاویہؓ نے بعض صحابہؓ کے کہنے پر چھ افراد کو چھوڑ دیا اور آٹھ افراد کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ حجر بن عدیؓ کے بارے میں ایک صاحب نے سفارش کی تو حضرت معاویہؓ نے فرمایا:

''یہ تو ان سب لوگوں کے سردار ہیں اور اگر میں نے ان کو چھوڑ دیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ یہ پھر شہر میں فساد کریں گے''۔

چنانچہ حضرت معاویہؓ نے انہیں قتل کرنے کا حکم جاری فرمایا۔

حجر بن عدی کا قتل اور حضرت عائشہ کی سفارش:

حجر بن عدیؓ کے عبادت و زہد کی دور دور شہرت تھی، اس لئے جب حضرت عائشہؓ کو علم ہوا کہ حضرت معاویہؓ نے انہیں قتل کرنے کا حکم دیا ہے تو انہوں نے حضرت معاویہؓ کے نام پیغام بھیجا کہ حجر بن عدیؓ کو رہا کردیں، پیغام حضرت معاویہؓ کو اس وقت ملا جب وہ قتل کا حکم صادر فرما چکے تھے لیکن انہوں نے فوراً ایک قاصد جلادوں کے پاس روانہ کیا کہ ابھی حجر بن عدیؓ کو قتل نہ کریں، لیکن جب یہ قاصد پہنچا تو حجرؓ اور ان کے چھ ساتھی قتل کئے جا چکے تھے، حضرت عائشہ نے حضرت معاویہ سے فرمایا:

أین ذھب عنك حلمك یا معاویة حین قتلت حجراً

جب تم نے حجر اور ان کے ساتھیوں کو قتل کیا اس وقت تمہاری بردباری کہاں گئی تھی۔

امام ابن سعد اور امام ابن عبد البرؒ یہ الفاظ نقل کرتے ہیں۔

أین عزب عنك حلم أبی سفیان فی حجر وأصحابه

حجر اور ان کے اصحاب کے معاملے میں تم سے ابوسفیانؓ کی بردباری کہاں چلی گئی تھی۔

حضرت عائشہؓ نے جو الفاظ استعمال کئے ان میں ''بردباری'' کا لفظ صاف بتا رہا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے نزدیک بھی حضرت معاویہؓ کا یہ فعل ''انصاف'' یا شریعت کے خلاف نہیں تھا۔

زیادہ سے زیادہ وہ اسے بردباری کے خلاف سمجھتی تھیں۔

حضرت عائشہؓ کی رائے:

اور اب یہ بھی سن لیجئے کہ خود حضرت عائشہؓ کی ذاتی رائے حجر اور ان کے اصحاب کے بارے میں کیا تھی؟ امام ابن عبدالبرؒ نقل فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے مذکورہ جملے کے ساتھ یہ بھی فرمایا تھا کہ:

ألا حسبتهم فی السجون وعرضتهما للطاعون

تم نے ایسا کیوں نہ کیا کہ انہیں قید خانوں میں بند رکھتے اور انہیں طاعون کا نشانہ بننے دیتے۔

یہ تھا حضرت عائشہؓ کے نزدیک بردباری کا زیادہ سے زیادہ تقاضا جو حجرؓ اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ روا رکھی جا سکتی تھی۔ اگر حجر بن عدیؓ اور ان کے ساتھی ''حق گوئی'' ہی کے ''مجرم'' تھے تو اس ''حق گوئی'' کی کم سے کم سزا حضرت عائشہؓ کے نزدیک بھی ''قید خانہ'' ہی تھی۔

بہر کیف! حضرت عائشہؓ کے جواب میں حضرت معاویہؓ نے ''بردباری'' کا جواب یہ دیا کہ ام المؤمنین آپ جیسے حضرات مجھ سے دور ہیں اور میرے پاس کوئی ایسا بردبار آدمی نہیں رہا جو ایسے مشورے دے سکے اور جہاں تک قانونی بات تھی آپ نے فرمایا کہ:

"انما قتله الذین شهدوا علیه"

قتل تو انہوں نے کیا جنہوں نے ان کے خلاف گواہی دی

اور فرمایا کہ:

"فما أصنع؟ کتب إلی فیهم زیاد یشدد أمرهم ویذکر أنهم سیفتقون علی فتقا لا یرقع"

''میں کیا کرتا؟ زیادہ نے مجھے ان کے بارے میں لکھا تھا کہ ان کا معاملہ بڑا سنگین ہے، اور اگر انہیں چھوڑ دیا گیا تو یہ لوگ میری حکومت کے خلاف ایسی رخنہ اندازی کریں گے جسے بھرا نہ جا سکے گا''۔

اور آخر میں حضرت معاویہؓ نے یہاں تک فرمایا کہ:

"غدالی ولحجر موقف بین یدی اللہ عزوجل"
کل مجھے اور حجر دونوں کو اللہ عزوجل کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔

اور

فدعینی وحجراحتی نلقی عند ربنا
لہٰذا میرے اور حجر کے معاملے کو اس وقت تک کے لئے چھوڑ دیجئے جب ہم دونوں اپنے پروردگار سے ملیں۔

قتل کا سبب حضرت علیؓ پر لعن طعن نہیں بلکہ بغاوت ہے:

رہ گئی یہ بات کہ حجر بن عدیؒ کے قتل کے وقت جو بات پیش کی گئی وہ یہ تھی کہ اگر تم حضرت علیؓ پر لعنت کرو تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔ سو یہ بات علامہ طبریؒ نے ابومخنف کی روایت سے ذکر کی ہے اور روایۃً ودرایۃً قطعی طور پر جھوٹ ہے، سوچنے کی بات ہے کہ اگر یہ روات صحیح ہو تو حجر بن عدیؒ کی عبادت وزہد کا تو بہت شہرہ ہے، کیا انہیں شریعت کا یہ معمولی مسئلہ معلوم نہیں تھا کہ حضرت علیؓ پر لعنت کرنا ایک گناہ ہے اور اگر کسی شخص کو گناہ کے ارتکاب پر اس طرح مجبور کیا جائے کہ اس کی جان خطرے میں ہو تو اس وقت اس گناہ کا ارتکاب کر کے جان بچانا واجب ہو جاتا ہے، اور عزیمت کا تقاضا ہی اس وقت یہ ہوتا ہے کہ اس گناہ کا ارتکاب کر لیا جائے، اور پھر اس روایت سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ گویا حجر بن عدی سے سارا جھگڑا اس بات پر تھا کہ وہ حضرت علیؓ پر (معاذ اللہ) لعنت نہیں کرتے۔ حالانکہ ہم پیچھے تفصیل سے ثابت کر چکے ہیں کہ نہ حضرت معاویہؓ نے خود کبھی اس فعل شنیع کا ارتکاب کیا نہ اس معاملے میں ان کے کسی ساتھی نے۔ درحقیقت حجر بن عدیؒ کی گرفتاری کا اصل سبب ان کی بغاوت اور شورش انگیزی تھی، اور کیا حضرت معاویہؓ ایسے بچے تھے کہ ایک باغی ان کے سامنے اپنی جان بچانے کے لئے زبان سے حضرت علیؓ کو برا بھلا کہہ دے تو وہ مطمئن ہو جائیں خواہ اس کی ساری عمر حضرت علیؓ کے نام پر جتھے بنانے اور حکومت کے خلاف لوگوں کو برانگیختہ کرنے میں گزری ہو؟ کیا اب حضرت معاویہؓ کے مخالفین (معاذ اللہ) انہیں عقل، تدبر اور سیاسی بصیرت سے بھی بالکل خالی قرار دیں گے؟ ابومخنف جیسے شیعہ راویوں

نے حضرت علیؓ کی مذمت اوران پرسب وشتم کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے گویا حضرت معاویہؓ کے نزدیک دنیا کا سب سے اہم مسئلہ حضرت علیؓ کی مذمت تھی۔ اوران کی زندگی کا اہم ترین مشن یہی تھا کہ وہ لوگوں کو حضرت علیؓ کی مذمت پر آمادہ کریں۔ لیکن کیا حضرت معاویہؓ کی مجموعی زندگی ٗان کی سوانح ٗ ان کے فہم وتدبر حلم وبردباری کے بےشمار واقعات میں اس خسیس عمل کا کوئی ادنیٰ سراغ بھی ملتا ہے؟''۔

(مفتی صاحب کی پیش کردہ بحث ختم ہوئی، حوالوں کے لیے ان کی کتاب ''حضرت معاویہ اورتاریخی حقائق'' کا مطالعہ فرمائیں)

مولانا محترم!

یہ تو تھا قتل کا پس منظر اوراس کی وجوہات کا تذکرہ جو تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کیا گیا، حجر بن عدی کے قتل کا فیصلہ تنہا حضرت معاویہؓ نے نہیں سنایا، بلکہ صحابہ کی ایک بڑی تعداد نے ان کے خلاف گواہی دی ہے کہ باغیانہ سرگرمیوں میں ملوث ہیں، اوران کے ساتھ شورش پسندوں اورسبائیوں کی ایک بڑی تعداد ہے اورقوی اندیشہ ہے حضرت حسن کی صلح کے بعد خوشگوار ہونے والے حالات پھر سے نئی کروٹ نہ لے لیں، اور جنگ وجدال کا ایک لامتناہی سلسلہ پھر نہ شروع ہو جائے، اورظاہر ہے کہ جرمِ بغاوت کی سزا موت ہوتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

"من أتاكم وأمركم جميع على رجل واحد يريد أن يشق عصاكم أو يفرق جماعتكم فاقتلوه"۔ (مسلم: ۱۸۵۴، سنن ابو داؤد ۴۷۶۲ وسنن نسائی: ۴۰۲۲)

(اگر تم کسی ایک خلیفہ پر متفق ومتحد ہو اور کوئی شخص آ کر تمہارے اس اتحاد واتفاق کا شیرازہ منتشر کرنا چاہے، تمھارے درمیان پھوٹ ڈالنا چاہے تو اس کو قتل کردو)۔

وفى رواية إنه ستكون هنات وهنات فمن أراد أن يفرق أمر هذه الأمة وهى جميع فاضربوه بالسيف كائنا من كان"۔ (مسلم شریف ۱۸۵۴)

اورحضرت معاویہؓ نے ان کے قتل کی وجہ حضرت عائشہؓ سے یہی بیان فرمائی تھے کہ يا أم المؤمنين إنى وجدت قتل رجل فى صلاح الناس خيرا من استحيائه فى فسادهم"۔

حضرت معاویہؓ کا یہ عمل شریعت کے مطابق تھا اورشرعی اصول یعنی جرم کی تحقیق اور بینات

وشواہد کی موجودگی میں ان کے قتل کا حکم جاری کیا گیا، اس معاملہ میں حضرت معاویہؓ پر کسی قسم کا الزام عائد کرنا صحیح نہیں، حضرت حجر بن عدی اولاً تو صحابی نہیں تھے اور صحابی بھی ہوں تو بدرجہ اولی شریعت کا انطباق اور شرعی حدود وتعزیرات ان پر بھی نافذ ہوں گی اور اس کا اقرار تو خود مولانا محترم کو بھی ہے مولانا محترم فرماتے ہیں:

''اس لئے یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن کریم کے احکامات اور احادیث کے بیانات سب سے پہلے صحابہ پر منطبق ہوتے ہیں، ان پر ان کا نفاذ اولین ہوتا ہے، کوئی بھی انسان ہو، اس کے لیے پیمانۂ حق وباطل، خیر وشر، نفاق وایمان قرآن کے نصوص ہیں، احادیث کے بیانات ہیں، اگر کسی ایسی چیز کا ارتکاب کسی صحابی سے ہوا ہے جو موجبِ حد شرعی ہے تو اسے صحابی کہہ کر چھوڑ نہیں دیا گیا، بلکہ اس پر حد نافذ کی گئی، وہ چاہے بدری صحابی ہو یا غیر بدری۔

مسطح بن اثاثہ بدری صحابی تھے، حضرت عائشہؓ پر تہمت میں ملوث ہو گئے تھے ان پر کوڑے لگائے گئے، حضرت حسانؓ کو بھی اسی وجہ سے کوڑے لگائے گئے، بنی مخزوم کی ایک خاتون کا ہاتھ چوری میں کاٹا گیا، اور اسی موقع پر سفارش کرنے والے حضرت اسامہ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کے سامنے فرمایا کہ ''خدا کی قسم اگر فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی چوری کرتی تو میں اس کے ہاتھ کاٹ دیتا''۔

مولانا محترم!

جب آپ کو تسلیم ہے کہ کسی کا بھی جرم ہو (عامی ہو یا صحابی، اور خواہ بدری صحابی ہو یا غیر بدری) اگر موجبِ حد شرعی ہے تو اس پر حد نافذ ہوگی، صحابی کہہ کر اسے چھوڑا نہیں جائیگا، اور آپ نے خود نبوی مثالوں کی روشنی میں اس مسئلہ کی کافی وشافی وضاحت بھی فرمادی ہے تو حضرت حجر بن عدی کے قتل پر اس قدر شور وہنگامہ کیوں؟ اور اتنا واویلا کیوں مچایا جارہا ہے؟۔ آپ اطمینان رکھیں اور مزید اطمئنان کی خاطر تاریخ وسیر کا غیر جانبداری سے مطالعہ فرمائیں کہ حجر بن عدی کو بغاوت کے جرم میں شرعی نصوص کی روشنی میں سزائے موت دی گئی ہے، اور اگر اس پر بھی سکون نہیں ملتا تو حضرت معاویہؓ نے یہ معاملہ لقائے الٰہی تک کے لیے موقوف کر رکھا ہے، روزِ جزا وہاں ان سے مخاصمت فرمائیگا، تب تک کے لیے جمہور اہلِ سنت کو معاف رکھئے۔

قسط نمبر-۱۹

مولانا محترم کا سوال:

’’آپ (مفتی عتیق صاحب) تلبیس وتدلیس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ صحابہ کے یہ حالات اوران کے مشاجرات نہیں ذکر کرنے چاہئے۔

ناصحا! کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مشورہ دیں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سب حالات اپنی حدیث میں بیان فرمائے تھے، بخاری ومسلم کی کتاب الفتن والملاحم ـ ـ ـ ـ ـ وغیرہ پڑھیے، پھر بتایئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حدیثوں میں ان پیش آنے والے واقعات کی نشاندہی نہیں فرمادی تھی؟ اورامت کو یہ ہدایت نہیں دی تھی کہ اسے کیا موقف اختیار کرنا ہے؟

آپ کتب الفتن والملاحم کو احادیث کو ذخیرہ سے نکال کر دریا برد کر دیجئے، تاکہ آپ کی ناصبیت محفوظ رہے‘‘۔

جواب:

مولانا محترم،! یہ تلبیس وتدلیس نہیں، بلکہ حزم واحتیاط ہے، ’’سداًللذ ریعۃ‘‘ ان فتنوں میں پڑنے سے بچنے کے لئے یہ مشورہ دیا جاتا ہے۔

حضرت نعمان بن بشیر فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ

’’الحلال بین والحرام بین وبینهما شبهات لا یعلمها کثیر من الناس فمن اتقی المشبهات استبرء لدینه وعرضه ومن وقع فی الشبهات وقع فی الحرام کا لراعی یرعی حول الحمی، یوشك أن یواقعه ألا وإن لكل مَلِكٍ حمی ألا إن حمی الله فی أرضه محارمه (الحدیث بخاری رقم ۵۲ ومسلم ۱۵۹۹)۔

(حلال وحرام ظاہر وواضح ہیں لیکن حلال وحرام کے درمیان کچھ مشتبہ اشیاء ہیں جنھیں اکثر

لوگ نہیں جانتے، چنانچہ جو شخص ان مشتبہ اشیاء سے بچ گیا اس نے اپنے دین اور اپنی آخرت کو بچا لیا، اور جو کوئی ان مشتبہ امور میں مبتلا ہو گیا اس کی مثال اس چرواہے کی ہے جو شاہی چراگاہ کے اردگرد جانور چرائے، بہت ممکن ہے کہ چراگاہ کے اندر اس کا جانور گھس جائے، یاد رکھو ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے، خبردار رہو اللہ کی چراگاہ اس کی زمین میں اس کی حرام کردہ اشیاء ہیں)۔

مولانا محترم!

اس حدیث میں صاف ہدایت موجود ہے کہ آدمی کو احتیاط لازم پکڑنا چاہئے، اور محرمات کے قریب بھی نہ جانا چاہئے، اور جو جائے گا وہ پھنسے گا، آپ جیسا جلیل القدر عالم دین، بین الاقوامی شہرت کا مالک جب اس حدیث کو نظر انداز کر دیتا ہے، تو نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وہ شاہراہِ اسلام سے بھٹک جاتا ہے، امام ابوزرعہ رازی کا موقف ماقبل میں ہم نے پیش کیا ہے، انہوں نے صحابہ کرام کو سب وشتم کا نشانہ بنانے والوں کو زندیق کہا ہے، اور علامہ ذہبی تو ایسے شخص کو ملتِ اسلامیہ سے ہی خارج قرار کر دیتے ہیں۔

حضرت عباسؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار پوچھا کہ مجھے کوئی خاص دعا بتا دیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سلوا اللہ العافیۃ فی الدنیا والآخرۃ"۔

(رواہ الترمذی رقم الحدیث ۳۵۱۴ وقال حدیث حسن صحیح)

مولانا محترم!

عافیت کے مثل کوئی چیز نہیں، اس دنیا میں اللہ رب العزت کی سب کی بڑی نعمت عافیت ہے: "والعافیۃ لا یعادلھا شیء"۔

اب آپ نے مشاجرات صحابہ کا موضوع چھیڑا ہے، غور فرمایئے آپ کی حیثیت ایک استاذ اور مرشد کی ہے، مریدین کا ایک حلقہ ہے جو آپ کی آراء کو بہتر جانتا ہے، اور آپ کے موقف کا مؤید ہے، آپ کی دور رسی پر ان کو اعتماد ہے، اس حیثیت سے آپ کی ذمہ داری دو چند ہو جاتی ہے کہ کہیں آپ "فیضلون ویضلون کا مصداق تو نہیں بن رہے، کیونکہ خدانخواستہ اگر ایسا ہوا تو جو سادہ لوح طلباء اور مریدین آپ کے دام میں آجائیں گے، ان کا گناہ اور بوجھ قیامت تک کے لئے آپ کو اٹھانا پڑے گا۔ یہ ہمارا فیصلہ نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیصلہ ہے، مشہور حدیث ہے:

من سن فی الاسلام سنة سيئة كان عليه وزرها ووزر من عمل بها من بعده من غير أن ينقص من أوزارهم شيئی (مسلم حديث ۱۰۱۷)

(جس نے اسلام میں کوئی برا طریقہ رائج کیا تو اس کا گناہ اس کو ملے گا اور جو لوگ اس کا طریقہ پر چلیں گے ان کا گناہ بھی اس کو ملے گا اور اس طریقہ پر عمل کرنے والوں کے گناہ میں کوئی کمی نہیں کی جائی گی)

مولانا محترم!

مشاجرات صحابہ سے اجتناب برتنے کی ہدایت ونصیحت کسی مفتی ومولوی کی نہیں، بڑے بڑے ائمہ نے اس کی وصیت کی ہے، مجد دِاول حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے کسی نے مشاجرات صحابہ کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے فرمایا "تلك دماء كف الله يدی عنها وأنا أكره أن أغمس لسانی فيها"۔ (ابن سعد ۵/ ۳۹۴)

(اللہ تعالی میرے ہاتھ کو ان کے خون سے ملوث ہونے سے محفوظ رکھا ہے، تو اب میں اپنی زبان کو بھی اس میں ملوث کرنا ناپسند کرتا ہوں)۔

امام قرطبیؒ فرماتے ہیں:

"لا يجوز أن ينسب إلى أحد من الصحابة خطأ مقطوع به، إذ كانوا كلهم اجتهدوا فيما فعلوه وأرادوا الله عز وجل، وهم كلهم لنا أئمة، وقد تعبدنا بالكف عما شجر بينهم لحرمة الصحبة ولنهی النبی ﷺ عن سبهم وأن الله غفر لهم وأخبر بالرضا عنهم"۔ (تفسير القرطبی: ۱۶/ ۳۲۱)

(یہ جائز نہیں کہ کسی صحابی کی طرف قطعی طور پر خطا کی نسبت کی جائے، کیونکہ اس میں تمام صحابہ اپنے اعمال میں مجتہد ہیں اور ان میں کا مقصود اللہ کی رضا ہے، وہ سب ہمارے ائمہ اور مقتدا ہیں، ہم مشاجرات صحابہ کے باب میں صحابہ کے احترام کے قائل ہیں، اور اس وجہ سے بھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو برا بھلا کہنے سے منع فرمایا ہے، اور اللہ تعالی نے ان کی مغفرت فرمادی ہے اور ان سے اپنی رضامندی کا اعلان کردیا ہے)۔

امام اہل سنت امام احمد بن حنبل کتاب السنۃ ص ۷۷ فرماتے ہیں "ومن السنة ذكر

محاسن أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم كلهم أجمعين والكف عن الذى جرى بينهم فمن سب أصحاب رسول الله أو واحداً منهم فهو مبتدع رافضى، حبهم سنة، والدعاء لهم قربة، والاقتداء بهم وسيلة، والأخذ بآثارهم فضيلة"۔

(سنت یہ ہے کہ صحابہ کے محاسن بیان کئے جائیں اور مشاجرات کے بارے میں توقف اختیار کیا جائے، جس نے کسی بھی صحابی کو برا بھلا کہا وہ بدعتی اور رافضی ہی، ان کی محبت اہلِ سنت کی علامت ہے اوران گے دعا کرنا قرب خداوندی کا ذریعہ ہے، اوران کی اقتدا کرنا نجات کا ذریعہ ھی اوران کے آثار کی پیروی حصولِ فضیلت کی ضمانت ہے)۔

سبّ صحابہ کے مرتکبین کے خلاف امام احمدؒ وامام مالک کا فتوی:

امام احمد فرماتے ہیں

"لا يجوز لأحد أن يذكر شيئاً من مساويهم ولا يطعن على أحد منهم، فمن فعل ذلك فقد وجب على السلطان تأديبه وعقوبته، وليس له أن يعفو عنه، بل يعاقبه، ثم يستتيبه، فإن تاب قبل منه توبته، وإن لم يتب أعاد عليه العقوبة، وخلده فى الحبس حتى يتوب"۔

(کسی کیلئے یہ جائز نہیں صحابہ کی غلطیوں کا تذکرہ کرے اوران کو تنقید کا نشانہ بنائے، اگرکوئی ایسا کرتا ہے تو سلطان کیلئے لازم ہے کہ اس کو تنبیہ کرے، اوراس کو معاف نہ کرے، اور نہ درگزر سے کام لے، اس کو سزادے اوراس کو توبہ پر مجبور کرے، اگر توبہ کرلے تو اس کو چھوڑ دے، ورنہ مزید سزادے اوراسے زنداں کے حوالہ کردے، یہانتک کہ اسے توبہ کی توفیق مل جائے)۔

اورامام مالکؒ سب صحابہ کے مرتکب کے سلسلہ میں کہتے ہیں کہ مال فیء میں حصہ داری سے اسے محروم رکھا جائے گا۔

قال النووى فى شرحه بعد ذكر آية الحشر: "وبهذا احتج مالك فى أنه لا حق فى الفئى لمن سب الصحابة رضى الله عنهم لأن الله إنما جعله لمن جاء بعدهم ممن يستغفر لهم"۔

(امام نووی آیت حشر کی تشریح کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ اس آیت میں امام مالکؒ نے استدلال کیا ہے کہ مالِ فئی اس شخص کیلئے کوئی حصہ نہیں جو صحابہ کو برا بھلا کہتا ہو کیونکہ مالِ فئی کا مستحق اللہ تعالی نے اس کو قرار دیا ہے جو صحابہ کیلئے استغفار کرتا ہو)۔

(دیکھئے شرح نووی آیت سورہ حشر ربنا اغفرلنا...)۔

مولانا محترم!

آپ دوسروں کو بہت سی کتابیں پڑھنے کا مشورہ بار بار دیتے ہیں، برائے مہربانی آپ ہم شاگردوں کے مطالبہ پر صرف امام ابن تیمیہ کی کتاب ''منہاج السنۃ'' دیکھ لیں اِن شاءاللہ آپ کے سارے وساوس دور ہوجائیں گے، اوراگر صبح وشام تین تین تسبیح "ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا" کا ورد کریں تو اِن شاء اللہ آپ کے قلب پر جو زنگ لگ گیا ہے دور ہوجائے گا، اور آپ کو توبہ کی توفیق مل جائے گی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب الفتن وغیرہ کے ابواب میں جو احادیث بیان فرمائی ہیں ان کا مقصد کیا ہے؟؟ ظاہر ہیکہ امت کو ہدایت دینا مقصود ہے کہ ایسے حالات آئیں گے تو اس طرح کا موقف اختیار کرنا ہے، مولانا محترم ان ابواب کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ آپ ان کا انطباق (تحقیق وتنقید کے مسلمہ ومتعینہ اصولوں کو توڑ مروڑ کر) زبردستی حضرات صحابہ پر کریں، ان میں کسی کی تضلیل کریں اور کسی کی تکفیر وتفسیق کریں، احادیث نبوی کی یہ ہدایات اس لئے نہیں کہ اس فتنہ میں ملوث ہوجانا کارثواب اور وقت کا جہاد ہے، کتاب الفتن والملاحم کے پڑھنے اور پڑھانے کا مقصد کیا ہے؟ کتاب الفتن کے سب سے بڑے عالم حضرت حذیفہ بن الیمان کی زبانی سنئے، فرماتے ہیں:

"کان الناس یسألون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن الخیر و کنت أسألہ عن الشر مخافۃ أن یدرکنی"۔

(لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خیر کی باتیں معلوم کرتے تھے، اور میں شر کے بارے معلوم کرتا تھا اس اندیشہ کی تحت ان سے کہیں دوچار نہ ہوجاؤں)۔(بخاری ۷۰۸۴)

اور صحابہ وتابعین اور ائمہ دین کا ہمیشہ سے یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ فتن سے پناہ مانگتے تھے،

حضرت عمرؓ ایک موقع پر فرماتے ہیں:

"رضینا باللہ ربا وبالاسلام دینا وبمحمد رسولاً نعوذ باللہ من سوء الفتن"۔ (بخاری ۷۰۹۱)۔

(ہم اللہ کو رب، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رسول ماننے پر راضی ہیں، اور فتنوں سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں)۔

ابن ابی ملیکہ تابعی ہیں یہ دعا مانگتے تھے، اللھم إنا نعوذ بك أن نرجع علی أعقابنا أو نفتتن عن دیننا"۔ (بخاری ۷۰۴۸)۔

(اے اللہ ہم تیری پناہ مانگتے ہیں کہ ہم الٹے پاؤں پھر جائیں، اور یہ کہ اپنے دین کے بارے میں فتنے میں ملوث ہو جائیں)۔

حافظ ابن حجر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول "ویل للعرب من شر قد اقترب" کی شرح کرتے ہوئے ابن بطال سے نقل کیا ہے۔

وقد جاء عن أبي هريرة رفعه، ويل للعرب من شر قد اقترب، موتوا إن استطعتم قال: وهذا غاية فی التحذير من الفتن والخوض فيها حيث جعل الموت خيراً من مباشرتها۔

(حضرت ابوہریرہ سے مرفوعا مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "عرب کی ہلاکت ہو، اس فتنے سے جو بہت قریب آ گیا ہے، اگر تم (فتنے سے بچنے کیلئے) مر سکتے ہو، تو مر جاؤ، شارح فرماتے ہیں کہ فتنوں سے ڈرانے اور اس میں پڑنے اور غور وخوض کرنے سے روکنے کی بارے میں یہ انتہائی درجہ کی بات ہے کہ اس حدیث میں فتنے میں ملوث ہو جانے سے بہتر موت قرار دیا گیا ہے)۔

(دیکھیں فتح الباری جلد نمبر ۱۵/۱۵)۔

مولانا محترم!

فتن میں پڑنے اور اس میں غور وخوض کرنے سے اچھا یہ ہے کہ آدمی اللہ کو پیارا ہو جائے، لیکن آپ کا عمل تو "ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے، والا ہے۔

یہ ناصبی کیا ہوتا ہے؟؟ کیا جو لوگ صحابہ کا دفاع کرتے ہیں ان کو آپ کے نظریات کے مطابق ناصبی کہتے ہیں؟ آپ اپنی یہ تعریف کیا قرآن وسنت اور خلفائے راشدین اور صحابہ سے ثابت کر سکتے ہیں؟ کیوں کہ صحابی کی اصطلاح کے بارے میں تو آپ فرماتے ہیں ''دوسری طرف اہل سنت نے غلو میں یہ نقطۂ نظر وضع کر لیا کہ جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مرتبہ ایک سکنڈ کے لئے بھی دیدار کر لیا اور مسلمان ہونے کی حالت میں اس کی موت ہوئی اور مرتد و کافر ہو کر نہیں مرا، وہ صحابی ہے یہ تعریف نہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے، نہ خلفائے راشدین سے نہ کسی صحابی سے، بعد کے دور میں یہ تعریف وضع کر لی گئی''۔

جناب عالی!

ابن صلاح نے اپنے مقدمۂ علوم الحدیث میں ۶۵ علوم حدیث کا تعارف پیش کیا ہے، سیوطی نے تدریب الراوی میں ۲۷ علوم کا اضافہ کیا ہے، پھر حازمی نے ''مقدمہ عجالۂ نافعہ'' نے میں اِن علومِ حدیث کی تعداد ۱۰۰ تک پہنچادی، جناب عالی!۔آپ ان میں سے کتنی اصطلاح کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم خلفائے راشدین اور صحابہ سے ثابت کر سکتے ہیں؟ اور اگر نہیں کر سکتے تو مقدمہ ابن الصلاح کے پڑھنے پڑھانے میں ہمارا وقت کیوں ضائع کیا؟؟۔

آپ فرماتے ہیں ''علوم الحدیث لابن الصلاح ۳۰/ ۳۵ سال سے ندوہ میں پڑھا رہا ہوں، شیخ عبدالحق کے مقدمہ اصول حدیث، ابن حجر کی شرح نخبۃ الفکر، علامہ ابن الصلاح کی مقدمۂ علوم الحدیث میں نے پڑھائی بھی ہیں اور ان سب پر میری تعلیقات ہیں، مولانا عبدالحئ فرنگی محلی اور شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی تعلیقات میرے سامنے ہیں، انہوں نے اکثر جمہور سے اختلاف کیا ہے اور میں نے بھی جا بجا کیا ہے''۔

مقدمۂ عبدالحق پر آپ کی تعلیقات جو ندوہ سے صحافت ونشریات سے شائع ہوئی ہے ہمارے سامنے ہے، اس کا حال یہ ہے کہ شیخ عبدالحق کے مقدمہ میں صحیح کی تعریف یوں ہے:

''قال الصحیح ما ثبت بنقل عدل تام الضبط غیر معلل ولا شاذ۔

جناب عالی! اصول حدیث کا مبتدی طالب علم بھی جانتا ہے، کہ حدیث کے صحیح ہونے کے لئے سند کا متصل ہونا ضروری ہے، شیخ عبدالحق کے یہاں یہ شرط رہ گئی، اور آپ کو بھی ذرا تنبہ نہیں

ہوا، اور اس جگہ پر آپ کا حاشیہ غائب۔

یہ تو اردو شارحین کا سا حال ہو گیا کہ جہاں طلباء کو سمجھ میں آتا ہے وہاں خوب لکھتے ہیں، اور جہاں طلباء کو ضرورت پیش آتی ہے وہاں شارح بھی خاموش۔ مولانا محترم! غرورِ علم کسی بھی حال میں اور کسی بھی شخص کے لیے کوئی مناسب شیئے نہیں ہے، وہ بارہا بڑے بڑے عابدوں، زاہدوں، علماء واتقیاء کے لیے رسوا کن ثابت ہوا ہے۔

تنبیہ: اصول حدیث کی کسی بھی اصطلاح کو خلفائے راشدین سے چاہے نہ ثابت کیا جا سکے لیکن ''صحابی'' کی تعریف خلفائے راشدین سے ثابت کی جا سکتی ہے، حافظ ابن حجر نے مقدمہ "الإصابة فی معرفة الصحابة" ص ۱/ ۱۶۴ پر ایک روایت نقل کی ہے جس کے سارے رواۃ کو ثقہ قرار دیا ہے:

"عن نبيح العنزی، عن أبي سعيد الخدری قال: كنا عنده وهو متكیء، فذكرنا علياً ومعاوية، فتناول رجل معاوية، فاستوى أبو سعيد الخدری جالساً، ثم قال: كنا رفاقا مع رسول اللهﷺ فكنا فی رفقة أبي بكر، فنزلنا على أهل أبيات وفيهم رجل من أهل البادية، فقال: للمرأة الحامل أيسرك أن تلدی غلاماً؟ قال نعم، قال: إن أعطيتنی شاة ولدت غلاماً، فأعطته، فسجع لها أسجاعاً فذبحها وطبخها وجلسنا نأكل منها، ومعنا أبو بكر، فلما علم بالقصة، قام فتقيأ كل شیء أكل، قال: ثم رأيت ذلك البدوی أتی به عمر بن الخطاب، وقد هجا الأنصار، فقال لهم عمر: لولا أنه له صحبة من رسول اللهﷺ ما أدری ما نال فيها لكفيتموه ولكن له صحبة من رسول اللهﷺ"۔

یہاں چند منٹ کی ملاقات پر حضرت عمر نے اس بدوی کو صحابی قرار دیا ہے۔

بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ صحابی کی یہ تعریف آپ ﷺ سے ثابت ہے، حضرت ابوسعید خدری ؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "يأتی على الناس زمان يغزو فئام من الناس فيقال لهم فيكم من رأى رسول اللهﷺ فيقولون نعم فيفتح لهم، ثم يغزوا فئام من الناس فيقال لهم فيكم من رأى صحب رسول اللهﷺ۔

(مسلم: ۲۵۳۲)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگوں کی فوجیں جنگ کریں گی، ان سے کہا جائے گا کیا تم میں سے لوگ ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا ہو تو وہ کہیں گے ہاں تو انھیں فتح حاصل ہو جائے گی، پھر لوگوں کی فوجیں جنگ کریں گی تو ان سے پوچھا جائے گا کہ تم میں ایسے لوگ ہیں جنھوں نے صحابہ کو دیکھ ہو۔

وجہ استدلال: اس حدیث میں دیکھنے والے پر صحبت کا اطلاق کیا گیا ہے، تفصیل کے لیے دیکھیں (منھاج السنۃ، ۸/ ۲۰۵-۲۰۸)

مولانا محترم!

اخیر میں آپ ذرا ابوداؤد کے طلباء کا بھی ایک اشکال حل کرتے چلیں، سودی کاروبار کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنی جانب سے اور اپنے محبوب رسول کی جانب سے اعلان جنگ کی وعید سنائی ہے، اور سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "إن من أربى الربا الإستطالة فی عرض أخی المسلم بغیر حق" (ابوداؤد ۴۸۷۶ سکت عنہ ابوداؤد ثم المنذری)

آپ نے حضرات شیخین کے بارے میں جو ہرزہ سرائی کی ہے کیا وہ اس حدیث کی تحت نہیں آتی؟؟

یا "ثانی اثنین اذ ھما فی الغار" لقد کان فیمن کان قبلکم من الأمم ناس محدثون فان یك فی أمتی أحد فانه عمر۔ (بخاری ۳۶۸۹)۔

کے تقاضوں سے آپ نا آشنا ہیں؟ اور صرف "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" کے تقاضے کے تحت آپ سے یہ عمل شنیع سرزد ہوا ہے؟

یا یہ کہ آپ حضرات شیخین کو اس کا اہل نہیں سمجھتے؟۔

(قسط نمبر-۲۰)

علامات شیعیت اور مولانا محترم

قارئین کرام!

مولانا محترم نے ۲۹/سال پیشتر ایک مضمون مولانا عتیق الرحمن سنبھلی کی کتاب ''واقعۂ کربلا کا پس منظر'' کے مقدمہ پر ایک تبصرہ کے عنوان سے سپرد قلم کیا تھا، اور حال ہی میں مولانا محترم نے اسے با قاعدہ ایک رسالہ کی صورت میں ''شیعیت، سنیت، ناصبیت'' کے نام سے طبع کرایا ہے، اور یہ رسالہ خود مولانا محترم کے بقول ''اس موضوع پر شافی و کافی ہے اور مسلک حق کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے''۔

مولانا محترم نے مذکورہ رسالہ میں جو اہم نکات پیش کئے ہیں ان میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس میں شیعیت اور ناصبیت کے مابین حد فاصل قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور اس مغالطہ سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ فکر و عقیدہ کی اس جنگ میں صرف دو گروہ نہیں بلکہ درحقیت تین گروہ ہیں، ایک شیعہ، دوسرا اہلِ سنت اور تیسرا ناصبی۔

اس کے بعد مولانا محترم نے سب کی علامات ذکر کی ہیں، تا کہ امتِ مسلمہ ان علامات کی روشنی میں شیعیت اور اہلِ سنت، یا ناصبیت اور اہلِ سنت کے مابین فرق کر سکے، اور اہلِ سنت کے درمیان چھپے ناصبی، یا چھپے شیعوں کے چہروں کو شناخت کرنا آسان ہو سکے۔ مولانا محترم نے شیعیت کی جن علامات کا تذکرہ کیا ہے ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں:

''علاماتِ شیعیت

(۱) شیخین حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما سے نفرت۔

(۲) سبّ و تکفیر صحابہ۔

(۳) عقیدۂ تحریف قرآن، ائمہ اثنا عشریہ کی عصمت پر ایمان۔
(۴) بغیر خف کے پیروں پر مسح۔

ان میں سے کسی بات کا، اگر کوئی شخص مرتکب ہے، تو وہ شیعی ہے، جس کا اہلِ سنت سے کوئی تعلق نہیں''۔

مولانا محترم کے سوالات، اشکالات اور اتہامات کا جائزہ ہم نے اب تک جمہور اہلِ سنت کے قائم کردہ معیارِ نقد و تحقیق کے مطابق پیش کیا ہے، اور مولانا کی آراء کا بطلان کتاب وسنت اور محدثین کے منہجِ نقد کی روشنی میں پیش کیا ہے، لیکن جا بجا یہ خیال آیا کہ مولانا محترم کو صدیوں سے تسلیم شدہ قواعد اور مصطلحات کا اعتراف نہیں، بلکہ اسے وہ تہ و بالا کر ڈالنے پر مصر ہیں، اور ان حقیقتوں کو اہلِ سنت کا غلو قرار دیتے ہیں مثلاً صحابی کی تعریف جو قرنِ اول سے اب تک ایک معروف و معتبر حقیقت رہی ہے، مولانا محترم اس کی حقانیت کو تسلیم نہیں کرتے، تو بھلا محدثین ومفسرین، ناقدین فن حدیث و تاریخ کے متعین کردہ اصولوں کو کیوں کر خاطر میں لائیں گے، اس لئے مناسب محسوس ہوا کہ خود مولانا محترم کے تنقیدی و تحقیقی اصولوں کی روشنی میں ان کی نگارشات کا جائزہ پیش کر دیا جائے تاکہ شیعی فکر وعقیدہ کے اثرات ان کی تحریر و تقریر، اور ذہن و دماغ میں کس قدر مسلط ہیں اس کا انہیں ادراک ہو سکے۔ اب ذیل کی سطروں میں مولانا محترم کی قائم کردہ میزان کے مطابق ان کی تحریر و تقریر اور ان کے عقائد و تصورات کا ایک جائزہ پیش خدمت ہے، ملاحظہ فرمائیں:

(۱) شیعیت کی شناخت کا پہلا اصول

شیخین حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے نفرت:

شیعیت کی شناخت کا یہ اصول ہمارا نہیں خود مولانا محترم نے قائم فرمایا ہے، اور افسوس کہ اس اصول کا انطباق پورے طور پر خود مولانا کی تحریر و تقریر پر ہوتا ہے، مولانا کے رسالہ ''صحابہ کی تعریف'' یا رسالہ ''ازالہ کا ازالہ'' کا ہر ہر ورق بلکہ ہر ہر سطر حضرات شیخین کی جانب سے بدگمانی اور نفرت کی داستان سناتی نظر آتی ہے، انداز بیان اس بات کا پتہ دیتا ہے جیسے مولانا محترم ان کو

ایک غاصب اور جابر انسان کی شکل میں دیکھتے ہیں، اور ان کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کی افضلیت کے قائل ہیں، اپنے اس بیان کی تائید میں ہم مولانا محترم کی تحریروں کے بعض نمونے ذیل میں پیش کرتے ہیں مولانا فرماتے ہیں:

''کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مرض الوفات میں جمعرات کے دن ۸ ربیع الاول کو ظہر کی نماز سے پہلے نہیں فرمایا تھا کہ ''قلم اور کاغذ لاؤ میں وصیت لکھوادوں'' تو ایسا کیا ہوا کہ گھر میں جھگڑا ہونے لگا؟، اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ناراضگی میں فرمایا کہ قوموا عنی فـ ِانہ لا ینبغی عند النبی التنازع (میرے پاس سے جاؤ، نبی کے پاس جھگڑا نہیں ہونا چاہئے) کیا نہیں گیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سخت بیمار ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تو ہر بات ہر وقت حجت ہوتی ہے، بیماری میں تو اور زیادہ حجت ہوتی ہے پھر رکاوٹ کیوں ہوئی؟ اور کبار صحابہ میں جھگڑا کیوں ہوا؟ کیا عبداللہ بن عباس حسبِ روایت بخاری جمعرات کے اس دن کو یاد کر کے روتے نہیں تھے؟''۔

قارئین کرام!

غور فرمائیں کیا یہ شیعی ذہنیت کی ترجمانی نہیں؟ اور کیا خلیفہ ٔراشد حضرت عمر پر صریح اتہام نہیں کہ انہوں نے کتابتِ قرطاس میں رکاوٹ پیدا کی، اور کیا مولانا کی مقصود اس سے یہ ثابت کرنا نہیں کہ اگر ان کا یہ ظالمانہ (نعوذ باللہ) عمل نہ ہوتا تو حضرت علیؓ کے حق میں کتابتِ قرطاس ہوجاتی، اور وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے متعین کردہ خلیفہ اول ہوتے؟ کیا یہ حضرت عمرؓ کی جانب سے شدید قلبی بغض اور نفرت کی دلیل نہیں؟۔

ایک سوال پر اور غور فرمائیں، یہ سوال مولانا محترم کے فکر وعقیدہ کی بھرپور ترجمانی کررہا ہے، اور یہاں مولانا محترم کا حضرات شیخین جیسی پاکیزہ و پاکباز ہستیوں پر غم وغصہ ابل رہا ہے؟ مولانا فرماتے ہیں:

''کیا پھر اسی دن (واقعہ ٔ قرطاس بروز جمعرات) یہ ثابت کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسے بیمار نہیں ظہر کی نماز میں حضور مسجد تشریف نہیں لائے؟ یعنی اس واقعہ کے تھوڑی دیر بعد، اور نہ صرف یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی، بلکہ ظہر کی نماز کے بعد تقریر کی، اور اسامہ بن زید کی قیادت پر تنقید کرنے والوں پر سخت نکیر فرمائی (دیکھئے روایت صحیح بخاری) اور حضرت اسامہ کی

قیادت میں لشکر کو رومیوں سے جنگ کرنے کے لیے جانے کا بتا کید حکم فرمایا، اور اس میں حضرت ابوبکرؓ وحضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ وغیرہ حضرات کو بتا کید ساتھ جانے کا حکم فرمایا، اس کے بعد چند گھنٹوں کی تاخیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو برداشت نہ تھی (حدیث وتاریخ کی کتابوں کی ورق گردانی کیجئے اور جواب دیجئے)۔

آپ کو معلوم تھا کہ یہ میرا آخری وقت ہے، جبرئیل نے آپ کو مطلع کر دیا تھا اس موقع پر ابوبکر وعمر کو شام روانہ کر رہے ہیں، جہاں جانے اور واپس آنے میں ڈیڑھ دو ماہ لگتے، ایسا آپ کیوں کر رہے ہیں؟۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بار بار کی تاکید کے بعد یہ حضرات کیوں نہیں روانہ ہوئے؟۔

حضرات شیخین ابوبکرؓ وعمرؓ اور اس امت کے امین وبرگزیدہ ہستی حضرت ابوعبیدہ کے اخلاص وبے لوثی پر تہمتیں عائد کرنا، ان کردار کشی کرنا، ان کی نیتوں میں شبہات کا اظہار کرنا کیا قلبی نفرت نہیں؟ کیا یہ کلمات دل میں چھپے بغض وحسد کے جذبات کا مظہر نہیں؟ اور کیا اسے حضرات شیخین کے تئیں محبت وعقیدت کا اظہار کہا جائیگا؟۔

مولانا محترم کی ہفوات اور بدگمانیوں سے لبریز ایک نمونہ اور ملاحظہ فرمائیں، فرماتے ہیں:

''دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ میں آپ کا انتقال ہوا، تو حضرت عمرؓ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، ان کا دماغ حاضر نہیں رہا، اور جب حضرت ابوبکرؓ کی تقریر سے حقیقت واضح ہوگئی، تو ان کا بیان ہے کہ ان کے پیروں نے جواب دے دیا، اور بے طاقتی کے عالم میں بیٹھنے پر مجبور ہو گئے، پھر سقیفہ بنی ساعدہ کی میٹنگ کی اطلاع پر انہوں نے وہاں جانے کا فیصلہ کیا تو صرف حضرت ابوبکرؓ وابوعبیدہؓ کو ساتھ لیا، حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کو جو گھر ہی میں موجود تھے ساتھ کیوں نہیں لیا؟؟

اس سوال پر جناب مفتی صاحب! یہ الزام نہ لگا دینا کہ لیجئے حضراتِ شیخین کی بے حرمتی ہوگئی، ان باتوں کا صرف علمی جواب دیں، ادھر ادھر کی باتیں نہ کریں''۔

غور فرمایئے اور بتایئے کہ شیخ محترم کے یہ سوالات کیا اس امر کا برملا اعتراف نہیں کہ نعوذ باللہ حضرت شیخینؓ وحضرت ابوعبیدہ نے ایک پلاننگ اور چالبازی کے ذریعہ حکومت حاصل کر لی

اور حضرت علیؓ کو اس سے دور رکھا، کسی شخص کو ظالم، غاصب، اور چالباز سمجھنا احترام وعقیدت کی آخر کون سی شکل ہے؟ کیا یہ محبت کا مظہر ہے یا نفرت وحسد کی دلیل؟ یقینا نفرت اور حسد کی دلیل ہے، اور یہ جرم مولانا محترم سے سرزد ہوا ہے، اور خود ان کے ہی قائم کردہ اصول کی روشنی میں یہ شیعیت کی علامت ہے۔

(۲) شیعیت کی شناخت کا دوسرا اصول

سبِ وتکفیر صحابہ۔

مولانا محترم نے شیعت کی شناخت کی دوسری علامت سب صحابہ قرار دی ہے، یہ علامت بھی مولانا محترم کی تحریر وتقریر میں نمایاں ہے، ان کے بیان کا حرف حرف تصدیق کرتا ہے کہ مولانا محترم صحابہ کرام کو لائق احترام ہستی اور قابلِ تعظیم گروہ تسلیم نہیں کرتے، حضرت مغیرہ بن شعبہ وحضرت معاویہؓ حضرت عمروؓ بن العاص، حضرت بسرؓ بن ارطاۃ، حضرت خالدؓ بن ولید وغیرہم کا تذکرہ جس نامناسب انداز میں کیا ہے، اوران پر جو سخت تبصرہ ہیں، وہ خود اس کے گواہ ہیں، مولانا سبّ صحابہ کے جرم کے مرتکب ہوئے ہیں، اس کے اثبات میں کسی نمونہ اور دلیل ومثال کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں مولانا محترم کی کتابیں خود پڑھ ڈالئے اور ان کی تقریر کے لب ولہجہ میں گستاخیوں، غلط بیانیوں، اور الزام تراشیوں کی داستان خود سن کر فیصلہ فرمایئے کہ مولانا محترم خود اپنے متعین کردہ اصول کی بنیاد پر شیعی ہیں یا نہیں؟۔

(۳) عقیدہ تحریف قرآن

مولانا فرماتے ہیں ''صحابی کی یہ تعریف نہ حضور ﷺ سے منقول ہے نہ حدیث سے نہ خلفائے راشدین سے اور نہ کسی صحابی سے بعد کے دور میں یہ تعریف وضع کر لی گئی بالکل ایسے ہی جیسے قرآن کی (۱۱۴) سورتیں ہیں۔(صحابہ:۹)

حالانکہ اس پر اہل سنت والجماعت کا اجماع ہے کہ قرآن میں (۱۱۴) سورتیں ہیں، علامہ سیوطی فرماتے ہیں: أما سورة مائة وأربع عشرة سورة بإجماع من يعتد به (الإتقان

النوع التاسع عشر)

مولانا صاحب کو وضاحت کرنا چاہئے کہ قرآن کے متعلق ان کا عقیدہ کیا ہے یا ان کی اس عبارت کا صحیح مفہوم کیا ہے؟

مولانا محترم نے فرمایا ہے کہ ''ان میں کسی بات کا اگر کوئی شخص مرتکب ہو تو وہ شیعی ہے جس کا اہلِ سنت سے واسطہ نہیں''۔

مولانا محترم آپ کے اصول کے مطابق یہ جرمِ شنیع خود آپ سے سرزد ہوا ہے، اس لئے ہم اہلِ سنت آپ کے فکر و عقیدہ سے اپنی برائت کا اعلان کرتے ہیں، تاکہ روزِ محشر احکم الحاکمین کی گرفت سے محفوظ رہیں۔

مولانا محترم نے شیعیت کے ساتھ ساتھ اہلِ سنت کی علامتوں میں ۷/علامتوں کا تذکرہ کیا ہے، ہم ان میں کئی علامات کو اہلِ سنت کی علامات نہیں تسلیم کرتے، لیکن پھر بھی چونکہ مولانا محترم نے ان کو اہلِ سنت کی علامات قرار دیا ہے، آیئے ذرا ملاحظہ فرمایئے کہ بطور خاص یہ دو علامتیں کیا مولانا محترم کی تحریر و تقریر میں کہیں موجود ہیں؟

(۱) تمام صحابہ کو عدول ماننا

اس امکان کے ساتھ کہ ان سے اجتہادی خطائیں ہوسکتی ہیں۔

مولانا محترم کے نزدیک یہ اہلِ حق و اہلِ سنت کی علامت ہے، جبکہ خود ہی مولانا محترم کے تازہ بیان اور ان کے قولِ جدید کے مطابق صحابہ میں سب طرح کے لوگ تھے، منافق بھی تھے، ظالم بھی تھے، فاسق بھی تھے، اب بتائیں کہ کیا تمام صحابہ کو عادل مانتے ہوئے ظالم، باغی، فاسق وغیرہ جیسے کلمات سے ان کا تعارف کرایا جاسکتا ہے؟ مولانا محترم کا ارشاد ملاحظہ ہو:

''آپ (مفتی عتیق صاحب بستوی) کا صحابہ کرام کا دفاع قابلِ قدر ہے، لیکن آپ یہ مانتے ہیں کہ جو صحابی مرتد ہوگئے، وہ صحابی نہیں رہے، ظاہر ہے کہ وہ تو کافر ہوگئے، لیکن یہ آپ نے مان لیا کہ صحابی مرتد ہوگئے، اور یہ آخری درجہ کا جرم ہے، تو اس سے ادنی درجہ کا جرائم پھر کیوں نہیں ہوسکتے، فاسق کیوں نہیں ہوسکتے؟ ظالم کیوں نہیں ہوسکتے؟ جو آخری درجہ کا جرم کرسکتا

ہے وہ اس سے کم درجہ کا جرم کیوں نہیں کرسکتا؟ کیا عادل قاذف ہوسکتا؟ کیا حضرت حسان کے جرمِ قذف میں کوڑے نہیں لگائے گئے تھے؟ کیا دیگر صحابہ سے کبائر نہیں ہوئے؟ نہ قرآن انہیں معصوم کہتا ہے نہ نبی، تو پھر آپ کے جمہور ان کی فضیلت کے لئے ایڑی چوٹی کا زور کیوں لگاتے ہیں؟۔

آپ کا کہنا ہے جو منافق تھے وہ صحابہ نہیں تھے آپ منافقوں کی کوئی لسٹ بنا سکتے ہیں؟ اُحد کے موقع پر تین سو بھگوڑے کون تھے؟ آپ کے پاس کوئی فہرست ہے؟ وہ مسلمان تھے مسلمان مرے، مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہوئے تو صحابہ کی تعریف ان پر منطبق ہورہی ہے یا نہیں؟ کیا آپ کے پاس ان کے بارے میں علم غیب ہے؟ تبوک کے سفر میں کن صحابہ کو منافق کہا گیا؟ وہ سفر جہاد میں شرارتیں کررہے تھے، قرآنی آیات میں ان کا بیان ہے، اُحادیث میں بغیر نام کے ان کے تذکرہ ہیں، کسی کسی کا نام بھی آگیا ہے، ان کو صحابہ سے الگ کسی کالونی میں بسایا گیا تھا؟ یا وہ عام صحابہ کے ساتھ رہتے تھے؟ نمازوں میں آتے تھے، حضور اپنی تقریر میں ان پر سخت نکیر فرماتے تھے، کیا وہ صحابہ نہیں تھے؟ کیا وہ مسلمان شمار نہیں ہوتے تھے؟ کیا حضور ان کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھا رہے تھے؟ کیا سردار منافقین مسلمانوں میں شمار نہیں ہوتا تھا؟''۔

غور فرمایئے کہ ایک شخص جو تمام صحابہ کو عادل تسلیم کرتا ہو اس امکان کے ساتھ ان سے اجتہادی خطائیں ہوسکتی ہیں، کیا صحابہ کرام کے سلسلہ میں اس کا یہ لب ولہجہ ہوسکتا ہے؟ اور کیا صحابہ پر نفاق کا الزام عائد کرسکتا ہے؟ اور کیا ان کو ظالم وجابر اور فاسق کہہ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں، ایسی جسارت وہی کرسکتا ہے جس کے دل ودماغ پر حضرات صحابہ کے سلسلہ میں بغض وحسد بھرا ہوا ہو، اور ان کو معیارِ حق نہ تسلیم کرتا ہو۔

(۲) اہلِ سنت کی دوسری علامت

شیخین ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی تعظیم وتوقیر کرنا۔

ظاہر ہے کہ یہ علامت بھی مولانا محترم کی تحریر وتقریر میں ناپید ہے، وہ شیخین کی عظمت کا اعتراف کرنا تو کجا ان کی نیتوں اور ان کے صدق واخلاص پر شکوک کا اظہار برملا کرتے ہیں، اس

پیمانہ سے وہ خود اپنی ذات کا جائزہ لیں کہ اہلِ سنت سے وہ کس قدر دور اور شیعیت سے کس قدر قریب ہو گئے ہیں۔

واضح رہے مولانا محترم کا متعین کردہ یہ معیار تقریباً ۲۵ / ۳۰ برس پرانا ہے، اور اسی کے مطابق ہم نے یہ جائزہ پیش کیا ہے، اور مولانا محترم کی سیمابی فطرت سے یہ کچھ بعید نہیں آج کا معیار و پیمانہ ان کے نزدیک کہیں بدل نہ گیا ہو، کیونکہ ان کے یہاں کوئی اصول دائمی اور کوئی حقیقت ابدی نہیں، چونکہ مولانا محترم کا علم ترقی پذیر ہے، ان کا مطالعہ جدید سے جدید تر اور عجیب سے عجیب تر حقیقتوں کا متلاشی رہتا ہے، کسی ایک حقیقت پر ٹھہر جانا ان کی ہمتِ جواں، پیہم رواں کے تقاضے کے خلاف ہے اور ان کی شانِ علم کو یہ زیب نہیں دیتا، اس لئے اگر اس عرصہ میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہے تو ہمیں اس کا علم نہیں، ہمیں اس سلسلہ میں معذور سمجھا جائے۔

تیس برس قبل مولانا محترم نے اہلِ سنت کا جو شعار تسلیم کیا تھا، اور جو خطوط قائم فرمائے تھے یقیناً وہ مولانا محترم کے نزدیک سنیت کی علامات تھیں اور ان کی ذات میں بدرجہ اولی موجود رہی ہوں گی، حیرت ہے کہ تیس برس کے مختصر عرصہ میں ان کی دنیا میں یہ عجیب وغریب انقلاب اچانک کیسے آ گیا! اس رازِ سربستہ کی کوئی عقلی توجیہ ہمارے نہاں خانۂ دماغ میں نہیں آ رہی، ہماری عقلِ نارسا اس کے ادراک سے قاصر ہے، سنیت کا ایسا بے لوث ترجماں آخر شیعیت کی غلیظ دلدل میں کیسے جا پھنسا؟ کچھ کہنا ممکن نہیں، اگر ہم عقیدۂ تناسخ کے قائل ہوتے تو یہ توجیہ کر لیتے کہ ساداتِ بارہہ کی بعض شیعی ارواح نے ان کے قلب و دماغ میں اپنا آشیاں بنا لیا ہے، یا ان کی ارواح ان کے جسم میں حلول کر گئی ہیں، لہذا یہ فکر و عقیدہ ان کا نہیں، بلکہ ان شیعی ارواح کا اثر ہے، لیکن ہائے افسوس ہم اس توجیہ پر بھی قادر نہیں۔

قسط نمبر-۲۱

مولانا محترم کا سیدنا حضرت عثمانؓ پر شبہات واعتراضات

''حضرت عثمان نے دباؤ میں کچھ ایسے فیصلے لئے جس کی وجہ سے انقلاب آیا۔

(مدرسہ ضیاء العلوم میدان پور میں کی گئی تقریر سے ماخوذ)

مولانا محترم کی تقریر سے بعض ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ؟ ''کیا واقعی حضرت عثمانؓ نے بعض ایسے فیصلے لئے، اور وہ بھی دباؤ کی وجہ سے، جس کی وجہ سے انقلاب آیا؟

جواب:

تاریخ اسلام کی پیشانی پر ایک بدنما داغ سبائیوں نے یہ بھی لگایا کہ اسلام اور مسلمانوں کے عظیم ترین مسیحا اور بے لوث خادم کے خونِ ناحق سے زمیں لالہ زار کی گئی، اسے نہایت مظلومانہ انداز میں شہید گیا گیا، اور وہ جانثارِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف وصیتِ نبوی پر عمل کرتے ہوئے مردانہ وار، تمام ناگفتہ بہ حالات کا مقابلہ کرتا رہا، اسے جان و مال اور عزت ومنال اگر عزیز ہوتا، اور اسلامی تقاضوں کے مقابلہ میں اگر خاندان اور قرابت داریاں محبوب ہوتیں تو وہ یہ سب حاصل کرنے پر قادر تھا'' لیکن ہائے افسوس وہ شیدائی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم راہ حق میں سب کچھ لٹا کر بھی متہم رہا، ہر رسمِ وفا نبھا کر بھی اسے بے وفائی کا طعنہ ملتا رہا، مولانا محترم کا یہ قول بھی درحقیقت ان ہی بدگمانیوں اور الزام تراشیوں کا منھ بولتا ثبوت ہے جو دشمنان دین روز اول سے حضرت عثمانؓ کی ذات پر لگاتے آئے ہیں، اور ہمارے بعض سادہ لوح اور بیمار ذہنیت نے اسے قبول بھی کر لیا ہے، ارے عقل کے دشمنو! کبھی غور کیا کہ اس الزام کی بنیادیں کیا ہیں، وہی بغض وعداوت پر مبنی تاریخی حکایتیں، سطحی جذبات کی ترجمانیاں، افسانے اور کہانیاں جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں، ان تاریخی حکایتوں کو ذرا میزان قرآنی پر تول تو لیا ہوتا، یہ تو سوچا ہوتا کہ الزام کس پر ہے! اور بہتان

کی نوعیت کیا ہے!! قرآن کریم میں غور کرتے تو یہی جواب ملتا کہ "سبحانك هذا بهتان عظيم"۔

ظاہر ہے جس کے صدق واخلاص اور پاکبازی و پارسائی کا گواہ خود رسول ہو، قرآن کریم نے جن نفوس قدسیہ کے تعلق سے اپنا مضبوط موقف پیش کر دیا ہوتو بھلا ان تاریخی روایات کو جو سراسر قرآن کریم کی ہدایت اور تعلیم نبوی کے خلاف ہوں کیسے قبول کیا جا سکتا ہے، قبل اس کے مولانا محترم کے سوال بلکہ صحیح الفاظ میں اتہام کا جواب دیا جائے، بہتر ہوگا حضرات صحابہ اور خصوصا حضرت عثمان کے تعلق سے قرآن وسنت کا موقف اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرز عمل اور ان کا مقام ومرتبہ پیش کر دیا جائے تاکہ صحیح طور ان کی عظمتوں کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

حضرت عثمان غنیؓ

(۱) حضرت عثمان سابقین اولین میں سے ہیں، حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے، حافظ ابن حجر نے اصابہ میں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "أسلم قديماً قال ابن اسحاق كان ابوبكر مؤلفاً لقومه فجعل يدعوا إلى الاسلام من يثق به فأسلم على يديه فيما بلغني الزبير وطلحة وعثمان"۔

ابوثور رفہمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عثمان نے مجھ سے ایام محاصرہ میں فرمایا، إني رابع أربعة في الإسلام"۔ (طبری ۳/۴۴۴)

(۲) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نبوت کا اعلان کیا تو ابولہب نے اپنے بیٹوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیوں کو طلاق دلوادی۔ تب حضرت رقیہؓ سے آپ کا نکاح ہوا، حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ "ولم يكن دخل بها فتزوجها عثمان"۔ (اصابہ تذکرہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہ)

(۳) ہجرت اولیٰ:

جب مکہ میں زمین مسلمانوں کی زندگی اجیرن ہوگئی، اوران پر عرصۂ حیات تنگ کیا جانے لگا تو آپ رضی اللہ عنہ سب سے پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کی، اصابہ میں ہے: وهو أول من

هاجر إلى الحبشة ومعه زوجته رقية۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر فرمایا، **والذی نفسی بیده إنه أول من هاجر بعد ابراهيم ولوط**"۔

(۴) ہجرت ثانیہ:

حضرت خلفائے راشدین میں یہ شرف صرف آپ کو حاصل ہے کہ انھوں نے ایک ہجرت کی لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دو ہجرتیں کیں، حبشہ میں چند سال رہ کر آپ مکہ تشریف لائے اور پھر مدینہ کی طرف ہجرت کی آپ فرماتے ہیں:

"**هاجرت الهجرتين الأولين**" (بخاری باب ہجرہ حبشہ)۔

(۵) غزوہ بدر

غزوۂ بدر میں آپ کی زوجہ بیمار تھیں اس لئے آپ اس غزوہ میں شریک نہ ہو سکے، لیکن آپ رضی اللہ عنہ کو بدر میں شریک ہونے والوں کے جیسا اجر ملے گا اس کی خوشخبری آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "**إن لك أجر رجل ممن شهد بدراً وسهمة** (بخاری باب مناقب عثمان)۔

اسی لئے ان کو شرکاء بدر میں شمار کیا جاتا ہے، علامہ ابن عبدالبر لکھتے ہیں: "**فهو معدود في البدرين لذلك**"۔ (استیعاب تذکرہ حضرت عثمان)

(۶) غزوہ احد:

غزوۂ احد میں جو حالات پیش آئے وہ نہایت ہی خطرناک رخ اختیار کر گئے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر مشہور ہوگئی، اور ایک بار تو ایسا ہوا کہ مسلمان ہی مسلمان پر تلوار چلانے لگے، ایسے حالات میں حضرت عثمان میدان سے ہٹ گئے، لیکن اللہ تعالیٰ نے صاف اعلان فرمادیا "**ولقد عفا الله عنهم إن الله غفور حليم**" (سورۂ آل عمران)

میدان جنگ سے پیٹھ پھیرنا اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دیتا ہے، "**ومن يولهم يومئذ دبره إلا متحرفاً لقتال أو متحيزاً إلى فئة فقد باء بغضب من الله**۔ (انفال ۱۶)

لیکن جب اس طرح کا کوئی معاملہ صحابہ کے ساتھ پیش آجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ خود سامنے

آجاتا ہے، اور معافی کا اعلان کر دیتا ہے، اور ارشاد ہوتا ہے کہ ولقد عفا الله عنهم۔

تنبیہ: حضرات صحابہ کے ساتھ خاص معاملہ رہا ہے، اس کی مثالیں قرآن میں جا بجا موجود ہیں، ایک مثال اور دیکھئے:

واقعہ افک کے موقع پر جب منافقین کی سازش سے کچھ صحابہ بھی حضرت عائشہ کی تہمت میں ملوث ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(۱) "ولولا فضل الله عليكم ورحمته فى الدنيا والآخرة لمسكم فى ما أفضتم فيه عذاب عظيم" (سورہ نور ۱۶)۔ اور دوسرے موقع پر بھی یہ فرمایا تھا:

(۲) "ولولا فضل الله عليكم ورحمته وأن الله رؤف رحيم"۔

(۳) غزوہ بدر میں جب تک مال غنیمت اور قیدیوں کے فدیہ کے بارے میں واضح ہدایات نہیں تھیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلمنے صحابۂ کرام کے مشورہ سے فدیہ لے لیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

"لو لا كتاب من الله سبق لمسكم فيما اخذتم عذاب عظيم، فكلوا مما غنمتم حلالاً طيبا واتقوا الله ان الله غفور رحيم (الأنفال ۶۹)

درحقیقت یہ اعمال ایسے تھے کہ ان پر اللہ کی پکڑ ہوسکتی تھی لیکن اللہ تعالی نے ہر موقع پر اپنی معافی کا اعلان فرمادیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب پر اللہ کے لطف وکرم کی کوئی حد ہے، اس کی اور مثالیں قرآن میں موجود ہیں۔

مولانا محترم! یہ ہے مقام صحابہ، اور حضرات صحابہ کے ساتھ ربانی مراعات اور لطف وعنایات، جس کے آپ منکر ہیں، اسی لئے عام انسانوں پر قیاس کر بیٹھتے ہیں۔

ایک مصری بلوائی نے حضرت عثمان پر جب غزوہ احد میں میدان سے ہٹ جانے پر اعتراض کیا تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "فاشهد أن الله عفا عنه وغفر له" میں گواہی دیتا ہوں کہ بالیقین اللہ تعالیٰ نے انھیں معاف کر دیا، اور ان کی مغفرت فرمادی۔
(صحیح بخاری باب مناقب عثمان)

(۷) حدیبیہ:

حدیبیہ سیدنا عثمان کے فضائل ومناقب کا روشن ترین باب ہے، حدیبیہ میں آپ رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر بن کر گئے، قریش نے آپ پر سخت پہرا بٹھا دیا، کہ واپس نہ جانے پائیں، ادھر یہ خبر مشہور ہوگئی کہ حضرت عثمان شہید کر دیے گئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت کی، یہ ایسی سعادت ہے کہ جو دوسرے صحابہ کے حصہ میں نہ آئی حضرت انس فرماتے ہیں:

"کان عثمان رسول رسول الله إلى أهل مكة فبايع الناس فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم إن عثمان فى حاجة الله، وحاجة رسوله فضرب باحدى يديه على الأخرى فكانت يد رسول الله صلى الله عليه وسلم لعثمان خيرا من أيديهم لأنفسهم" (ترمذی باب المناقب)۔

(حضرت عثمانؓ اہل مکہ کے پاس سفیر بن کر گئے تھے اس موقع پر بیعت رضوان ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا عثمان اللہ اور اس کے رسول کے کام سے گئے ہیں، تو آپ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر رکھا (یعنی ان کی طرف سے بیعت کی) تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہاتھ حضرت عثمان کے حق میں دیگر صحابہ سے ہاتھ سے بہتر تھا)۔

اس بیعت کو بیعت رضوان کہتے ہیں، بیعت رضوان میں شامل ہونے والوں کو اللہ تعالیٰ نے یہ مژدہ سنایا "لقد رضى الله عن الذين اذ يبايعونك تحت الشجرة فعلم ما فى قلوبهم فأنزل السكينة عليهم وأثابهم فتحاً قريباً ومغانم كثيرة يأخذونها وكان الله عزيزًا حكيمًا (سورہ فتح)

ذرا غور فرمائیں! جس ذات پاک کے خون کے بدلہ لینے کی بیعت کرنے والوں پر انعام ربانی کی یہ موسلا دھار بارش ہو رہی ہو وہ کیسا مخلص صادق ومحب رسول اللہ ہوگا۔

(۸) بئر رومہ:

حضرت عثمان نے محاصرہ کے وقت قسم دے کر لوگوں سے پوچھا "هل تعلمون أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قدم المدينة وليس بها ماء يستعذب غير بئر رومة فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم من يشترى بئر رومة فيجعل دلوه مع دلاء المسلمين، بخير له منها فى الجنة فاشتريتها من صلب مالى"۔ (ترمذی

۳۷۰۳ وقال هذا حديث حسن)۔

(کیا تمہیں معلوم ہے کہ جب آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو بئر رومہ کے علاوہ میٹھے پانی کا کوئی کنواں نہیں تھا، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ بئر رومہ کو خرید کر جو مسلمانوں کیلئے وقف کر دے گا تو اس کو جنت میں ایسا کنواں ملے گا تو میں نے اپنے جیب خاص سے اس کو خرید کر مسلمانوں کیلئے وقف کر دیا)۔

(۹) غزوہ خیبر

۷ھ میں معرکہ خیبر پیش آیا پھر ۸ھ میں مکہ فتح ہوا، اسی سال غزوہ ثقیف وطائف جو غزوۂ حنین کے نام سے مشہور ہے، حضرت عثمانؓ ان تمام معرکوں میں شریک رہے۔

فائدہ: (۴) غزوہ حنین میں مسلمانوں کو اپنی کثرت کی وجہ سے کچھ زعم ہو گیا تھا، تو پھر ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا، پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **ثم انزل الله سكينته على رسوله ......والله غفور الرحيم۔ (سورہ توبہ ۷)**

(۱۰) غزوہ تبوک:

یہ غزوہ جیش العسرہ کے نام سے مشہور ہے، بڑی تنگی کا زمانہ تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے اس غزوہ کی تیاری میں حصہ لینے کی اپیل فرمائی، سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ۹۰۰ اونٹ ایک سو گھوڑے اور ایک ہزار دینار پیش کیے اس لیے ان کو "**مجهز جيش العسرہ**" کا خطاب ملا۔

حضرت عثمان نے محاصرہ کے دوران ایک دن خطاب کر کے فرمایا "**الستم تعلمون أنه قال من جهز جيش العسرة فله الجنة فجهزتهم** (بخاری کتاب الوصایا)۔

(کیا تمہیں معلوم نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ جو جیش عسرۃ کو تیار کرے گا اس کیلئے جنت ہے، چنانچہ میں نے جیش عسرہ تیار کیا)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عثمان کے اس جہاد بالمال سے اتنا خوش ہوئے کہ فرمایا: "**ما على عثمان ما عمل بعد هذه ما على عثمان ما عمل بعد هذه**" (ترمذی مناقب عثمان)۔

(اب عثمان پر کسی عمل کا مؤاخذہ نہیں، جو چاہے کریں)۔

(۱۱) مسجد نبوی کی توسیع:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "من یشتری بقعة آل فلان فیزیدها فی المسجد خیر له منها فی الجنة۔

حضرت عثمان نے یہ زمین خرید کر مسجد نبوی کی توسیع کے لئے وقف کردی۔ (ترمذی مناقب عثمان)

(۱۲) حضرت رقیہؓ کی وفات اور اللہ تعالی ورسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے حضرت عثمان کی دل بستگی:

حضرت رقیہ کی وفات ہوگئی آپ نے حضرت عثمان کو دیکھا کہ غمگین اور رنجیدہ ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم کو رنجیدہ کیوں دیکھ رہا ہوں؟ انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا مجھ سے زیادہ کسی کو مصیبت ہوگی؟ اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی جو میرے نکاح میں تھی، اس کی وفات ہوگئی جس سے میری کمر ٹوٹ گئی، اور جو آپ سے رشتۂ دامادی تھا وہ نہیں رہا، یہ باتیں ہورہی تھی کہ سرورِعالم نے فرمایا اے عثمان لو یہ جبرئیل آئے ہیں اور اللہ کی طرف سے مجھے حکم دے رہے ہیں تم سے تمہاری بیوی کی بہن ام کلثوم کا اسی مہر پر نکاح کردوں، جو تمہاری بیوی کا تھا، اور تم اس کو اس طرح رکھو جس طرح خوشگواری کے ساتھ اس کی بہن کو رکھتے تھے، یہ فرما کر آپ نے حضرت ام کلثوم کا نکاح حضرت عثمان سے کردیا، یہ نکاح ربیع الاول ۳ ہجری میں ہوا اور رخصتی جمادی الثانیہ ۳ ہجری میں ہوئی، حضرت ام کلثوم نے چھ برس حضرت عثمان کے نکاح میں رہ کر سفر آخرت اختیار کیا، اور ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

(تفصیل کے لئے دیکھیں اسد الغابہ واستیعاب وغیرہ)

اس طرح حضرت عثمانؓ نے ذی النورین کا خطاب حاصل کیا، یہ ایک ایسا شرف ہے کہ جس میں دنیا کا کوئی بشر ان کا شریک وسہیم نہیں۔

(۱۳) سیدنا حضرت عثمانؓ سیدنا حضرت عمرؓ کی ۶ رکنی کمیٹی کے معزز ترین رکن:

حضرت عمر نے آخری وقت میں چھ رکنی کمیٹی ترتیب دی تھی، اس کمیٹی کے رکنِ رکین حضرت عثمانؓ تھے، چنانچہ حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی، حضرت عبدالرحمن نے سب

سے پہلے آپ سے بیعت کی، **فبايع له عليّ وولج اهل الدار فبايعوه**"۔ (بخاری ۳۷۰۰)

(۱۴) مبشرین بالجنۃ کا شرف

حضرت عثمان عشرہ مبشرہ میں سے ہیں (بخاری ۳۶۹۳)

(۱۵) حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کے بعد سب سے افضل:

حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ کے بعد سب سے افضل حضرت عثمانؓ کی ذات گرامی ہے، حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ سے افضل تھے۔

حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ: "كنا فى زمن النبى صلى الله عليه وسلم لا نعدل بأبى بكر احدا ثم عمر ثم عثمان ثم نترك اصحاب النبى صلى الله عليه وسلم لا نفاضل بينهم"۔ (بخاری ۳۶۹۷)

(ہم رسول اللہ کی حیات مبارکہ میں ابوبکر کے برابر (مقام ومرتبہ کے اعتبار) کسی کو نہیں سمجھتے، پھر ان کے بعد عمر کو اور ان کے بعد عثمان کو، اور ان کے علاوہ دیگر صحابہ میں تفاضل نہیں کرتے تھے)۔

ابوداؤد کی روایت میں ہے، كنا نقول ورسول الله صلى الله عليه وسلم فينا: افضل امة النبى بعده ابو بكر ثم عمر ثم عثمان ثم زاد الطبرانى فى رواية: فيسمع رسول الله صلى الله عليه وسلم ذلك فلا ينكره"۔

(ہم لوگ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں کہتے تھے کہ اس امت میں سب سے افضل ابوبکر ہیں پھر عمر ہیں اور پھر عثمان ہیں، اور طبرانی کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہماری یہ باتیں سنتے تو منع نہیں کرتے تھے)۔

(دیکھیں فتح الباری شرح بخاری حدیث نمبر ۳۶۵۵ وسكت عنه الحافظ وهو حسن او صحيح على قاعدته فى الفتح)

امام بیہقی نے امام شافعی سے خلفائے راشدین کی ترتیب کے ساتھ ان کے افضل ہونے پر اجماع نقل کیا ہے، امام شافعی فرماتے ہیں "أجمع الصحابه وأتباعهم على أفضلية أبى بكر

ثم عمر ثم عثمان ثم علی" (أیضاً)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تقریر اور صحابہ اور تابعین کے اجماع کے بعد بھی کیا کسی مسلمان کو حضرت عثمان کے حضرت علی سے افضل ہونے میں کوئی کلام ہوسکتا ہے؟۔

حضرت عثمان کے خلاف سبائیوں کی جو شورش کی بنیاد رہی کہ حضرت عثمان اقرباء پروری کرتے ہیں، اور ان کے دباؤ میں سیاسی فیصلے لیتے ہیں، ان کا مطالبہ تھا کہ حضرت عثمان خلافت سے دست بردار ہوجائیں۔ حضرت عثمانؓ ان کا یہ مطالبہ تسلیم کر سکتے تھے۔

لیکن حضرت عثمان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا اور حکم پر اپنی شہادت کو راضی ہو گئے

"عن عائشة أن النبی صلی الله علیه وسلم قال "یا عثمان انه لعل الله یقمصك قمیصا فان أرادوك علی خلعه فلا تخلعه لهم" (رواه الترمذی ٣٧٠٥ وقال حدیث حسن)۔

(حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اے عثمان! ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالی تمہیں کوئی قمیص پہنائیں اور لوگ تمہاری وہ قمیص اتارنے کی کوشش کریں تو تم ان کیلئے وہ قمیص مت اتارنا)۔

حضرت عثمان نے محاصرہ کے دوران فرمایا تھا

"إن رسول الله صلی الله علیه وسلم قد عهد إلی عهداً فأنا صابر علیه"۔ (ترمذی ٣٧١١ وقال هذا حدیث حسن صحیح)۔

(یقینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے ایک عہد لیا ہے اور میں اس عہد پر ثابت قدم ہوں)۔

حضرت عثمانؓ پر الزام اور اس کا اجمالی جواب:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر لگائے گئے الزامات کا مفصل جواب تو ہم دوسرے موقع پر دیں گے، ہم یہاں صرف ایک اصولی جواب نقل کر دیتے ہیں:

١۔ لولا اذ سمعتموہ ظن المؤمنون والمؤمنات بأنفسهم خیرا وقالوا هذا إفك مبین"۔ (سورہ نور)

٢۔ مرہ بن کعب نے ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

لو لا حديث سمعته من رسول الله صلى الله عليه وسلم ما قمت وذكر الفتن فقربها، فمر رجل مقنع فى ثوب فقال "هذا يومئذ على الهدى" فقمت إليه، فاذا هو عثمان بن عفان، قال فأقبلت عليه بوجهه فقلت هذا، قال نعم۔ رواه الترمذى وقال هذا حديث حسن صحيح۔

(مرہ بن کعب سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث اگر نہ سنی ہوتی تو کھڑا نہ ہوتا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتنوں کا تذکرہ فرمایا اوران فتنوں کے قریب آجانے کا تذکرہ کیا، تو ایک شخص سر ڈھانکے ہوئے گذرا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اس وقت ہدایت پر قائم رہے گا، تو میں نے اٹھ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ عثمان ہیں، تو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ یہ، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں)۔

عن ابن عمر قال ذكر رسول الله صلى الله عليه وسلم فتنة فقال "يقتل فيها هذا مظلوما" لعثمان" ترمذى ٣٧٠٨ وقال هذا حديث حسن غريب)۔

(ابن عمرؓ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتنوں کا تذکرہ کیا تو آپ نے حضرت عثمان کے بارے میں فرمایا کہ کہ ان کی مظلومانہ شہادت ہوگی)۔

میرے خیال سے ایک مسلمان کے لئے اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں اور جن کے دلوں میں مرض ہے، ان کے مرض میں ہی اللہ تعالیٰ اضافہ کرے گا۔ وأما الذين فى قلوبهم مرض فزادتهم رجساً إلى رجسهم وماتوا وهم كافرون"

ویسے ایک الزامی جواب یہ بھی دیا جا سکتا ہے کہ اگر اقرباء کو عہدے مناصب دینا ایسا ہی ممنوع ہے تو مولانا محترم! حضرت علیؓ نے عبیداللہ بن عباس کو یمن کا اور قثم بن عباس کو طائف کا اور ثمامہ بن عباس کو مدینہ کا، عبداللہ بن عباس کو بصرہ کا اور اپنے ربیب محمد بن ابی بکر کو مصر کا گورنر کیوں بنایا؟

قسط نمبر۔ ۲۲

مولانا محترم کا سوال:

''حضرت عائشہ، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر کے اصرار پر بصرہ روانہ ہوئیں، اور حضرت علی کو مجبوراً بصرہ جانا پڑا، مسئلہ اصلاح کا تھا جنگ چھیڑ دی گئی، حضرت علی نے حضرت زبیر کو ایک حدیث یاددلادی کہ تم علی سے اس حال میں جنگ کروگے کہ تم ظالم ہوگے، وہ فوراً محاذ سے روانہ ہوگئے، پھر ایک خارجی نے ان کو ماردیا، حضرت طلحہ بھی واپس جانا چاہتے تھے، ان کو مروان نے مارا، حضرت علی نے فرمایا کہ طلحہ کے قاتل کو جہنم کی وعید سنادو۔ حضرت عائشہ سے حضرت علی ملے تو انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور پھر اپنی اس غلطی پر عمر بھر روتی تھیں خاص طور پر جب بھی "وقرن فی بیوتکن" والی آیات پڑھتی تھیں، تو اتنا روتی تھیں کہ دوپٹہ تر ہو جاتا تھا۔ اسے پڑھنے کی آپ کو توفیق ہوئی کہ نہیں؟؟

جواب:

مولانا محترم نے اپنے اس خطاب میں تحقیق و تفتیش کے اصول کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کسی کا الزام کسی کے سر منڈھنے کی کوشش کی ہے، اب تک کی پوری بحث میں قارئین کرام نے ملاحظہ کیا ہے کہ مولانا محترم کے نزدیک صرف ایک مقصد ہے، اور وہ ہے حب اہلِ بیت، اور پھر ''حب اہلِ بیت'' کا یہی نعرہ بلند تر سے بلند تر ہوتا گیا ہے یہانتک کہ سبائیت کے آہن شکن آوازیں بھی اس نعرۂ حب اہلِ بیت میں ان کو سنائی نہیں دے رہیں، اور ان کے پردۂ سماعت میں رتی بھر ارتعاش نہیں پیدا کر پا رہی ہیں، اور گویا سرے سے وہ اس حقیقت کو ماننے کو تیار نہیں کہ سبائیت بھی کوئی گروہ تھا جو حضرت عثمانؓ کی شہادت بلکہ اس سے پہلے سے سرگرم سازش تھا، اور اس کا مقصد سوائے تفریق بین المسلمین کے اور کچھ نہ تھا، حضرت عثمانؓ کی مظلومانہ شہادت بھی درحقیقت سبائی پروپیگنڈہ کا نتیجہ تھی، اس کی خاطر بہت ہوشیاری کے ساتھ خفیہ انداز میں ان

کے خلاف مہم چلائی گئی، طرح طرح کے الزامات ان کی ذاتِ محترم پر عائد کئے گئے، اور بالآخر مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ظلم و ناانصافی اور ستم ظریفی کا وہ منظر بھی دیکھا کہ دامادِ رسول عاشق قرآن سیدنا عثمان غنی پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں، اور مدینۃ الرسول جو امن و امان کا مرکز ہے ان اوباشوں اور کمینہ فطرت لوگوں کے حصار میں ہے، حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ کیا گیا، آب و دانہ بند کیا گیا، اور پھر توہین و تذلیل کا سلسلہ چلتا رہا، حضرت عثمان کی حرمِ محترم حضرت نائلہؓ کے ساتھ بدتمیزی کی گئی ان کی انگلیاں کاٹ دی گئیں، اور پھر حضرت عثمان کو شہید کیا گیا، اس سب کے بعد بلوائی مدینہ سے روانہ ہو کر عراق چلے گئے، یہاں سوال یہ ہے پھر ان بلوائیوں کا کیا ہوا؟ ظاہر ہے کئی ہزار کی تعداد رہی ہوگی بعض روایات میں پندرہ سولہ ہزار کی تعداد مذکور ہے۔

مولانا محترم!

حبِ اہلِ بیت کا جذبہ قابلِ قدر ہے، حضرت حسینؓ کی شہادت پر ماتم کناں ہونا اچھی بات ہے، لیکن قاتلانِ حسین کی خانہ تلاشی کے ساتھ ساتھ قاتلانِ عثمانؓ کی خانہ تلاشی سے آخر آپ اتنا خائف کیوں ہیں؟ کیا آپ کے علم میں نہیں یہ قاتلانِ عثمان وہی ہیں جو بعد میں حضرت علیؓ کی جماعت میں شریک ہو گئے، اور بعض نے تو کافی اثر و رسوخ حاصل کر لیا، بارہا حضرت علیؓ شیرِ خدا نے ان سے بیزاری کا شکوہ کیا، اور غم و غصہ کا اظہار کیا اور جن کے مظالم اور زیادتیوں کے تذکرہ سے سیدنا حضرت علیؓ کا کوئی خطبہ خالی نہیں، اور یہی وہ ظالم و بدنیت اور بدکردار ہیں جنہوں نے ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کو رونے پر مجبور کیا، اور ان کی فتنہ پردازیوں اور نفاقِ باطن کی وجہ سے کربلا کی زمین نواسۂ رسول کے خون سے لالہ زار ہوئی۔

حضور والا! سبائیت سے آپ کو اتنی ہمدردی کیوں ہے؟ اور سبائیوں کی ہر ظالمانہ کارروائیوں کی تاویل و توجیہ کر کے صحابہ کرام کے اقدامات کو ناروا ثابت کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں؟ کیا وجہ ہے کہ آپ کی تحریر و تقریر میں سبائیوں کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں؟ ایسا تو نہیں یہ خموشی ان کی ناروا جفاؤں کی تائید ہے؟ کیونکہ

خموشی جفاؤں کی تائید بھی ہے

حضور والا!

حضرت عثمان کی شہادت کے بعد افراتفری پھیلی ہوئی تھی، حضرت عائشہ مکہ میں حج کے ارادہ سے گئیں تھیں، حضرت زبیرؓ اور طلحہؓ مکہ پہنچے اور وہاں ان سے اصرار کیا کہ وہ اس معاملہ میں شریک ہوں، تاکہ امامِ مظلوم حضرت عثمان کی شہادت کا قصاص لیا جاسکے۔

حضرت عائشہ سے منقول ہے وہ فرما رہی تھیں، اللھم انك تعلم إني لا أريد إلا الاصلاح فأصلح بينهم۔ (کتاب الثقات لابن حبان ۲/۲۱۵)

(خدایا تو گواہ ہے کہ میں صرف اصلاح چاہتی ہوں، میرے خدا تو اصلاح فرما)۔

جناب شیخ آپ فرماتے ہیں کہ ''مسئلہ اصلاح کا تھا اور جنگ چھیڑ دی گئی'' یقینا حضرت عائشہؓ بغرضِ اصلاح نکلی تھیں لیکن یہ جنگ کس نے چھیڑی؟ وہی سبائی درندوں نے، قاتلانِ عثمانؓ نے، کیا اس کے علاوہ آپ کے پاس اور کوئی جواب ہے؟ آپ کی مراد کہیں حضرت طلحہؓ وحضرت زبیرؓ تو نہیں؟ اگر ایسا ہے تو حضور والا ہماری درخواست ہے کہ کسی کو تو بخش دیجئے کیونکہ زبانِ نبوی کی بشارت کے مطابق تو وہ سب جنت میں چلے گئے آپ کیوں اپنی عاقبت خراب کرنے کے درپے ہیں؟۔

ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت، اور پھر جنگِ جمل وصفین، سب سبائیوں کی فتنہ پروری اور پروپیگنڈہ کا نتیجہ ہیں، اور ان معرکوں میں جو صحابہؓ شریک ہوئے تو وہ بھی پورے اخلاص کے ساتھ، اصلاح کی خاطر، ان میں کوئی دنیوی لالچ وغرض نہ تھی، ان میں سے یا تو کوئی مجتہدِ مصیب تھا یا مجتہد مخطئ۔

جنگِ جمل میں دونوں جماعتیں صلح کے لئے راضی ہوگئیں تھیں۔ حضرت قعقاع حضرت عائشہ سے صلح کی کوشش کے لئے آئے، تو انھوں نے دریافت کیا "أي اماه ما أقدمك هذا البلد؟ قالت: إني أريد الإصلاح بين الناس (البدایہ والنہایہ ۷/۲۳)۔

(اماں جان! آپ کیوں تشریف لائیں تو فرمایا، میں لوگوں کے درمیان اصلاح چاہتی ہوں)۔

پھر قعقاع نے حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ رضی اللہ عنہما کے ساتھ اسی طرح کی بات کی، تو ان

بزرگوں نے بھی اپنا مقصد اصلاح بین الناس بتایا۔ چنانچہ گفت وشنید کے بعد معاملہ اس بات پر طے پایا کہ سکون پیدا کیا جائے، جماعتِ مسلمین میں باہمی اتفاق پیدا کیا جائے، اور حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی جائے تاکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قاتلوں سے قصاص لیا جا سکے۔

اس کی پوری روداد ابن کثیر کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں:

فرجع (القعقاع) إلى علي فأخبره فأعجبه ذلك. أشرف القوم على الصلح، كره ذلك من كرهه ورضيه من رضيه وأرسلت عائشة إلى علي تعلمه إنما جاءت للصلح ففرح هولاء وهولاء.. (البدايه والنهايه ۲۳۷/۷)

(قعقاع حضرت علیؓ کے پاس گئے انہیں بتایا تو یہ بات ان کو پسند آئی، اور قریب تھا کہ صلح ہو جائے، جسے ناپسند کرنا تھا انہوں نے ناپسند کیا، اور جسے اس صلح سے خوش ہونا تھا ان لوگوں نے خوشی کا اظہار کیا، حضرت عائشہ صدیقہؓ نے حضرت علیؓ کے پاس قاصد بھیجا کہ وہ اصلاح کے ارادہ سے آئی ہیں، تو دونوں جماعتوں نے خوشی کا اظہار کیا)۔

ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں اس بات کی خوشی تھی، لیکن سبائیوں کو اپنی عاقبت خطرے میں نظر آرہی تھی، علامہ طبری ان کے خوف وہراس کی کیفیت کو بیان کرتے ہیں کہ یہ اتحاد واتفاق تو ہمارے لئے سراپا قیامت بن جائے گا گردنیں ناپ دی جائیں گی، اب تک تو صرف طلحہ وزبیر اور ان کے ساتھ عائشہ تھیں اور اب علی کے اتحاد سے ہماری دنیا تو اور تنگ ہو جائے گی اس کیفیت کی ترجمانی علامہ طبری کا یہ جملہ خوب خوب کرتا ہے فرماتے ہیں کہ سبائیوں نے آپس میں کہا کہ "رأي الناس فينا - والله - واحد، وأن يصطلحوا وعلي، فعلي دمائنا"۔ (الطبری ۴۹۳/۴)

(لوگوں کی رائے ہمارے بارے میں ایک ہے، ان کا اور علی کا اتحاد ہماری (خلاف) گردن زدنی ہی ہے)۔

ان میں چہ می گوئیاں شروع ہوئیں کہ یہ صلح تو ان کے لئے مرگ کا پیام لے کر آئی ہے، وہ کہنے لگے زبیر اور طلحہ کا موقف تو ہمیں معلوم تھا لیکن یہ علی بھی ان کے ساتھی نکلے، چنانچہ انہوں نے اس صلح کو ناکام بنانے کی پلاننگ کی، اور رات میں دونوں کیمپوں پر حملہ کر دیا جس سے یہ تأثر پھیل گیا کہ بدعہدی ہوئی ہے۔

علامہ ذہبی کی المنتقی ص ۲۳۶ / ۲۳۵ سے ہم ایک عبارت نقل کرتے ہیں:

"فان عائشة لم تقاتل ولم تخرج لقتال وإنما خرجت بقصد الإصلاح بين المسلمين وظنت أن في خروجها مصلحة للمسلمين ثم تبين لها فيما بعد أن ترك الخروج كان أولى فكانت اذا ذكرت خروجها يتكئي حتى يبتل خمارها۔ وهكذا عامة السابقين ندموا على ما دخلوا فيه من القتال، فندم طلحة والزبير وعلى رضى الله عنهم أجمعين ولم يكن يوم الجمل لهولاء قصد في القتال ولكن القتال بغير اختيارهم"۔

(حضرت عائشہ نے نہ قتال کیا اور نہ قتال کیلئے نکلیں، وہ مسلمانوں کے درمیان اصلاح واتحاد کے ارادہ سے نکلی تھیں، ان کا خیال تھا کہ اس میں مسلمانوں کا مفاد ہے، پھر بعد میں ان معلوم ہوا کہ نہ نکلنا زیادہ بہتر تھا، چنانچہ جب بھی ان کو یاد آتا تو وہ ٹیک لگا کر روتیں یہانتک کہ اوڑھنی تر ہو جاتی، یہی حال عام سابقین اسلام کا تھا کہ قتال میں پڑ جانے پر ان کو افسوس تھا، حضرت طلحہ وزبیر وحضرت علی رضی اللہ عنہم کو بھی ندامت تھی، جنگ جمل میں قتال کا ان کا کوئی ارادہ نہ تھا بلکہ جنگ بغیر قصد وارادہ کے ناگہانی طور پر پیش آ گئی)۔

سورہ فتح کی آخری آیت پڑھیے "محمد رسول الله والذين معه أشداء على الكفار رحماء بينهم" الآیۃ۔ کیا اوپر کا واقعہ اس آیت کی ترجمانی نہیں کرتا؟ یقیناً یہ سو فیصد ترجمان ہے اس حقیقت قرآنی کا، اور بلاشبہ صحابۂ کرام ایسے ہی تھے، سابقین اولین عشرہ مبشرہ کو بھی ان اوصاف سے تہی دامن گردانا جائے گا تو پھر اللہ تعالیٰ کے اس کلامِ برحق پر کون یقین کرے گا؟

تنبیہ:

اگر کوئی تاریخی روایات ایسی ملتی ہے جو صحابۂ کرام کی قرآنی تصویر کیخلاف کوئی تصویر پیش کرتی ہو تو اس تاریخی روایت کو راویوں کی ثقاہت اور عدالت کے باوجود اٹھا کر ردی کے ٹوکری میں پھینک دینا چاہیئے۔

مولانا محترم!

آپ کی سبائیوں سے کون سی رشتہ داری ہے؟ کہ جرم وہ کرتے ہیں اور آپ ٹھیکرا صحابہ پر

چھوڑ دیتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "إن الله تبارك وتعالىٰ اختارنی واختار لی اصحابا فجعل لی منهم وزراء وأنصاراً وأصهاراً فمن سبهم، فعليه لعنه الله والملائكة والناس أجمعين لا يقبل منه يوم القيامة صرفاً ولا عدلاً۔ (مستدرك حاكم ۶۶۵۶ وقال صحيح الاسناد ووافقه الذهبى)۔

اس سے بڑا سب وشتم اور کیا ہوگا کہ صحابہ کرامؓ کی طرف اندھا دھند غداری، خیانت، دھوکہ بازی، قتل وخونریزی کی نسبت کردی جائے؟

حضور والا فرماتے ہیں: "ایک خارجی نے حضرت زبیر کو ماردیا" واہ مولانا محترم! آپ کے اس اجتہاد پر تو ذہن وخرد کے ساتوں طبق روشن ہوگئے، طبیعت میں وجد کی سی کیفیت پیدا ہوگئی، آپ کے پاس تو تحقیقی نوادرات کے خزانے ہیں، خارجی تو واقعۂ تحکیم کے بعد کی پیداوار ہیں وہ جنگ جمل میں کہاں سے آگئے؟

ابن جرموز نام کے ایک سبائی نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو سجدے کی حالت میں شہید کردیا، اور حضرت علیؓ کے پاس پہنچا، اور اجازت چاہی، آپ نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ قالوا ابن جرموز يستأذن، قال ائذنوا له ليدخل قاتل الزبير فى النار، إنى سمعت رسول الله عليه وسلم يقول: إن لكل نبى حوارياً وإن حوارى الزبير (مسند احمد ۶۸۰ وفى رواية قال:۔ بشر قاتل ابن صفيه بالنار۔ (مسند أحمد ۶۸۱)۔

(حضرت علیؓ سے لوگوں نے بتایا کہ کہ ابن جرموز اجازت چاہتا ہے، آپ نے کہا کہ آنے دو، اور زبیر کے قاتل کو جہنم کی خوشخبری دے دو، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ ہر نبی کا ایک حواری ہوتا ہے، میرے حواری زبیر ہیں)۔

حضرت طلحہؓ کا قتل اور مروان بن حکم پر اتہام کی حقیقت

مولانا محترم کا ارشاد ہے "حضرت طلحہؓ واپس جانا چاہتے تھے ان کو مروان نے مارا" حضرت طلحہ کو کس نے شہید کیا، اس کی نسبت حضور والا نے قطعیت کے ساتھ مروان کی طرف کی ہے، اس سلسلہ میں حاکم نے مستدرک میں متعدد روایات نقل کی ہیں، لیکن کوئی بھی ضعف

ونکارت سے خالی نہیں۔

سچ یہ ہے کہ حضرت طلحہؓ کی شہادت کی نسبت مروان کی طرف کرنا صحیح نہیں ہے، حافظ ابن کثیر نے اسی کو اختیار کیا ہے، و"یقال إن الذی رماہ بهذا السهم مروان بن الحکم وقال الأبان بن عثمان قد کفیتك رجالاً من قتلة عثمان وقد قیل إن الذی رماہ غیرہ وهذا عندی أقرب وإن کان الأول مشهوراً۔ واللہ اعلم

(البدایه والنهایة ۲۴۷/۷)

یہی بات قرین قیاس بھی ہے کہ مروان اپنے ہی ہم خیال آدمی کو کیوں مارے گا؟؟ مروان ہی وہ شخص ہے جس کی وجہ سے حضرت عثمانؓ پر بہت زیادہ ظلم ڈھایا گیا اور پھر شہادت کا مرحلہ پیش آیا۔ مروان کے سلسلہ میں یہاں چند امور ذہن میں رکھنا ضروری ہے:

(۱) پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ مروان ایک ثقہ راوی ہے، امام بخاری نے صحیح میں مروان بن الحکم سے روایت نقل کی ہے دیکھئے بخاری کی حدیث نمبر (۶۴۷وغیرہ اور حدیث نمبر ۲۵۴۰۔۶۱۴۵)۔

خود اہل بیت میں سے علی بن حسین نے مروان بن حکم سے روایت کی ہے۔

(مسند احمد ۷۳۳)

واضح رہے کہ امام بخاری نے امام ابوحنیفہ امام شافعی اور حضرت جعفر صادق سے مختلف وجوہ کی بنا پر روایات نہیں لیں۔

امام احمد فرماتے ہیں "کان عند مروان قضاء وکان یتبع قضاء عمر (تاریخ دمشق الکبیر ۲۳۳/۵۷، تاریخ الاسلام للذھبی ۲۰۶/۲)۔

انھوں نے بعض مشہور صحابہ سے روایت کیا ہے اور ان سے بھی صحابہ اور تابعین کی روایات ہیں۔ (تهذیب التهذیب ۹۲/۱۰-۹۱)

امام مالک نے موطا میں ان کے فیصل کردہ قضایا اور فتویٰ سے استدلال کیا ہے۔ اور موطا میں ان سے روایات بھی ہیں۔ (الموطا:۹۱)

وقد روی عنه سهل بن سعد الساعدی الصحابی اعتماداً علی صدقه۔ وقد اعتمد

علی حدیثه ورأیه والباقون سوی مسلم۔ (کذا فی مقدمه الفتح تحت حرف میم)

واضح رہے کہ امام بخاری نے تاریخ کبیر میں اور ابن ابی حاتم رازی نے کتاب الجرح والتعدیل میں مروان کے تذکرے میں جرح نقل نہیں کی۔

اسی لئے قاضی ابوبکر بن العربی العواصم والقواصم میں ص ۹۰۔۸۹ پر صاف فرما دیا۔

وأما علماء الأمصار فکلهم علی تعظیمه واعتبار خلافته والتفت إ لی فتاواه والانتقاد إلی روایته......... وأما السفهاء من المؤرخین والأدباء یقولون علی أقدارهم"۔

خلاصہ یہ کہ وہ ایک بلند پایہ فقیہ، ثقہ راوی اور تابعی جلیل ہے جن لوگوں نے اس پر الزامات لگائے ہیں وہ سبائی فتنے سے متأثر ہیں۔

(۲) حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کا مروان کے پیچھے نماز پڑھنا۔

عن جعفر عن أبیه کان الحسن بن علی والحسین یصلیان خلف مروان۔

(المصنف لابن شیبة ۲/۳۷۸) اور دیکھیں تاریخ صغیر امام بخاری ص ۵۷)

مولانا محترم! آپ دوسروں پر تلبیس وتدلیس اور ڈنڈی مارنے کا الزام لگاتے ہیں، لیکن یہ کیا ہے کہ مروان کو جہنم لے جانے کی جلدی میں جو بات حضرت علی نے ابن جرموز سے کہی تھی آپ نے وہ حضرت مروان کے تعلق سے استعمال کردی۔ کیا آپ کے یہاں علمی دیانت دار کا یہی معیار ہے؟؟

خرد نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

''حضرت عائشہ روتی تھیں''۔

جی بالکل روتی تھیں لیکن کیوں روتی تھیں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاهلیة" اس آیت میں جاہلیت کے طریقہ پر اظہار زینت کے طور پر نکلنا ممنوع قرار دیا گیا ہے، جب حضرت عائشہ عمرہ اور حج کے لئے نکل سکتی ہیں تو اصلاح بین المسلمین کے لئے کیوں نہیں نکل سکتیں؟

اصل میں حضرت عائشہ روتی تھیں کہ ان کو اس امر کا اندازہ نہ تھا کہ معاملہ اس حد تک پہنچ

جائے گا وہ تو اصلاح کے لئے نکلیں تھیں نوبت قتال تک جا پہنچی۔

علامہ ذہبی فرماتے ہیں: ولا ریب أن عائشة ندمت ندامة كلية على مسيرها إلى البصرة، وحضورها يوم الجمل وما ظنت أن الامر يبلغ ما بلغ۔

(سير أعلام النبلاء ۲/ ۱۷۷)

(بلا شبہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کو بصرہ جانے اور جنگ جمل میں شریک رہنے پر ندامت تھی، ان کو اندازہ نہیں تھا کہ نوبت یہاںتک پہنچ جائے گی)۔

حضرت عائشہ ہی کیا حضرت علی بھی نادم تھے، چنانچہ آپ فرماتے تھے "لوددت أني مت قبل هذا بعشرين سنة"۔ (الفتن نعیم بن حماد رقم ۱۷۰)

(کاش اس واقعہ کے بیس برس قبل ہی میرا انتقال ہو گیا ہوتا)۔

مولانا محترم! آپ کا استدلال بھی خوب ہے، کہیں حضرت ابن عباسؓ کے رونے اور اظہارِ افسوس کرنے سے حضرت علیؓ کے حق میں استحقاقِ خلافت ثابت کر دیتے ہیں اور کہیں حضرت عائشہؓ کے رونے سے ان کو ہی مجرم اور غلطی پر ثابت کر دیتے ہیں، آخر یہ دورخے نتائج کیوں؟ حضرت عائشہؓ کا رونا اگر ناحق پر ہونے کی وجہ سے ہے تو پھر حضرت علیؓ کا اس قدر افسوس کا اظہار کرنا آخر کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا آپ کی منطق کی رو سے وہ بھی باطل پر تھے؟۔

تنبیہ:

حضرت حسن اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان جو صلح ہوئی تھی، آنجناب اس سے راضی نہیں ہیں، مدرسہ ضیاء العلوم کی اپنی تقریر میں فرماتے ہیں کہ: ''یہ تو مجبوری کی صلح تھی، اور اس روایت کا تذکرہ صلح کے وقت فریقین میں سے کسی نے نہیں کیا، بس وہ روایت آ گئی''۔ حالانکہ "ان ابني هذا سيد ولعل الله أن يصلح به بين فئتين عظيمتين من المسلمين" صحیح طرق سے منقول ہے، علامہ ابن عبد البر نے استیعاب میں اور کتانی نے "نظم المتناثر من الحديث المتواتر" میں قرطبی کے حوالہ سے اس روایت کو متواتر قرار دیا ہے، ابن عبد البر کا قول ملاحظہ ہو:

"وتواترت الأحاديث الصحاح عن النبي ﷺ أنه قال لحسن بن علي: إن ابني

هذا سيد، وعسى الله أن يبقيه حتى يصلح به بين فئتين عظيمتين من المسلمين، رواه جماعة من الصحابة"۔

یہ روایت متعدد صحابہ سے منقول ہے بخاری وغیرہ میں موجود ہے (دیکھیں بخاری رقم حدیث ۲۷۰۴، ۳۶۲۹، ۳۷۴۶، ۷۱۰۹ - ترمذی ۳۷۷۳، ابوداؤد ۴۶۶۲، مسند احمد ۲۰۳۹۲،۲۰۴۴۸،۲۰۴۷۳،۲۰۴۹۹،۲۰۵۱۶)۔

مولانا سلمان صاحب اور انکار حدیث:

ائمہ سلف کا یہ شیوہ کبھی نہیں رہا کہ وہ پہلے سے ایک خود ساختہ نظریہ یا مفروضہ طے کر لیتے ہوں، پھر اس کی تائید میں ہر قسم کی روایت قبول کر لیتے ہوں، اور جو روایت ان کے خود ساختہ مفروضے کے خلاف آئے اس کو رد کر دیتے ہوں، اہلِ حق علماء اور محدثین عظام میں ایسا کوئی بھی موجود نہیں، اور ہو بھی کیسے سکتا ہے! یہ طریقہ نہایت بدبختی اور خیانت پر مبنی ہے، یہ تو منکرین حدیث کا شیوہ رہا ہے، اور ظاہر ہے کہ منکرین حدیث صرف وہ نہیں ہیں جو حدیث کو سرے سے حجت نہ تسلیم کرتے ہوں بلکہ منکرین حدیث میں وہ بھی شامل ہیں جو حدیث کو مانتے ہوں، احادیث سے استدلال بھی کرتے ہوں، ان کو پڑھتے اور پڑھاتے بھی ہوں لیکن اس سب کے باوجود وہ ان ہی روایات کو تسلیم کرتے ہوں جس سے ان کے باطل افکار و نظریات کی تائید ہوتی ہو، اور جو ان کی افکار و نظریات کے خلاف ہو اس کا انکار کر دیتے ہوں۔

کیوں کہ حسب ضرورت وہ ہر گری پڑی روایت کو تو اپنا لیتے ہیں کہ اس سے ان کے خود ساختہ نظریات کو کچھ سہارا میسر آ جاتا ہے، لیکن صحیح حدیث کو وہ پر کاہ کے برابر بھی حیثیت دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

افسوس کہ مولانا محترم اس قضیہ میں منکرین حدیث کی روش پر گامزن ہیں، ان کے اور منکرینِ حدیث کے طرز عمل میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا، اگر ایسا نہیں ہے تو حدیث "**إن ابني هذا سيد۔۔۔**" کو جہابذۂ محدثین کے نقل کرنے اور اس کی صحت پر متفق ہونے، اور بعض کے نزدیک حد تواتر تک پہنچنے کے باوجود قبول نہ کرنے سے آخر کون سی چیز مانع ہے؟۔

جنگِ جمل اور امام قرطبی کی حقیقت بیانی:

اس واقعہ کی مزید توضیح کی ضرورت تو نہیں تھی، لیکن مسک الختام کے طور پر امام قرطبیؒ کا ایک بیان جنگ جمل کے حوالہ سے اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں، اس سے واقعہ کی صحیح صورتحال پر روشنی پڑتی ہے، علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں:

"قال جلة من العلم: إن الواقعة بالبصرة بينهم كان على غير عزيمة منهم على الحرب،بل فجأة، وعلى سبيل دفع كل واحد من الفريقين عن أنفسهم لظنه أن الفريق الآخر قد غدر به، لأن الأمر كان قد انتظم بينهم وتم الصلح والتفرق على الرضا، فخاف قتلة عثمان رضی اللہ عنہ من التمكين منهم والإحاطة بهم، فاجتمعوا وتشاوروا واختلفوا،ثم اتفقت آراؤهم على أن يفترقوا فريقين، ويبدأ بالحرب سحرة فى العسكرين، وتختلف السهام بينهم،ويصيح الفريق الذى فى عسكر على:غدر طلحة والزبير،والفريق الذى فى عسكر طلحة والزبير:غدر على،فتم لهم ذلك على ما دبروه، ونشبت الحرب،فكان كل فريق دافعا لمكرته عند نفسه، ومانعا من الإشاطة بدمه، وهذا صواب من الفريقين، وطاعة لله تعالى إذ وقع القتال والامتناع منهما على هذه السبيل، وهذا هو السبيل، وهذا هو الصحيح المشهور، والله أعلم"۔ (تفسير القرطبى:۱۶/ ۳۱۸)

(اہلِ علم کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ بصرہ میں جو واقعہ پیش آیا یہ ایک اچانک اور غیر اختیاری طور پر پیش آیا، یہ ایک ناگہانی واقعہ تھا اس اعتبار سے کہ فریقن کے درمیان صلح ہو چکی تھی، تو ہر ایک فریق نے سمجھا کہ دوسرے فریق نے غداری کی ہے، حضرت عثمان کے قاتلین نے سمجھا کہ اگر صلح ہوگئی تو ان کی خیر نہیں پھر ان لوگوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ رات میں ایک جماعت علی کی فوج پر اور دوسری عائشہ کی فوج پر حملہ کرے اور ساتھ میں یہ نعرہ لگائیں کہ کہ فریق ثانی نے غداری کی ہے، اس طرح فریقن میں جنگ چھڑ گئی، لوگ اپنے دفاع کے لئے جنگ میں شریک ہو گئے، فریقین کی طرف سے اس میں جو کچھ ہوا صواب اور درست ہے، کیونکہ غیر اختیاری طور پر وہ جنگ میں ڈھکیل دئے گئے، یہی بات صحیح اور مشہور ہے)۔

قسط نمبر۔ ۲۳

مولانا محترم کا سوال:

''کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا کہ "ھلاك أمتي علی أيدی أغيلمة من قريش" اور حضرت ابوہریرہ "أعوذ بالله من إمارة الصبيان" اور پھر "أعوذ بالله من إمارة الستين" کی روایتیں نہیں نقل کرتے تھے؟ کیا روایتیں مفتی صاحب! بخاری میں نہیں پڑھیں، یہ کون لونڈے تھے جن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پناہ مانگتے تھے، کیا آپ بخاری کی ان حدیثوں کو مانتے ہیں؟ یا بنی امیہ کی محبت اس سے مانع ہے؟''۔

جواب: حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ھلاك أمتي علی يدی غلمة من قريش (بخاری ۷۰۵۸)

وفی رواية أبي هريرة قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول تعوذوا بالله من رأس السبعين وإمرة الصبيان۔

مصنف: ابن أبي شيبة ۳۷۲۵۵ وأحمد: ۸۳۰۲، قال الشيخ الألباني ضعيف (رقم ۶۴۶۱ ضعيف الجامع) مسند احمد کے محقق نے بھی اس کی تضعیف کی ہے۔

کیا مفتی صاحب یہ روایتیں بخاری میں نہیں پڑھیں:

جی پہلی روایت تو بخاری میں ہے لیکن دوسری اور تیسری حدیث تو بخاری میں کسی نے نہیں پڑھی کیا آپ نے پڑھی ہے؟ کیا آپ کے بخاری کے نسخہ میں یہ دونوں روایتیں ہیں؟

نہ جانے مجھے بار بار کیوں شبہ ہوتا ہے کہ استاذ محترم کے ساتھ کوئی بہت بڑا افراڈ ہوا ہے کہ کسی نے شیعی علماء کی کتاب آپ کو اہل سنت کہ کر تھما دی ہے اسی سے آپ نقل کرتے ہیں اور علماء اہل سنت کا حوالہ دے دیتے ہیں۔

ابن بطال فرماتے ہیں کہ ''اس حدیث کے معنی کی وضاحت ابو ہریرہ کی دوسری مرفوع

حدیث سے ہوتی ہے جس کو ابن ابی شیبہ نے مرفوعاً نقل کیا ہے: أعوذ بالله من إمارة الصبيان قالوا: وما إمارة الصبيان قال: إن أطعتموهم هلكتم أى فى دينكم وإن عصيتم أهلكوكم أى فى دنيا كم بإزهاق النفس أو بإذهاب المال أو بهما۔

ابن ابی شیبہ کی دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ بازار میں نکلتے تھے۔ ويقول "اللهم لا تدركني سنة ستين ولا إمارة الصبيان" وفى هذا الحديث إشارة إلى أن أول الأغليمة كان فى سنة ستين وهو كذلك فان يزيد بن معاوية استخلف سنة ستين وبقى إلى سنة أربع وستين فمات ثم ولى ولده معاوية ومات بعد أشهر۔ كذا فى الفتح تحت رقم بخارى ٧٠٥٨)۔

خلاصہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ جب لونڈوں اور کم عمروں کی حکومت آنے لگے تو اس وقت امت مسلمہ نہایت قتل وغارت گری سے دوچار ہوگی اور یہ دورِ حکومت یزید بن معاویہ کی خلافت سے شروع ہوتا ہے جو کہ ۶۰ ہجری کو خلیفہ بنا۔ اور حضرت ابو ہریرہ اس دور سے پناہ مانگتے تھے، چنانچہ وہ ۶۰ سے پہلے اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔

مولانا محترم!

ہم اس حدیث کو بھی مانتے ہیں اور دوسری احادیث کو بھی مانتے ہیں۔ اہل سنت والجماعت اہلِ کتاب یہود ونصاری کا سا معاملہ نہیں کرتے کہ "تؤمنون ببعض الكتاب وتكفرون ببعض" کا مصداق قرار پائیں، جیسا کہ آپ کا نہج ہے۔

ہم یہاں بخاری کی دوسری حدیث بھی نقل کرتے ہیں۔

قسطنطنیہ پر پہلا حملہ اور مغفرت کی بشارت:

امام بخاری رحمۃ اللہ (المتوفی: ۲۵۶) نے کہا:

حدثني إسحاق بن يزيد الدمشقي، حدثنا يحي بن حمزه، قال: حدثني ثور بن يزيد، عن خالد بن معدان، أن عمير بن الأسود العنسي، حدثه۔ أنه أتى عبادة بن الصامت وهو نازل فى ساحة حمص وهو فى بناء له، ومعه أم حرام، قال عمير،

فحدثتنا أم حرام: أنها سمعت النبی صلی اللہ علیه وسلم، یقول: أول جیش من أمتی یغزون البحر قد أوجبوا، قالت أم حرام: قلت، یا رسول اللہ أنا فیهم؟ قال: أنت فیهم، ثم قال النبی صلی اللہ علیه وسلم: أول جیش من أمتی یغزون مدینة قیصر مغفور لهم، فقلت: أنا فیهم یا رسول اللہ؟ قال: لا۔

عمیر بن اسود عنسی نے بیان کیا کہ وہ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ کے قیام ساحل حمص پر اپنے ہی ایک مکان میں تھا اور آپ کے ساتھ (آپ کی بیوی) ام حرام رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ عمیر نے بیان کیا کہ ہم سے ام حرام رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ میری امت کا سب سے پہلا لشکر جو دریائی سفر کر کے جہاد کے لیے جائے گا، اس نے (اپنے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت ومغفرت) واجب کر لی۔ ام حرام رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ میں نے کہا تھا یا رسول اللہ! کیا میں بھی ان کے ساتھ ہوں گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں، تم بھی ان کے ساتھ ہو گی، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کا پہلا لشکر جو مدینہ قیصر (قسطنطنیہ) پر حملہ کرے گا وہ سب کے سب مغفور (بخشے ہوئے) ہوں گے۔ میں نے کہا میں بھی ان کے ساتھ ہوں گی یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہیں۔ (صحیح البخاری، کتاب الجهاد والسیر، باب ما قیل فی قتال الروم: رقم: ۲۹۲۴)

بخاری کی اس حدیث میں یہ بشارت ہے کہ مدینہ قیصر (قسطنطنیہ) پر سب سے پہلے لشکر کشی کرنے والے سب مغفور (بخشے ہوئے) یعنی جنتی ہوں گے، اور اس پہلے حملہ کے امیر یزید تھے، یہ بھی بخاری ہی میں ہے۔ ملاحظہ ہو:

قال محمود بن الربیع: فحدثتها قوما فیهم أبو أیوب صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فی غزوته التی توفی فیها، ویزید بن معاویة علیهم بأرض الروم۔

محمود بن ربیع نے بیان کیا کہ میں نے یہ حدیث ایک ایسی جگہ میں بیان کی جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے، یہ روم کے اس جہاد کا ذکر ہے، جس میں آپ کی موت واقع ہوئی تھی، فوج کے سردار یزید بن

معاویہ تھے۔[صحیح البخاری، کتاب التہجد،باب صلاۃ النوافل جماعۃ، رقم:۱۱۸۶]

بخاری کی اس روایت میں پوری صراحت ہے کہ لشکر کے امیر یزید بن معاویہ تھے، اور بخاری کی اسی روایت میں یہ بھی صراحت ہے کہ یہ لشکر ''ارض روم'' (سرزمین روم) میں جہاد کررہا تھااوراس سے مراد قسطنطنیہ ہی ہے، کیونکہ بخاری کی یہی روایت بتلاتی ہے کہ ابوایوب الانصاری رضی اللہ عنہ اس غزوہ میں فوت ہوگئے تھے، اورابوایوب الانصاری رضی اللہ عنہ کی وفات غزوہ قسطنطنیہ ہی کے دوران ہوئی ہے، جیسا کہ بہت ساری صحیح روایات میں اس کی صراحت آئی ہے۔ مثلاً ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے:

''فلم يزل أبو أيوب يجاهد فى سبيل الله حتى دفن بالقسطنطنية''۔

ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ، اللہ کی راہ میں جہادکرتے رہے، حتی کہ قسطنطنیہ ہی میں دفن ہوئے۔(سنن ابی داؤد: ۳/ ۱۳ واسنادہ صحیح)

یہ روایت صاف بتلاتی ہے کہ جس آخری غزوہ میں ابوایوب الانصاری رضی اللہ عنہ فوت ہوئے وہ قسطنطنیہ کا غزوہ تھا، اور بخاری کی درج بالا حدیث میں صراحت ہے کہ اس غزوہ کے امیر یزید بن معاویہ تھے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ یزید بن معاویہ نے قسطنطنیہ پرحملہ کیااوراسی لشکرکشی اور جہاد کے سفر میں ابو ایوب الانصاری رضی اللہ عنہ فوت ہوئے۔

اس سے پہلے قسطنطنیہ پرکسی بھی حملہ کا کوئی ثبوت نہیں ملتا اس لئے بخاری وغیرہ کی اس روایت سے ثابت ہوا کہ یزید بن معاویہ ہی کی امارت میں مدینہ قیصر (قسطنطنیہ) پرسب سے پہلے حملہ ہوا۔

بعض لوگ کچھ غیرمتعلق اورجھوٹی روایات پیش کرکے کہتے ہیں کہ قسطنطنیہ پریزید کے حملہ سے پہلے بھی حملہ ہوا، یہ ساری روایات ایک توغیرمتعلق ہیں، نیزان میں سے بیشترغیرمتعلق ہونے کے ساتھ ساتھ من گھڑت اورجھوٹی ہیں، حقیقت یہی ہے کہ یزید سے پہلے قسطنطنیہ پرکسی حملہ کا قطعاً کوئی ثبوت نہیں ہے۔

بخاری کی شارح حافظ ابن حجررحمہ اللہ نے اس پرپوری امت کا اتفاق نقل کیاہے کہ یزید

بن معاویہؓ ہی کی امارت میں سب سے پہلے مدینہ قیصر (قسطنطنیہ) پر حملہ ہوا، ملاحظہ ہو:

☆ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ (المتوفی: ۸۵۲) نے کہا:

فإنه (يزيد) كان أمير ذلك الجيش بالاتفاق۔

یزید پہلے لشکر کا امیر تھا، اس پر سب کا اتفاق ہے [فتح الباری: ۶/ ۱۰۳]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے قول کی روشنی میں اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ سب سے پہلے جس لشکر نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا اس کے امیر یزید بن معاویہؓ تھے۔ اس اجماع کے خلاف نہ تو کسی کا کوئی قول ثابت ہے اور نہ ہی اس کے خلاف کوئی صحیح روایت موجود ہے۔

الغرض یہ کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حدیث میں جس لشکر کو مغفور و بخشا ہوا کہا ہے، یزید بن معاویہؓ نہ صرف یہ کہ اس لشکر میں شریک تھے بلکہ اس لشکر کے امیر بھی تھے، اس سے یزید بن معاویہ کی زبردست فضیلت ثابت ہوتی ہے، چنانچہ بہت سارے علماء نے یزید بن معاویہ کو اس حدیث کا مصداق بتلاتے ہوئے یزید کی فضیلت بیان کی ہے چنانچہ:

☆ امام مہلب بن احمد اسدی (۴۳۵ھ) رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"من هذا الحديث ثبتت خلافة يزيد وفيه أنه من أهل الجنة. وفى هذا الحديث منقبة لمعاوية لأنه أول من غزا البحر ومنقبة لولده يزيد لأنه أول من غزا مدينة قيصر"

اس حدیث سے یزید کی خلافت ثابت ہوتی ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ جنتی ہے نیز اس حدیث میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی منقبت ہے کیونکہ سب سے پہلے انہوں نے سمندری لڑائی لڑی اور ان کے لڑکے یزید کے لئے بھی منقبت ہے کیونکہ یزید ہی نے سب سے پہلے مدینہ قیصر (قسطنطنیہ) پر حملہ کیا۔ [**فتح الباری لابن حجر ۶/۱۰۲**]۔

☆ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (المتوفی: ۷۲۸) نے کہا:

ولهذا كان الصحابة رضى الله عنهم، يغزون مع يزيد وغيره. فإنه غزا القسطنطنية فى حياة أبيه معاوية۔ رضى الله عنه۔ وكان معهم فى الجيش أبو أيوب الأنصارى رضى الله عنه۔ وذلك الجيش أول جيش غزا القسطنطنية۔ وفى

صحیح البخاری عن ابن عمر - رضی الله عنهما، عن النبی صلی الله علیه وسلم - أنه قال: "أول جیش یغزو القسطنطنیة مغفور لهم"۔

اسی لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یزید وغیرہ کے ساتھ جہاد کرتے تھے، چنانچہ یزید نے اپنے والد معاویہ کی زندگی میں قسطنطنیہ پر حملہ اور اس کے ساتھ لشکر میں ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔ اور یہ پہلا لشکر تھا جس نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا اور صحیح بخاری میں ابن عمر (صحیح ام حرام) رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کا پہلا لشکر جو مدینہ قیصر (قسطنطنیہ) پر حملہ کرے گا وہ سب کے سب مغفور (بخشے ہوئے) ہوں گے۔ [منهاج السنۃ النبویۃ: ۴/ ۵۴۴]

☆امام ابن کثیر رحمہ اللہ (المتوفی: ۷۷۴) نے کہا:

وقد کان یزید أول من غزا مدینة قسطنطنیة فی سنة تسع واربعین فی قول یعقوب بن سفیان وقال خلیفة بن خیاط سنة خمسین ثم حج بالناس فی تلك السنة بعد مرجعه من هذه الغزوة من أرض الروم وقد ثبت فی الحدیث أن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال أول جیش یغزو مدینة قیصر مغفور لهم۔

یزید ہی نے سب سے پہلے قسطنطنیہ کے شہر پر حملہ کیا۔ یہ حملہ یعقوب بن سفیان کے بقول ۴۹ھ میں ہوا اور خلیفہ خیاط کے بقول ۵۰ھ میں ہوا۔ پھر اس حملہ سے لوٹنے کے بعد اسی سال لوگوں کا امیر بن کر اس نے حج کیا، اور صحیح بخاری کی حدیث سے ثابت ہے کہ میری امت کا پہلا لشکر جو مدینہ قیصر (قسطنطنیہ) پر حملہ کرے گا وہ سب کے سب مغفور (بخشے ہوئے) ہوں گے۔ [البدایۃ والنهایۃ، مکتبۃ المعارف: ۸/ ۲۲۹]

☆امام قسطلانی (المتوفی: ۹۳۳) فرماتے ہیں:

وكان أول من غزا مدینة قیصر یزید بن معاویة ومعه جماعة من سادات الصحابة كابن عمرو بن عباس وابن الزبیر وأبی أیوب الأنصاری وتوفی بها سنة اثنتین وخمسین من الهجرة. واستدل به المهلب علی ثبوت خلافة یزید وأنه من أهل الجنة لدخوله فی عموم قوله مغفور له۔

مدینۂ قیصر پر سب سے پہلے جس نے حملہ کیا وہ یزید بن معاویہؓ ہے اس کے ساتھ جلیل القدر صحابہ کی جماعت تھی جیسے عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس وعبداللہ بن زبیر اور ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہم۔ اور ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ یہیں پر ۵۲ھ ہجری میں فوت ہوئے، اور اس حدیث سے مہلب نے یزید کی خلافت پر استدلال کیا ہے اور اس بات پر کہ یزید اہلِ جنت میں سے ہے۔[اِرشادالساری لشرح صحیح البخاری: ۵/ ۱۰۴]

☆ نواب صدیق حسن خان فرماتے ہیں:

استدل به على خلافة يزيد، وأنه من أهل الجنة۔

اس حدیث سے یزید کی خلافت پر استدلال کیا گیا ہے اور اس بات پر کہ یزید اہل جنت میں سے ہے۔(عون الباری ۴/ ۳۹۱)

مولانا محترم!

آپ بخاری کی اس حدیث کو مانتے ہیں۔ یا بنی اُمیہ کی دشمنی آپ کو اس حدیث کو قبول کرنے سے مانع ہے؟؟

یزید کے مذمت کے بارے میں اگر کوئی روایت ثابت ہے تو دوسری روایت بھی بلا شبہ ثابت ہے۔

اسی لئے امام ذہبی نے فرمایا:

"له على هناته حسنة وهي غزوة القسطنطنية وكان أمير ذلك الجيش وفيهم مثل أبي أيوب الأنصاري"۔ (سير أعلام النبلاء، ۴/ ۳۶)

یعنی یزید کی کوتاہیوں اور غلطیوں کے باوجود اس کی نیکی کا پہلو غالب ہے۔

اور اس کی مثالیں حدیث میں دوسری جگہ بھی موجود ہیں، حضرت حاطب بن ابی بلتعہ بدری صحابی تھے، لیکن مسلمانوں کے خلاف جاسوسی کے جرم میں ملوث ہو گئے، جس کی سزا موت تک ہوسکتی تھی۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وما يدريك لعل الله اطلع على اهل بدر، فقال اعملوا ما شئتم فقد غفرت لكم" دیکھیں بخاری حدیث ۴۸۹۰ و مسلم ۲۴۹۴)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم مربی واستاذ تھے اس لئے تعریف بھی فرماتے تھے تو کبھی عتاب بھی

فرماتے تھے۔حضرت علی نے ابوجہل کی بیٹی کو نکاح کا پیغام دیا،حضرت فاطمہ کو معلوم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور فرمایا: يزعم قومك أنك لا تغضب لبناتك وهذا على ناكح بنت أبي جهل فقام رسول الله صلى الله عليه وسلم فسمعته حين تشهد يقول: أما بعد! أنكحت أبا العاص بن الربيع، فحدثني وصدقني وإن فاطمة بضعة مني وإني أكره أن يسوؤها والله لا تجمتع بنت رسول اللهﷺ وبنت عدو الله عند رجل واحد فترك على الخطبة (البخاری:۳۵۲۳)

مولانا محترم!

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم با قاعدہ خطبہ دیا،اور اعلانیہ شدید عتاب فرمایا اور یہاں تک فرما دیا کہ اگر علی چاہیں تو میری بیٹی کو طلاق دیدیں،اور ابوجہل کی بیٹی سے شادی کرلیں،اس شدید عتاب کے بعد کیا حضرت علی کے سارے ثابت شدہ فضائل پر آپ پانی پھیر دیں گے؟؟۔

قسط نمبر-۲۴

مولانا محترم کا سوال:

''جریر بن عبداللہ بجلی کو جب حضرت علی نے معاویہ کے پاس بطور سفیر بھیجا، ان کے علاوہ بار بار کبار صحابہ کو سمجھانے کے لئے بھیجا تو ان کا کہنا تھا کہ شام کی حکومت میرے حوالہ کر دیں، تو میں جنگ بند کر دوں گا، یہ سب بیانات مفتی صاحب! آپ کے جمہور کے سرنام علماء، طبری ابن کثیر اور ذہبی جیسے حضرات محدثین کے ہیں۔

جنگ جمل جیتنے کے بعد جب خلیفہ راشد نے جنگ جیت لی اور آپ کی فوجیں شام میں داخل ہونے لگیں تو نیزوں پر قرآن کس نے بلند کیا تھا؟ اور کیوں کیا تھا؟

خلیفہ راشد جب تحکیم کے لئے تیار ہو گئے، اور ابو موسیٰ اشعری کو اپنا نمائندہ بنایا، اور معاویہ نے عمرو بن العاص کو تو طے شدہ بات سے کون مکر گیا تھا؟ کس کو حضرت ابو موسیٰ نے جھوٹا اور دھوکہ باز کہا تھا؟ اور بے انتہا شرمندگی سے پھر ابو موسیٰ حضرت علی کے سامنے نہیں آسکے تھے، اور مکہ مکرمہ چلے گئے تھے؟''۔

جواب:

مولانا محترم کا ارشاد ہے کہ حضرت معاویہؓ نے حکومت کا مطالبہ کیا تھا، اور گویا مشاجراتِ صحابہ کا بنیادی سبب یہی حکومت کی حرص اور جاہ ومنصب کا حصول ہے، یہ حضرات صحابہ اور خاص طور پر حضرت علیؓ وحضرت معاویہؓ پر نہایت بدترین الزام ہے، ہم نے بار بار صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ صحابہ کرام میں سے جن حضرات نے بھی جدال وقتال میں حصہ لیا، اور جس جماعت میں بھی ان کی شمولیت رہی، ان کے اجتہاد کے مطابق وہی موقف درست اور وہی جماعت حق وعدل پر قائم جماعت تھی، اب ان کے درمیان ثالث وفیصل بننے کا حق کسی کو نہیں، اس کا حقیقی فیصلہ تو رب العزت کی ذات پر منحصر ہے، البتہ امت مسلمہ کا عقیدہ یہ ہے صحابہ سب مغفور وعدول ہیں،

اِن جنگوں کی وجہ سے کسی کی ذات کو متہم کرنا یا کسی کے صدق و اخلاص پر نکتہ چینی کرنا جائز نہیں، مولانا محترم نے آخر کس کتاب میں دیکھ لیا، اور پتہ نہیں کون سی وحی آئی کہ حضرت معاویہؓ نے حکومت کا مطالبہ کیا، ہمیں تو ہر کتاب میں ان کا یہی دعوی اور مطالبہ ملتا ہے کہ حضرت علیؓ قاتلین عثمانؓ سے انتقام لیں ہم ان کو امیر المؤمنین بنانے کے لیے تیار ہیں، تاریخ وسیر کی تمام معتبر کتابوں میں یہی بیانات ملتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے مشہور صحابی حضرت جریر بن عبداللہ کو خط دے کر حضرت معاویہ کے پاس بھیجا کہ مہاجرین وانصار نے ہماری بیعت کر لی ہے، اور جنگ جمل بھی اسی معاملہ میں ہو چکی ہے، اس لئے آپ بھی بیعت کر لیں، اس پر حضرت معاویہؓ نے حضرت عمرو بن العاص اور شام کے اہل حل وعقد کو بلا کر مشورہ کیا، مشورہ میں یہ بات طے پائی کہ حضرت علیؓ خود یا تو قاتلینِ عثمان سے قصاص لیں یا پھر انہیں ہمارے حوالہ کر دیں۔

اگر حضرت علیؓ ان دونوں شرطوں میں سے کسی ایک شرط کو مان لیتے ہیں، تو ٹھیک، ورنہ اہل شام بیعت نہ کریں گے اور حضرت عثمان کے قاتلوں کو انجام تک پہنچا کر ہی چین کا سانس لیں گے علامہ ابن کثیرؒ کا بیان ملاحظہ فرمائیں:

علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

"وبعثه (ای جریر) و کتب معه کتاباً إلى معاوية يعلمه باجتماع المهاجرين والأنصار على بيعته ويخبره بما كان وقعة الجمل ويدعوه إلى الدخول فيما دخل فيه الناس، فلما انتهى إليه جرير بن عبدالله أعطاه الكتاب فطلب معاوية عمرو بن العاص ورؤوس أهل الشام فاستشارهم فأبوا أن يبايعوا حتى قتل قتلة عثمان، أو أن يسلم إليهم قتلة عثمان، وإن لم يفعل قاتلوه، ولم يبايعوه حتى يقتل قتلة عثمان بن عفان رضی الله عنه۔ (البداية والنهاية:۲۳۵/۷)

(انہوں نے (جریر) کو بھیجا اور معاویہ کے نام ان کو ایک خط لکھ کر دیا جس میں اس بات کا ذکر تھا کہ مہاجرین وانصار ان کی بیعت پر متفق ہیں، اور جنگ جمل میں جو پیش آیا اس کے بارے بتایا، اور لوگوں نے جس امر کو قبول کر لیا ہے اسے قبول کرنے کی دی، جب جریر بن عبداللہ ان کے پاس پہنچے اور ان کا خط حوالہ کیا تو حضرت معاویہؓ نے عمرو بن العاصؓ اور شام کے عمائدین

کوطلب کیااوران سے مشورہ کیا تو سب نے قاتلین عثمان سے بدلہ لینے سے پہلے بیعت کرنے سے انکارکردیا، یا کہ حضرت علیؓ قاتلین عثمان کو ان کے حوالہ کردیں، اوراگر وہ ایسا نہیں کریں گے توان سے جنگ کریں گے،اورقاتلین عثمان کوقتل کرنے سے پہلے وہ بیعت نہیں کریں گے)۔

ابومسلم خولانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی رفع نزاع باہمی کی سعی فرمائی لیکن ان کی کوششیں ناکام رہیں،علامہ ذہبی کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیں:

جاء أبو مسلم الخولاني، وأناس إلى معاوية، وقالوا: أنت تنازع عليا أم أنت مثله؟ فقال لا والله إني لأعلم أنه أفضل مني، وأحق بالأمر مني ولكن ألستم تعلمون أن عثمان قتل مظلوماً وأنا ابن عمه والطالب بدمه فأتوه، فقولوا له فليدفع إلى قتلة عثمان وأسلم له فأتوا عليا فكلموه فلم يدفعهم إليه۔

(دیکھیں سیر اعلام النبلاء ۱۴۰/۳۔وتاریخ الاسلام للذھبی ۵۴۰/۳)۔

(ابومسلم خولانی ایک جماعت کے ساتھ حضرت علی کے پاس آئے،اور فرمایا کہ آپ حضرت علیؓ کی مخالفت کرتے ہیں،کیا آپ ان کے ہم پلہ ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ نہیں، بخدا وہ مجھ سے افضل ہیں،اور خلافت کے معاملہ میں مجھ سے بہتر اور زیادہ مستحق ہیں،لیکن تم لوگ نہیں جانتے کہ عثمان مظلوماً قتل کئے گئے ہیں،اور میں ان کا چچازاد بھائی ہوں،اور ان کے خون کا طالب ہوں،تو ان کی پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ وہ قاتلینِ عثمان کو میرے حوالہ کردیں، میں بیعت کرلوں گا ان لوگوں نے حضرت علیؓ سے بات کی،لیکن حضرت علیؓ راضی نہیں ہوئے)۔

مولانا محترم! اوپر ہم نے امام ذہبی اور ابن کثیر کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ حضرت امیر معاویہ نے قصاص عثمان کا مطالبہ کیا تھا نہ کہ ملک شام کا، پتہ نہیں کیوں آپ حضرت معاویہ کو بدنام کرنے کے لئے علمائے اہل سنت پر جھوٹ باندھتے ہیں؟ کیا واقعی آپ کے پاس ان کے یہ بیانات ہیں؟ یا پھر وہ کوئی اور ذہبی اور ابن کثیر ہیں؟

مولانا محترم!

اہل سنت کے سرنام علماء کیا جھوٹے علمائے شیعہ کے یہاں بھی یہ بات مسلم ہے، شرح نهج البلاغة لابن الحديد ۱۷۸/۳۔ پر حضرت معاویہؓ سے منقول ہے: "وأما الخلافة

فلسنا نطلبها"

(خلافت کی جہانتک بات ہے تو ہم اس کے طالب نہیں ہیں)۔

اور حضرت معاویہؓ کا یہ مطالبہ کسی ظلم و جور، طمع و حرص کے بنیاد پر نہیں تھا بلکہ حضرت علیؓ کے افواج میں حضرت عثمان کے قاتلین موجود تھے، اس وجہ سے تھا "حجة معاوية ومن معه مع وقع من قتل عثمان مظلوماً، ووجود قتلته بأعيانهم في العسكر العراقي"۔

(فتح الباری ۱۳/ ۲۴۶)

(حضرت معاویہؓ اور ان کے رفقاء کی دلیل یہ تھی کہ حضرت عثمانؓ مظلوم قتل ہوئے ہیں اور ان کے قاتلین حضرت علی کی فوج میں شامل ہیں)۔

اور حضرت علی کی دلیل یہ تھی کہ ان کو مہاجرین اور انصار نے خلیفہ منتخب کیا ہے اس لئے پہلے سب لوگ بیعت کرلیں، پھر حاکم کی عدالت میں یہ معاملہ پیش کیا جائے، دوسری بات یہ بھی تھی قاتلین عثمان اس قدر حضرت علی کے فوج میں داخل ہو گئے تھے کہ حضرت علی کے لئے ان سے قصاص لینا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔

فقال يدخل في البيعة ويحا كمهم إلى فامتنع معاوية۔ (فتح الباری ۱۳/ ۸۶)

ان کے نزدیک قتال لازم تھا، چونکہ حضرت معاویہ باغی تھے، "إذ حجة علي ومن معه ما شرع لهم من قتال أهل البغي"۔ (الفتح ۱۱/ ۲۴۶)

تنبیہ: ہزار برس بعد کسی جنگ کی حقیقی وجوہات کی نشاندہی کرنا اور کتب خانہ میں بیٹھ کر کسی کے حق میں فیصلہ صادر کر دینا، کسی کو ظالم اور کسی کو عادل ثابت کرنا بہت آسان ہے، لیکن فی الواقع میدانِ کارزار میں پیش آمدہ نوعیت اور بہتر صورتحال کو سمجھ لینا اور اس کے مطابق فیصلہ لینا اتنا ہی مشکل ہے، اور خاص طور پر اس صورت میں کہ معاملہ پیچ در پیچ ہو، مسائل بہت زیادہ الجھے ہوئے ہوں، واضح رہے کہ یہ کوئی عام فتنہ نہیں تھا، بلکہ یہ وہ فتنہ تھا جس کے بارے میں عالم اسلام ہی نہیں بلکہ تاریخِ عالم کے کبار مدبروں وحکمرانوں سے ایک (یعنی حضرت عمر) کو خوف تھا انھوں نے ایک بار صحابہ سے دریافت کیا کہ أيكم يحفظ قول رسول الله صلى الله عليه وسلم في الفتنة؟ فقال حذيفة أنا أحفظ كما قال........ قال (عمر) ليست هذه ولكن

التي تموج كموج البحر، قال یا أمیر المؤمنین لا بأس علیك منها۔ (بخاری رقم الحدیث ۳۵۸۶۔ مسلم رقم الحدیث: ۱۴۴)۔

(ایک بار حضرت عمرؓ نے صحابہ سے دریافت کیا کہ فتنے کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کسے یاد ہے؟ حضرت حذیفہؓ نے کہا مجھے یاد ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا اس فتنے کے بارے میں سوال کر رہا ہوں جو سمندر کی موجوں کی طرح ٹھاٹھیں مارتا ہوگا، تو حضرت حذیفہؓ نے کہا کہ امیر المؤمنین! آپ کو اس فتنہ سے کوئی نقصان نہ پہنچے گا)۔

ایسے عظیم فتنہ میں حق گڈ مڈ ہوجاتا ہے، اور اس حق تک رسائی بڑے بڑے مدبروں کے لئے بھی آسان نہیں رہتی، اور اچھے اچھوں کی عقلیں حیران رہ جاتی ہیں، ایسی صورتحال میں کسی جماعت مسلم کو تنقید وطعن کا نشانہ بنانا بہت بڑی جسارت اور حماقت کی بات ہے۔

نیزوں پر کس نے قرآن بلند کیا تھا اور کیوں؟

قسط نمبر ۹ میں ہم ثابت کرچکے ہیں کہ قصۂ تحکیم میں قرآن مجید کو نیزوں پر اٹھائے جانے والی روایت ابومخنف کے حوالہ سے آئی ہے اور یہ راوی جلا بھنا شیعہ ضعیف بلکہ متروک ہے اس کا یہ بیان کوئی بھی منصف مزاج مؤرخ قبول نہیں کرتا، پتہ نہیں مولانا محترم کو ایسے شیعہ راوی کی روایت پر کیوں کر اعتماد ہوا؟۔

حضرت ابوموسی اشعریؓ اور ان کی سادہ لوحی:

حضرت ابوموسیٰ اشعری جلیل القدر صحابی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو زبید و عدن پر عامل اور والی بنایا تھا، اور حضرت عمر نے اپنے عہد خلافت میں آپ کو بصرہ اور کوفہ کا والی بنایا، حضرت علیؓ کی جانب سے وہ واقعۂ تحکیم میں حکم بنائے گئے، وہ نہایت تجربہ کار اور سیاسی سمجھ بوجھ رکھنے والے صحابی تھے، اسی لئے ان کو عہد نبوی وراشدی میں مختلف ذمہ داریاں سپرد کی گئیں، اور انہوں نے نہایت قابلیت اور مہارت سے ان ذمہ داریوں کو نبھایا، ایسے سمجھدار اور فطری صلاحیت کے مالک اور امارت ولایت کا طویل تجربہ رکھنے والے شخص کو واقعۂ تحکیم میں ایک سادہ

لوح، صوفی بزرگ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے، اور حضرت عمرو بن العاص جن کی خدمات کا تذکرہ سابق میں گزر چکا ہے، ان دونوں بزرگوں کے درمیان جو مکالمہ واقعۂ تحکیم کے فیصلے کے بعد بیان کیا گیا ہے، وہ مکالمہ ایسا ہے جیسے اوباش قسم کے غنڈے آپس میں ہم کلام ہوں، اس قسم کی جتنی روایات ہیں ان کا مدار ابو مخنف متروک راوی اور ابو جناب کلبی کذاب سے منقول ہیں، یہ سب اس لئے تا کہ حضرت معاویہؓ اور ان کی جماعت کو طعن و تنقید کا نشانہ بنایا جا سکے، ان عقل کے دشمنوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ اپنی ان غلط بیانیوں کے ذریعہ وہ صرف حضرت معاویہؓ ہی نہیں بلکہ حضرات شیخینؓ و ذاتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اتہام عائد کر رہے ہیں، کہ نعوذ باللہ کیسے نااہل کو انہوں نے منصب اور عہدہ سپرد کر دئے، اور خود حضرت علیؓ کے نادان دوستوں نے ان کو بھی کٹگھرے میں کھڑا کر دیا کہ ایسے صوفی منش اور سادہ لوح انسان کو انہوں نے واقعۂ تحکیم میں حکم کی ذمہ داری سپرد کر دی۔ سچ کہا ہے کہ کسی نے کہ ''نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہے''۔

تعجب خیز امر ہے کہ مولانا محترم کو دعوی ہمہ دانی ہے، اور فنِ حدیث اور علم جرح و تعدیل میں تو خود کی امامت کا عقیدہ رکھتے ہیں، اور کسی دوسرے کو لب کشائی تک کی اجازت دینے کے روادار نہیں، اس سب کے باوجود ان کو ایسے قصہ گو، دروغ بیان شیعی کی روایات پر یقین کیسے آیا؟ اور اس پر انہوں نے اعتماد کیسے کر لیا، ایسی بے سروپا تاریخی روایات نے ان کے نزدیک مسلمات و عقائد کی حیثیت کیسے حاصل کر لی؟ جبکہ وہ خود اپنے رسالہ ''شیعیت، سنیت اور ناصبیت'' میں لکھتے ہیں کہ:

''ہمیں اس سے بحث نہیں کہ کس مؤرخ نے کیا لکھا، ہمارے سامنے احادیث نبویہ، اقوال صحابہؓ اقوال ائمہ مجتہدین، اور اقوال ائمہ مجددین و مصلحین ہیں،؟ جن کے مقابلہ میں تاریخ کی کتابوں اور ان کی روایتوں کی کوئی حیثیت نہیں، اور ان کے مطالعہ اور تجزیہ کی ضرورت ہے، نہ نظر ثانی و ثالث کی''۔

ہم بھی مولانا محترم سے یہی کہتے ہیں کہ ہمارے سامنے قرآن کریم، احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، آثار صحابہؓ اور اقوال ائمہ کرام اور عقائدِ ائمہ عظام و مصلحین امت ہیں، ایسے تاریخی بیانات کی ہمارے نزدیک پرِ کاہ کے برابر بھی حیثیت نہیں جس سے صحابہ جیسے گروہِ مقدس سے بد گمانی ہوتی ہو۔

قسط نمبر- ۲۵

استاد محترم مولانا سید سلمان حسینی صاحب نے اپنے رسالہ ''صحابہ'' میں لکھا تھا کہ

''لاتسبوا أصحابي'' آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اصطلاحی صحابی (یعنی حضرت خالد بن ولید) سے اصل صحابی (یعنی عبدالرحمن بن عوف) کے بارے میں فرمایا تھا''۔

اس کے جواب میں مفتی عتیق صاحب نے اپنے رسالہ ازالہ ص ۲۱ پر تحریر کیا تھا کہ

''موصوف کا پورا رسالہ پڑھنے کے باوجود قاری کے لئے یہ جاننا مشکل ہے کہ ان کے یہاں سے صحابی کی تعریف کیا ہے؟ انھوں نے صحابی کی تعریف میں بعض شاذ آراء نقل کی ہیں، کاش کہ انھوں نے اِنہیں شاذ آراء میں سے کسی کو اختیار کر کے صراحت کر دی ہوتی کہ یہ تعریف میرے نزدیک صحیح اور معتبر ہے۔

جہاں تک میں (مفتی عتیق صاحب) نے ان کے زیر بحث رسالہ سے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت خالد بن ولید اور معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما تو بلا شبہ ان کے نزدیک صحابت کے زمرے سے خارج ہیں۔ اسی طرح وہ تمام صحابہ جنہوں نے جنگ صفین میں حضرت معاویہ کا ساتھ دیا اور ان کی طرف سے قتال کیا وہ تمام لوگ صحابہ کی فہرست سے خارج ہیں''۔

راقم عرض کرتا ہے کہ

استاد محترم جناب حسینی صاحب!

جب آپ نے یہ تحریر کیا ہے کہ ''لا تسبو أصحابي''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصطلاحی صحابی سے اصل صحابی کے بارے میں فرمایا تھا''۔تو اگر مفتی صاحب نے یہ سمجھا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو آپ صحابی نہیں سمجھتے تو اس میں اتنا خفا ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ مفتی صاحب کی اس نتیجہ خیزی سے آپ اتنا پریشان کیوں ہیں؟ ویسے آپ کہہ سکتے تھے کہ مفتی صاحب نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ آپ کے منشاء کے مطابق نہیں یا زیادہ سے زیادہ آپ پر یہ ان کی

تہمت ہے۔

آپ کے دونوں رسالے ''صحابہ'' اور ''ازالہ کے ازالہ'' دونوں میں آپ کا اسلوبِ نگارش اتنا مبہم و غامض ہے کہ ہر قاری اس کے مطالعہ کے بعد وہی نتیجہ اخذ کرے گا جو مفتی صاحب نے اخذ کیا ہے، آپ کی تحریر ہی کیا آپ کی تقریر بھی کچھ اسی قسم کی ہوتی ہے، آپ جو کہتے ہیں سامع وقاری کا اخذ کردہ مفہوم آپ کے مطلوبہ مفہوم سے جدا ہی ہوتا ہے، اس سب کے باوجود آپ کو اپنی خطابت وتحریری عبقریت پر ناز بھی ہے!! یاللعجب۔

آخر کیا وجہ ہے کہ سب سے زیادہ آپ ہی کو وضاحتیں جاری کرنی پڑتی ہیں؟ اور اخبارات آخر آپ ہی کے بیان کو توڑ مروڑ کر کیوں بیان کرتے ہیں؟۔

استادِ محترم! حدیث اور علوم الحدیث آپ کا خاص موضوع ہے، جس میں آپ کی مہارت کا اظہار آپ کے دونوں رسالوں کی سطر سطر سے ہو رہا ہے، آپ تو ہر فن مولیٰ آدمی ہیں، فقہ میں بھی آپ نے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

مولانا عتیق صاحب کی عبارت پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت خالد بن ولید صحابی جلیل ہیں ان کے بارے میں بخاری کی صحیح احادیث کے حوالہ سے میں نے وضاحتیں کی ہیں، اگر ان روایتوں میں ان کے ساتھ بے ادبی ہے تو اس کے مجرم آپ کے نزدیک امام بخاری ہیں، آپ نے ان کے بارے میں مجھ پر جو الزام تراشی کی ہے، یہ شرعی اصطلاح میں قذف کا جرم ہے، اسلامی عدالت ہوتی تو آپ پر ۸۰ کوڑے لگتے''۔ (ازالہ کا ازالہ)

اسلامی عدالت ہوتی تو آپ کو ۸۰/کوڑے لگتے؟

کیا آپ کے نزدیک مفتی صاحب کا یہ عمل قذف میں شامل ہے؟ حضور والا عنایہ شرح ہدایہ میں قذف کی تعریف ان الفاظ میں ہے "والقذف فی اللغة الرمی، وفی الشرع نسبة من أحصن إلی الزنا صریحاً أو دلالة" کیا ہر تہمت کو شرعی اصطلاح میں ''قذف'' کہہ سکتے ہیں؟ یا آپ کی شرعی اصطلاح بھی الگ ہے؟ اگر نہیں تو کیا مفتی صاحب نے آپ کی طرف دلالۃ یا صراحۃ زنا کی نسبت کی ہے؟

اس طرح اگر اصطلاحاتِ شرعیۃ کا بے محابا استعمال کیا گیا تو شریعت بازیچۂ اطفال بن جائے گی، جب جس کا جو دل چاہے وہ مفہوم اخذ کرے گا۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ شرعی اصطلاحات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح انداز میں بیان کر دیا ہے، ان سے وہ وہی معنی مراد ہوں گے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہیں، ان کے علاوہ دوسرے معنی میں ان اصطلاحات کا استعمال کرنا رسول کی مخالفت ہے۔ (مجموع الفتاوی: ۷/۲۸۶)

مجھے بھی جو بات سمجھ میں آ رہی ہے کہ کم از کم حضرت امیر معاویہ وعمرو بن العاص اور ان کے رفقاء آپ کے نزدیک صحابی نہیں بلکہ منافق ہیں، یہ سمجھنے کی تین وجوہات ہیں:

۱۔ آپ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے بارے میں تو یہ صاف کر دیا کہ وہ آپ کے نزدیک صحابی جلیل ہیں، لیکن حضرت معاویہ اور عمرو بن العاص کے بارے میں کوئی انکار نہیں فرمایا یعنی آپ نے مفتی صاحب کے الزام پر مہر تصدیق ثبت کر دی، اور آپ نے ان کے بارے میں صراحت نہ کر کے گویا خود اعتراف کر لیا۔

۲۔ آپ نے ان دونوں بزرگوں کے لئے کہیں بھی ''حضرت'' یا ''رضی اللہ عنہ'' جیسے تعظیمی دعائیہ کلمات استعمال نہیں کئے، جیسا کہ عام مسلمان کا شعار ہے کہ وہ صحابہ کے ساتھ حضرت اور رضی اللہ عنہ کے کلمات کا استعمال کرتے ہیں۔

۳۔ اپنے دونوں رسالوں میں ان دونوں بزرگوں کو آپ نے ہدفِ ملامت اور طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا ہے۔

اور سچ پوچھئے تو صحابہ کی متعینہ ومعروف تعریف پر آپ نے شکوک وشبہات اسی لئے قائم فرمائے ہیں تا کہ ان حضرات صحابہ پر طعن وتنقید کی راہ ہموار ہو سکے، یہ الگ بات ہے کہ خود کوئی تعریف پیش نہیں کر سکے۔ اور اس کا راز بھی یہ ہے کہ اگر آپ کوئی تعریف اختیار کرتے تو اس تعریف کی رو سے یہ دونوں صحابی ثابت ہو جاتے اور وہ آپ کو منظور نہیں اس لیے آپ نے تشکیک کی اور تعریف گول کر گئے۔

۱۔ حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کی جس کی بشارت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو دی تھی۔

إن ابنی هذا سید لعل الله أن یصلح به بین فئتین عظیمتین من المسلمین۔ (بخاری ۲۷۰۴)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضرت معاویہؓ اور عمروؓ بن العاص وغیرھم مسلمان ہیں۔

تنبیہ: مولانا محترم نے ضیاء العلوم کی تقریر میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ یہ مجبوری کی صلح تھی اور اس کی دلیل یہ تھی کہ صلح کے وقت یہ حدیث کسی نے نہیں بیان کی۔

ہم نے سابقہ قسطوں میں احادیث صحیحہ کی روشنی میں ان دونوں (حضرت معاویہؓ وحضرت عمروؓ بن العاص) کی صحابیت اور ان کے فضائل روایات صحیحہ کی روشنی میں بیان کئے ہیں، اسی طرح حضرت حسنؓ کے ذریعہ وجود میں آنے والی اس صلح عظیم والی روایت کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ روایت بخاری کی ہے، اور اس کی صحت میں کسی قسم کا اشکال نہیں ہے، لیکن اس سب کے باوجود مولانا محترم کو وہ روایت قبول نہیں، مزید اطمئنان کی خاطر چند اور دلائل ہر دو معاملہ (حضرت عمرو بن العاص کے مقام صحابیت، اور صلحِ حضرت حسنؓ) پر ذکر کرتے ہیں۔

حضرت حسن بصری سے روایت ہے کہ لما سار الحسن بن علی رضی الله عنهما إلی معاویة بالکتائب وقال عمرو بن العاص لمعاویة أری کتیبة لا تولی حتی تدبر أخراها" (بخاری)

قال الحافظ فی الفتح "وفی هذه القصة من الفوائد علم من أعلام النبوة ومنقبة للحسن بن علی فانه ترک الملك لا لقلة ولا لذلة ولا لعلة بل لرغبة فیما عند الله مما رآه من حقن دماء المسلمین فراعی أمر الدین ومصلحة الأمة"۔

(شرح بخاری رقم ۷۱۰۹)

مولانا محترم کا ارشاد ہے کہ یہ مجبوری کی صلح تھی حضرت حسنؓ اتنی فوج اور پورے سروسامان کے ساتھ نکلے کہ فریق مخالف کے اندر خوف پیدا ہو گیا تھا کیا اسی کو مجبور کی صلح کہتے ہیں؟

قال الحافظ أخرج الطبری بسند صحیح عن الزهری قال۔ جعل علی علی مقدمة أهل العراق قیس بن سعد بن عبادة وکانوا أربعین ألفا بایعوه علی الموت فقتل علی فبایعوا الحسن بن علی علی الخلافة۔ (شرح تحت رقم بخاری ۷۱۰۹)

۲۔ وقال ابن بطال ذکر أهل العلم بالأخبار أن علیا لما قتل سار معاویة یرید العراق وسار الحسن یرید الشام فالتقیا بمنزل من أرض الکوفة فنظر إلی کثرة من معه فنادیٰ یا معاویة إنی اخترت ما عند الله، فان یکن هذا الأمر لك فلا ینبغی لی أن أنازعك فیه وإن یکن لی فقد ترکته لك۔ فکبر أصحاب معاویة۔ وقال المغیرة عند ذلك أشهد أنی سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول "إن ابنی هذا سید"۔ الحدیث: (تفصیل کے لئے دیکھیں فتح الباری شرح بخاری ۷؍۱۰۹)۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اس موقع پر بھی اس حدیث کا تذکرہ ہوا تھا، جبکہ مولانا محترم کا دعویٰ ہے کہ صلح کے موقع پر اس حدیث کا تذکرہ نہیں ہوا، اس لئے بخاری کی اس حدیث کو ان کے نزدیک صحت کا مقام حاصل نہیں، کیا خوب استدلال ہے!! واہ مولانا محترم واہ!! ایسے نادر استدلال سے (عدم ذکر سے عدم صحت پر استدلال) تو آپ کے سوا واقعی پوری دنیائے علم اب تک ناآشنا ہے۔

۲۔ حضرت امیر معاویہ فقیہ صحابی ہیں، جس کی شہادت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے دی ہے (بخاری ۳۹۶۴) جس کی حیثیت "شهد شاهد من أهلها" کی ہے۔

۳۔ حضرت اُم حرام سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا "میری امت کا پہلا لشکر جو سمندری جہاد کرے گا اس پر جنت واجب ہوجائے گی" (بخاری ۲۹۲۴)

سب سے پہلا بحری جہاد حضرت معاویہ نے کیا ہے، اس لئے ان کے لئے جنت واجب ہے، چاہے مولانا سلمان صاحب کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو؟

حضرت عمرو بن العاص نہ صرف یہ کہ صحابی بلکہ صحابیِ جلیل اور عہدِ نبوی میں اجتہاد کے درجہ پر فائز تھے، ہم ذیل میں ایک بہت خوبصورت واقعہ نقل کرتے ہیں جس سے آپ ﷺ کے نزدیک حضرت عمرو بن العاص کے مقام ومرتبہ اور محبوبیت کا علم ہوگا

(۲) جہاں تک حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا تعلق ہے وہ بھی مجتہد ہیں، چنانچہ ابوداوٗد اور حاکم کی روایت میں ہے "عن عمرو بن العاص قال: احتملت فی لیلة باردة فی غزوة ذات السلاسل فأشفقت أن أغتسل فأهلك فتیممت، ثم صلیت بأصحابی

الصبح فذكروا ذلك للنبی صلی الله علیه وسلم۔ فقال یا عمرو صلیت بأصحابك وأنت جنب فأخبرته بالذی منعنی من الاغتسال و قلت إنی سمعت الله یقول: ولا تقتلوا أنفسکم إن الله کان بکم رحیماً فضحك رسول الله ولم یقل شیئا"۔

قال الحافظ (و فیه)جواز الاجتهاد فی زمن النبی صلی الله علیه وسلم" (شرح بخاری کتاب التیمم باب اذا خاف الجنب علی نفسه المرض)

۳۔عن علقمة بن رمثة أن رسول الله صلی الله علیه وسلم بعث عمرو بن العاص إلی البحرین فخرج رسول الله صلی الله علیه وسلم فی سریة وخرجنا معه، فنکس رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال "یرحم الله عمروا" قال فتذاکرنا کلا من اسمه عمرو" قال فنعس رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال یرحم الله عمروا" قال ثم نعس الثالثة فاستیقظ فقال "یرحم الله عمرا" فقلنا یا رسول الله من عمرو هذا؟ قال عمرو بن العاص قلنا وماشأنه؟ قال کنت اذا نظرت الناس إلی الصدقة جاء فأجزل منها، فأقول یا عمرو أنی لك هذا؟ قال من عند الله وصدق عمرو إن له عند الله خیراً کثیرا" قال زهیر بن قیس لما قبض رسول الله صلی الله علیه وسلم قلت لاألزمن هذا الذی قال رسول الله صلی الله علیه وسلم إن له عند الله خیراً کثیرا" حتی أموت (مسند احمد ۲۴۰۰۹، رجاله ثقات)

"إن له عند الله خیراً کثیرا" سے ظاہر ہے کہ جنت کی نعمتیں مراد ہیں۔

خلاصہ یہ کہ حضرت معاویہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما مخلص مسلمان صحابی اور جنتی ہیں اور یہ سب احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔

۴۔ اجماع۔ اہل سنت والجماعت نے ہمیشہ ان بزرگوں کو صحابہ میں شمار کیا ہے ان کے فضائل کتب احادیث میں مذکور ہیں، اور ان کی روایتیں بھی کتب حدیث بھی موجود ہیں۔

حضرت معاویہؓ اور عمروؓ بن العاص کی صحابیت کے منکر کے بارے میں علماء کا موقف

اب اگر کوئی حضرت معاویہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو صحابی نہ مانے انہیں منافق سمجھے

تواس کے بارے میں علماء کی کیا رائے ہے "قال صاحب الشفاء فیه: و كذا نقطع بكفر بكل من قال قولاً يتوصل به إلى تضليل الأمة أو تكفير الصحابة وحكاه صاحب الروضة فى كتاب الردة عنه وأقره"

وممن جنح إلى ذلك من أئمة المتأخرين الشيخ تقى الدين السبكى فقال فى فتاويه! احتج من كفر الخوارج وغلاة الروافض بتكفيرهم أعلام الصحابه لتضمنه تكذيب النبى صلى الله عليه وسلم فى شهادته لهم بالجنة، قال وهو عندى احتجاج صحيح۔ (دیکھیں فتح الباری شرح البخاری رقم الحدیث: ۶۹۳۳)

مولانا کے یہ اقوال موجب کفر ہیں یا نہیں؟ اس کا فیصلہ تو اس جماعت کو کرنا ہے جن کو مولانا نے دار القضاء میں رکھا تو وہ مفتی کہلائے، ہم تو صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ "هم للكفر يومئذ أقرب منهم للإيمان"۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "الدين النصيحة" اور فرمایا "أنصر أخاك ظالماً أو مظلوماً قالوا يا رسول الله هذا ننصره مظلوماً فكيف ننصره ظالماً! قال تأخذ فوق يديه۔ (بخاری حدیث ۲۴۴۴)

سلف کے یہاں رجوع کا طریقہ:

استاد ہونے کی حیثیت سے ہم طلباء پر مولانا محترم کا حق یہ ہے کہ ہم رجوع پر اصرار کرتے رہیں، اور سلف صالحین کی روش کے مطابق رجوع میں ندامت، عاجزی، غلطی پر واضح اعتراف، اور مالک یوم الدین کے سامنے پیشی کا خوف، اور اس کی گرفت کا مظہر ہو نہ کہ خودسری، نخوت، انانیت اور غرورِ علم کا نمونہ، مولانا محترم کے لیے اس سلسلہ میں بہترین نمونہ سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کا رجوع ہے، مولانا غفران صاحب ندوی کے بقول:

"علامہ سید سلیمان ندوی جب سیرۃ النبی کے دوسرے ایڈیشن کی تصحیح ومراجعہ کر رہے تھے اور مولانا اویس نگرامی سابق شیخ التفسیر ندوۃ العلماء ان کی معاونت کر رہے تھے تو مولانا نگرامی کا بیان ہے کہ سیرۃ النبی کے پہلے ایڈیشن میں حضرت کعب بن مالکؓ کے بارے میں سید صاحب

کے قلم سے بعض ایسے کلمات نکل گئے تھے جس سے حضرت کعبؓ کی تنقیص نکلتی تھی، مولانا نگرامی جب کتاب لے کر آئے تو دیکھا کہ سید صاحب پر گریہ طاری ہے، اور زار وقطار رو رہے ہیں، ان کا بیان ہے کہ سید صاحب سیرۃ النبی پر سر رکھ کر اتنا روئے کہ پورا صفحہ آپ کے آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ (مجھ سے یہ واقعہ مولانا غفران ندوی نے اپنے استاد مولانا نگرامی کے حوالہ سے بیان کیا)

اور سیرۃ النبی کے دیباچہ میں نہایت واضح اسلوب میں اپنی غلطی پر اعتراف وندامت کے ساتھ رجوع نامہ اس طور پر ہے، سید صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:

''غزوہ بدر کے روایتوں کے تنقید کے سلسلہ میں ایک مقام پر اس نافہم ہیچمدان کے خطا کار قلم سے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ صحابی کی روایت پر نا مناسب تنقید نکل گئی تھی، جس سے ایک گونہ جلیل القدر صحابی کی شان میں سوءِ ظن کا پہلو پیدا ہوتا تھا جس پر مجھے شرمندگی ہے اور اب میں اپنی اس غلطی ونادانی کو مان کر اس عبارت کو قلم زد کرتے ہوئے صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برأت کرتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ سے عفو کا خواستگار ہوں، جن لوگوں کے پاس اس سے پہلے کے نسخے ہوں وہ اپنے نسخوں سے ان سطروں کو کاٹ دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔

(دیکھیں دیباچہ چہارم سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

حضور والا! ندوہ اور ندویت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ آپ بھی سید صاحب کے نقش قدم کی پیروی کرتے ہوئے بارگاہِ عالی میں اشک ندامت بہاتے، زار وقطار رو کر توبہ کرتے، اور وضاحتی انداز میں انکساری وفروتنی کے ساتھ رجوع نامہ جاری کرئے تا کہ ہم طلباء کی تشفی کا سامان ہو سکے، اور اس موضوع پر اپنی تمام تحریروں کو دریا برد کر دینے یا سوخت کر دینے کی اپیل جاری فرمائیں، یاد رکھئے کہ توبہ کی توفیق بھی خدا کی جانب سے ایک نعمت وعنایت ہے جو احکم الحاکمین اپنے خاص بندوں کو عطا فرماتا ہے، اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ آپ کو رجوعِ حقیقی وتوبہ کی توفیق بخشے۔ آمین۔

گنوادی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

قسط نمبر-۲۶

مولانا محترم کے جوش وجذبات میں ڈوبے ہوئے سوالات:

''شرم تم کومگر نہیں آتی''

''مولوی عتیق بستوی سے بات شروع کرنے سے پہلے میں ان مولویوں سے کہنا چاہتا ہوں، جو پانچ سال سے قاتل ومجرم سعودی حکومت کے جرائم سے روز بروز واقف ہورہے ہیں، لیکن نہ ان کی زبان کھلتی ہے اور نہ قلم چلتا ہے، انہیں معلوم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑی تاکید سے فرمایا تھا، کہ مشرکین، یہود ونصاری کو جزیرۃ العرب سے نکال دینا، اور حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے دور میں انہیں جزیرۃ العرب سے نکال دیا تھا، چودہ سو سال پر پھیلی ہوئی پہلی مجرم حکومت، سعودی حکومت ہے، جس نے امریکی صہیونیوں کے اڈے جزیرۃ العرب میں جابجا قائم کئے، اور ملک اور اس کے خزانوں کو ان کے حوالہ کردیا، اور پھر ان فوجوں کا تعاون کرکے اپنی سرزمین سے افغانستان اور عراق کی اینٹ سے اینٹ بجادی، اور ابھی سات سال میں عراق اور شام میں سنیوں کا خاتمہ کر کے دوبارہ شام میں بشار اور عراق میں عبادی کے ہاتھ میں حکومت کی باگ تھمادی۔

کیا اتنے خطرناک اور فیصلہ کن جرائم پر یہ مولوی بولے کچھ لکھنا تو دور ان کی زبان بھی کھل سکی؟ سعودی حکومت نے ال اخوان المسلون، حماس اور اتحاد علماء المسلمین کو دہشت گرد قرار دیا، کیا ان مولویوں کے ایمان میں کوئی حرکت پیدا ہوئی؟ سعودی ولی عہد محمد بن سلمان نے اعلان کیا کہ ہم ۱۹۷۹ء سے پیدا ہونے والی اسلامی بیداری کا خاتمہ کرکے رہیں گے۔۔۔۔۔۔ کیا ان مولویوں نے تنقید کے دو بول بولے؟ ابھی قریب میں امام حرم عبد الرحمن السدیس نے حضرت عمرؓ کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے محمد بن سلمان جیسے فاسق فاجر اور قاتل کو محدث ملہم گردانا، کیا صحابہ کی جھوٹی محبت کا دم بھرنے والوں نے کوئی مضمون لکھا، کوئی بول بولا؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سرزمین حرم کی عزت تارتار کرنے والوں پر ان کا غصہ بھڑکا؟ کوئی کتابچہ نہ سہی، کوئی مضمون ان

کے قلم جو ہر رقم سے نکلا، بس کیا کہوں، شرم تم کو مگر نہیں آتی
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔میں کیا کہوں؟ شرم تم کو مگر نہیں آتی

جواب:

مولانا محترم!

آپ بین الاقوامی شخصیت کے مالک ہیں، ملک اور بیرون ملک میں آپ کے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں اسفار ہو چکے ہیں، پورے عالم اسلام کے علماء، تحریک اور تنظیموں سے آپ کے روابط ہیں، اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وسیع علم ونظر سے نوازا ہے، آپ کی شہرت ایک بے مثال مقرر اور شعلہ بیان خطیب کی ہے، جس کی نظیر ہندوستان ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر میں ملنا مشکل ہے۔ آپ بولتے ہیں تو گویا پھول جھڑتے ہیں، آپ کا وہ افتتاحی خطاب جو آپ نے امام حرم کی آمد پر دیا تھا یا وہ خطاب جو آپ نے دکتور العائض القرنی کے استقبالیہ میں دیا تھا، یا آپ کا وہ خطاب جو نظام تعلیم وتدریس کے موضوع پر جامعہ اُحمد بن عرفان الشہید کے وسیع احاطہ میں ہندوعرب علماء کے موجودگی میں ہوا تھا، اور حاضرینِ مجلس پر آپ کی ساحرانہ خطابت کا ایسا اثر ہوا تھا کہ ایک عرب فاضل نے تو فرط عقیدت میں آپ کی پیشانی کا بوسہ لے لیا تھا، ہم طلبہ کے نزدیک تو آپ اِن خطبات اور ان جیسے سیکڑوں خطبات میں عرب علماء سے بھی طلاقتِ لسانی اور سلاست وروانی میں فائق ہیں، چاہے کوئی اسے کوئی غلو پر محمول کرے، یا ادارہ واستاذ کے تعلق سے اندھی عقیدت اور محبت کا الزام لگائے، آپ کے خطبات صرف غیرت وحمیتِ اسلامی کے آئینہ دار ہوتے ہیں، جہاں حالات کی منظر کشی، مسائل کی توجیہ اور پھر بے لاگ وبیباک تجزیہ خاصے کی چیز ہے، جسے صرف سنا جا سکتا ہے، اور داد تحسین دی جا سکتی ہے، اس کے آگے بڑھ کر میدانِ عمل میں ان کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

عام مولوی کی حالت تو یہ ہے کہ رزق بقدر کفاف کے حصول میں ان کی پوری زندگی گزر جاتی ہے، ہاں کبار علماء کو اس سے مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے، جن کو ان امور کی کچھ سمجھ ہے، ایسی حالت میں وقت کے جابر وظالم حکمرانوں کے خلاف جہاد بالقلم وباللسان کو فرض عین بلکہ ایمان کا جزء تک بنا دینا اور اس میں اتنی شدت اختیار کرنا کہ جب تک سعودی حکمراں کو ظالم نہ کہو گے ان کے

مخالفت میں نہ بولوگے آپ کے ایمان واسلام کوتسلیم نہ کیا جائے گا، اورکسی بھی موضوع پر ایسے شخص جوسعودی حکومت اورسعودی حکمرانوں کو برا بھلانہیں کہے گا، اس کے کسی بیان کوتسلیم نہیں کیا جائے گا، بلکہ اسے مولانا محترم کی صراحت کے مطابق بزدل اور منافق کہا جائے، اوراس کا ایمان معتبرنہیں سمجھا جائیگا اس کوکہاں تک درست قرار دیا جاسکتا ہے؟ اورکن شرعی بنیادوں پر آپ کا یہ فیصلہ مبنی ہے؟۔

مولانا محترم! اللہ تعالیٰ کاتو ارشاد ہے

"ولتكن منكم أمة يدعون إلى الخير ويأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر" (سوره آل عمران:۱۵۶)

قال ابن كثير والمقصود من هذه الآية أن تكون فرقة من هٰذه الأمة متصدية لهٰذا الشأن"۔ (تفسير ابن كثير تحت هذه الآية)

وقال القرطبی فی تفسير هذه الآية فإنه يدل على أن الأمر بالمعروف والنهی عن المنكر فرض على الكفاية"۔

معلوم ہوا یہ کہ منکر پرنکیر کرنا فرض کفایہ ہےاوراس فریضہ کوآج بھی یہ امت ادا کررہی ہے، دکتورعائض القرنی سفرالحوالی وغیرہم کی مثالیں آپ نے پیش کی ہیں، اورنہ جانے کتنے اہل علم قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرکے اپنایہ فرض منصبی ادا کررہے ہیں۔

عن أبی سعيد رضی الله تعالیٰ عنه قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول:من رأى منكم منكراً فليغيره بيده فان لم يستطع فبلسانه فان لم يستطع فبقلبه وذلك أضعف الإيمان۔ (مسلم:۴۹)۔

امام نوویؒ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ

ثم إن الأمر بالمعروف والنهی عن المنكر فرض كفاية إذا قام به بعض الناس سقط الحرج عن الباقين وإذا تركه الجميع أثم كل من تمكن منه بلا عذر ولا خوف، ثم إنه قد تعين كما إذا كان فی موضع لا يعلم به إلا هو أولا يمكن من إزالة الاهو۔ (المنهاج شرح مسلم)

معلوم یہ ہوا کہ امر بالمعروف والنھی عن المنکر کے مختلف مراتب ہیں اور اس باب میں بڑی تفصیلات ہیں، امام نوویؒ نے بہت عمدہ کلام کیا ہے، تفصیل کے لئے اصل کی طرف رجوع کرنا چاہئے، مختصر یہ کہ جو آدمی ہاتھ سے منکر کے ازالہ پر قادر ہے تو اس کو ایسا کرنا چاہئے، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو زبان سے انکار کرنا چاہئے اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو دل سے برا سمجھنا چاہئے۔

تفصیلِ بالا سے معلوم ہوا کہ آپ جو جگہ جگہ تقریر میں ان پر نکیر کرتے ہیں تو وہ بھی تغییر باللسان ہے، اور آپ کے لئے عذر یہ ہے کہ آپ تغییر بالید پر قادر نہیں ہیں، ٹھیک اسی طرح وہ علماء جو آپ کی طرح نکیر نہیں کر رہے ہیں ان کا عذر یہ ہے کہ ایک تو وہ ہزاروں میل دور ہیں جس سے ان کو صحیح اور قطعی علم نہیں ہے اور دوسرا عذر یہ بھی ہے کہ یہ فرض کفایہ وہاں کے علماء بخوبی انجام دے رہے ہیں۔

اور رہ گئی عوام تو اس کے منبر و محراب سے ہمیشہ یہ دعائیں کی جاتی ہیں کہ

"اللھم انصر من نصر دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم واجعلنا منھم واخذل من خذل دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم ولا تجعلنا منھم۔

تو اس دعا میں ہر وہ شخص شامل ہے جو کہ دین کی کسی بھی طرح سے خدمت کرتا ہے، اور ہر اس شخص پر نکیر ہے جو دین کے مخالف کام کرتا ہے، چاہے وہ سعودی کا فرماں روا محمد بن سلمان ہو یا کلیۃ الدعوۃ والاعلام کے عمید شیخ سلمان بن طاہر۔

مولانا محترم! آپ نے سطور بالا میں امام سدیس پر نکیر فرمائی ہے کہ انہوں نے حضرت عمرؓ کی شان میں گستاخی کی، جب انہوں نے محمد بن سلمان جیسے فاسق وفاجر اور قاتل کو محدث وملہم قرار دیا۔

اور سعودی کے سرکاری عالم، صالح مغامسی پر نکیر فرمائی جنہوں نے سعودی کونسلٹ میں جمال خاشقجی کو قتل کرنے والوں کو حضرت خالد بن ولیدؓ سے تشبیہ دی اور محمد بن سلمان کو حضرت ابوبکرؓ سے۔

آپ کی نکیر بجا ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ نے جس کو "ثانی اثنین اذ ھما فی الغار" قرار دیا ہو اور جس کو "لو کان بعدی نبی لکان عمر" جیسے بلند القاب سے رسول اللہ ﷺ نے نوازا ہو، ان بزرگوں سے اس زمانہ کے بزرگوں کی بھی تشبیہ دینا مناسب نہیں چہ جائیکہ ظالم وجابر حکمرانوں کی۔

لیکن پھر اسی رسالہ میں چند سطروں کے بعد آپ نے خود حضرات شیخین پر ڈھکے چھپے

غاصب اور بدنیت اور ظالم ہونے کا الزام لگایا ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی کرنے والا قرار دیا ہے، حضور والا شریعتِ حقہ کی روشنی میں آپ کا جرم شیخ سدیس کے جرم سے کہیں زیادہ شنیع ہے، اور آپ کی جسارت بھی قابلِ غور ہے کہ جو کام شیخ سدیس و دیگر سرکاری علما اگر مال ومنال کی ہوس اور جاہ وتقرب کی بھوک میں کر رہے ہیں، اور وہ بھی تشبیہات واستعارات کے پیرایۂ بیان میں تو آخر آپ کس مقصد سے اتنے واضح انداز میں کھلے طور پر سبِ صحابہ کے مرتکب ہو رہے ہیں؟ آخر یہ کیسی منطق ہے کہ ہندوستانی مولوی سعودی کے خلاف نہیں بولے، اس لئے آپ کو بھی یہ حق مل گیا کہ آپ حضرات صحابہ کے خلاف محاذ کھول دیں؟ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے کہ "لا تعمیٰ الابصار ولکن تعمیٰ القلوب التی فی الصدور"۔

ایک سرکاری رپورٹ کے مطابق ۲۰۱۴/مارچ ۲۰۱۸ تک ہندوستان کے نوصوبوں میں کل چالیس سے زیادہ ہجومی بھیڑ کے ذریعہ مسلمانوں پر حملہ کے واقعات ہوئے ہیں، جن میں ۴۵ لوگ شہید ہوئے، جب کہ غیر سرکاری رپورٹ کے مطابق یہ تعداد بہت زیادہ ہے، امت مسلمہ ہندیہ ان گنت مسائل سے دوچار ہے، اور زخموں سے اس قدر نڈھال ہے کہ

درد بے چارہ پریشان ہیں کہاں سے اٹھے

مولانا محترم! آپ ترکی میں سعودی کونسلٹ میں جمال خاشقجی کے قتل پر خوب گرجتے برستے ہیں لیکن ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں آپ کی زبان کیوں گنگ ہو جاتی ہے؟ آخر آپ کے ہونٹ کس نے سل دیئے؟۔

یا یہاں کے مسلمان آپ کے نزدیک مسلمان نہیں؟ آخر نہی عن المنکر کی یہ کون سی شکل ہے کہ سامنے کے منکر پر تو سکوت اختیار کر لیا جائے اور پیٹھ پیچھے کے منکر پر آنسو بہایا جائے۔

تنبیہ:

مولانا محترم! آپ نے کوکن کی تقریر میں فرمایا کہ من رأی منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ وان لم یستطع فبقلبہ وذلک اضعف الایمان۔

ولیس وراء ذلک حبۃ خردل من الایمان۔

میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر تمہارے دل کے پھپھولے حرمین کے حالات پر نہیں

پھوٹتے توتم مؤمن نہیں ہو۔او کما قال:

(۱) یہ حدیث حضرت ابوسعید سے مسلم رقم الحدیث ۴۹،نسائی ۵۰۰۹، ۵۰۰۸،ابن ماجہ ۴۰۱۳، ۱۲۷۵،ترمذی ۲۱۷۲، ابوداؤد ۱۱۴۰، ۴۳۴۰ اور مسند احمد ۱۱۰۷۳، ۱۱۱۵۰، ۱۱۴۶۰، ۱۱۴۹۲، ۱۱۵۱۴، ۱۱۸۷۶ میں موجود ہے۔لیکن ذلک اضعف الایمان پر یہ روایت مکمل ہوجاتی ہے۔

ابن حبان ۶۱۹۳ کے الفاظ یہ ہیں "ليس وراء ذلك من الايمان مثقال حبة من خردل" لیکن اس روایت کا سیاق دوسرا ہے۔

ایک روایت کو دوسرے میں داخل کردینا یہ اہل علم کا شیوہ نہیں ہے، ہاں قصہ گوواعظین اور خطباء، محدثین کے تمام تنبیہات کے باوجود اپنی حرکت سے باز نہیں آتے۔

جہاں تک اس روایت سے اپنے مزعومہ عقائد کے مطابق استدلال کا تعلق ہے تو وہ بھی صحیح نہیں ہے۔

قيل: فى الحديث إشكال لأنه يدل علىٰ ذم فاعل الإنكار بالقلب فقط وأيضاً يعظم إيمان الشخص وهو لا يستطيع التغيير باليد ولا يلزم من عجزه عن التغيير باليد ضعف الإيمان، فكيف جعله صلى الله عليه وسلم أضعف الايمان؟ أجاب الشيخ عزالدين بن عبد السلام بأن المراد بالايمان هاهنا الاعمال مجازاً أوهو على حذف المضاف اى أضعف خصال الايمان فى باب النهى عن المنكر ولا شك أن التقرب بالكراهة ليس بالانكار ولم يذكره صلى الله عليه وسلم فى معرض الذم وإنما ذكره ليعلم المكلف مقارنة ما حصل فى هذالقسم فيترقى إلى غيره (حاشية السندى على ابن ماجة:۱۲۷۵)۔

(اس حدیث میں اشکال ہے کیونکہ اس حدیث میں منکر کو دل سے برا ماننے والی کی مذمت ہے،اور اس وجہ سے بھی کہ اس میں اس شخص کو ایمان واسلام کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، جو تغییر بالید پر قادر نہیں،اور تغییر بالید پر قادر نہ ہونا کمزوریٔ ایمان کی دلیل نہیں ہے،تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے أضعف ال إیمان کیوں فرمایا،شیخ عز بن عبدالسلام اس کا جواب دیتے ہوئے کہتے

ہیں کہ یہاں ایمان سے مراد مجازی طور پر اعمال ہیں، اور مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے، اور مطلب ہے أضعف خصال الإیمان فی باب النہی عن المنکر، اور اس حدیث میں منکر کو برا سمجھنے والے کی مذمت سے متعلق نہیں ہے، بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ تین درجات ہیں تاکہ انسان ادنی درجہ کو چھوڑ کر اعلی درجہ کے حصول کیلئے کوشاں ہو)۔

مولانا محترم! اس حدیث میں ایمان سے مراد اعمال ہیں، اور یہ بگڑے ہوئے مفتیوں کی تاویلات نہیں ہے۔

وما کان الله لیضیع ایمانکم (البقرہ: ۱۴۳) میں ایمان سے مراد نماز ہے، چنانچہ امام طبریؒ فرماتے ہیں کہ ففی قوله "وما کان الله لیضیع إیمانکم" علی ما تظاهرت به الروایة من انه الصلاة۔ (تفسیر طبری: سورة البقرة: ۱۴۳)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ومن لم یحکم بما انزل الله فأولئك هم الكافرون، إن الحکم الا لله، أمر ألا تعبدوا إلا إیاہ. مولانا محترم! ہندوستان کی عدالتوں میں جس کا دستور قرآن نہیں ہے، اور اسلامی شریعت کے مطابق فیصلہ نہیں ہوتا، غیر اللہ کے بنائے ہوئے نظام وقوانین کے مطابق عمل ہوتا ہے اور آپ اپنے مسائل کافر عدالتوں میں لے جاکر گویا ان کو حکم تسلیم کرتے ہیں تو اپنے ان مقدمات کی وجہ سے آپ کافر ہوئے کہ نہیں؟ کیا اب تک مسلمان ہیں؟ اگر مسلمان ہیں تو کیوں؟

مولانا محترم! خارجیوں کی طرح اپنے ہم خیال لوگوں کے علاوہ پوری امت کی تکفیر کا آخر آپ کو اتنا شوق کیوں ہے؟

ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ میں کچھ بات ہوگئی پھر دونوں بزرگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے

'فجعل وجه النبی صلی الله علیه وسلم یتمعر حتی أشفق أبو بكر فجثا علی ركبته فقال یا رسول الله والله أنا كنت أظلم مرتین فقال النبی صلی الله علیه وسلم ان الله بعثنی الیكم فقلتم كذبت، وقال أبوبكر صدق، واسانی بنفسه وماله فهل أنتم تاركولی صاحبی؟ مرتین فما أوذی بعدها (بخاری: ۳٦٦١)۔

(حضرت عمرؓ کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چہرۂ انور متغیر ہونے لگا حتی کہ ابوبکر کو خوف محسوس ہونے لگا اور دوزانوں بیٹھ کر عرض کرنے لگے، اللہ کے رسول! بخدا زیادتی میں نے ہی کی تھی، انہوں نے یہ جملہ دو مرتبہ کہا، اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے لوگو! اللہ تعالی نے مجھے تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا تو تم لوگوں نے مجھے جھٹلایا، لیکن ابوبکر نے میری تصدیق کی اور انہوں نے اپنی جان و مال سے میری خدمت کی، کیا تم میری خاطر میرے دوست کو ستانا چھوڑ دو گے؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بات دو مرتبہ فرمائی، اس ارشاد گرامی کے بعد حضرت ابوبکر کو پھر کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچی)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "فهل أنتم تاركولي" اس جملہ سے حضرت ابوبکرؓ کی خدمات جلیلہ کا اعتراف اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ابوبکر سے تعلق اور الفت و محبت ظاہر ہے، اس الفت و محبت کو بیان کرنے سے قلم و زبان دونوں عاجز ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ شرم تم کو مگر نہیں آتی۔ مولانا محترم! اللہ کے رسول اور اس کے اصحاب کو تکلیف پہنچاتے ہوئے کیا آپ کو شرم آئی؟ آپ کے اندر بھی شرم اور حیا کا کچھ بھی حصہ نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا ہے:

إذا لم تستحي فاصنع ما شئت (ابن ماجه: ۴۱۸۳)

مولانا محترم! حضرات شیخین کا جو مقام اسلام میں ہے اس سے مشرکین اور مخالفین تک واقف تھے، غزوۂ احد کے موقع پر جب مسلمانوں کو جانی و مالی نقصان سے دوچار ہونا پڑا تو اس موقع پر قریشی فوج کے کمانڈر ابوسفیان بن حرب نے پوچھا کہ أفيكم محمد؟ پھر اس نے پوچھا أفيكم ابن أبي قحافة؟ پھر اس نے پوچھا أفيكم ابن الخطاب؟ اس کے علاوہ ابوسفیان نے کسی کے بارے میں نہیں پوچھا۔ (دیکھیں بخاری: غزوۂ احد ۴۰۴۳)

مولانا محترم! بخاری کا یہ حصہ ندوہ میں آپ ہی کے زیرِ تدریس تھا، اور میں نے آپ ہی سے اس کو پڑھا ہے، سالہا سال اس حدیث کا درس دینے کے باوجود اگر آپ حضرات شیخین کے مقام و مرتبہ سے ناواقف ہیں تو یہ چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے کا مقام ہے۔

جس دین و مذہب میں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ تک متہم ہوں وہ سبائیت ہوسکتا ہے، شیعیت ہوسکتا ہے سب کچھ ہوسکتا ہے لیکن وہ دین اسلام نہیں ہوسکتا، ہم (جمہور اہل سنت) ایسے کسی بھی اسلام سے ناواقف ہیں، اور ایسے دین و ایمان سے اپنی برائت کا اظہار کرتے ہیں۔

قسط نمبر - ۲۷

مولانا محترم کا سوال:

"ستكون الخلافة بعدي ثلاثين سنة، ثم ملك عضوض ثم جبرية وعتو"... کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خلافت کے فورا بعد ملک عضوض کا تذکرہ نہیں فرمایا، یعنی معاویہ کی حکومت سے ملک عضوض کا دور شروع ہو جائے گا، معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ محدثین کے نزدیک بالاتفاق صحیح حدیث ہے"۔

اپنی ایک تازہ تقریر میں جو ابھی چند دنوں قبل کوکن کے علاقہ میں ہوئی استاذ محترم نے فکر وعقیدہ کے میدان میں ایسی گل افشانیاں کی ہیں کہ شیعی ارواح پر وجد وسرور کی لہر دوڑ گئی ہوگی، اور محدثین وارباب نقدِ حدیث ورطۂ تحیر واضطراب میں پڑ گئے ہوں گے، فقہاء وأصحابِ کلام نے اپنی انگلیاں دانتوں تلے دبالی ہوں گی۔

آپ بھی مولانا کی تقریر کا درج ذیل ٹکڑا پڑھیئے اور داد تحسین وتحقیق دیجیئے مولانا فرماتے ہیں:

''جو لوگ اس کی (ستكون الخلافة بعدي ثلاثين سنة، ثم ملك عضوض ثم جبرية وعتو) تأویل کرتے ہیں وہ ملعون ہیں اور حدیث کے منکر ہیں''۔ أو کما قال

جواب:

مولانا محترم کی ان بیش بہا تحقیقات اور بے نظیر منہجِ استدلال کا مشاہدہ آپ کرتے آئے ہیں، یہاں بھی آپ کو ایک ایسا ہی تعجب خیز استدلال نظر آئیگا جس پر ایک خاص منحرف فکر کی بناء رکھی گئی ہے ذیل میں ہم اس کا تذکرہ کریں گے۔

استاذ محترم کو چاہیئے یہ تھا کہ پہلے اس حدیث کو کتب حدیث سے بحوالہ نقل کرتے، اور پھر اس حدیث کو محدثین کے اقوال کی روشنی میں ثابت کرتے، اس کا درجہ متعین کرتے، اور پھر اس کا مفہوم متعین کرتے، اور ان آراء کو محدثین وعلماء کے اقوال کی روشنی میں مدلل کرتے، اور اگر اس

حدیث یا مفہوم حدیث پر کسی قسم کا کوئی علمی وعقلی اشکال ہوتا تو اس کا جواب دیتے۔

لیکن ظاہر ہے کہ مولانا محترم مایہ ناز مجتہد ہیں، اور ائمہ مجتہدین کے مقابلہ میں ان کی شانِ امتیاز یہ ہے کہ ان پر اجتہاد وقیاس کی کوئی شرط نافذ نہیں ہوتی، اور تحقیق واستدلال کے کسی تقاضا کو پورا کرنا ان کی ذمہ داری میں شامل نہیں، بلکہ ان کی شان عالی مقام کی توہین ہے، قواعدِ تصحیح وتجریح ان کے گھر کی کنیز ہے، اور اجتہاد ان کا موروثی حق، جب جو تحقیق پیش کریں اسے قبول کیا جانا چاہیئے، اگر کسی نے بھی ان کی تحقیق کے خلاف لب کشائی کی جرأت کی تو منکرِ حدیث ومنافق ٹھہرے گا اور واصل جہنم ہوگا، گویا شریعت ان کی گھر کی لونڈی ہے اور وہ خود جنت وجہنم کا فیصلہ سنانے والے کوئی قاضی۔

مولانا محترم فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ہے، حالانکہ یہ حدیث مذکورہ الفاظ کے ساتھ ذخیرہ حدیث میں ہمیں کہیں نہیں ملی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ مولانا محترم کو عربی زبان پر قدرت حاصل ہے، اور اپنے مقصد کو ثابت کرنے کے لیے کسی آیت یا حدیث کو پیش کرنا امت کو فریب دینے کے لیے ضروری تھا اس لئے انہوں نے اسے بالمعنی روایت کردیا ہے، حالانکہ استاذ ذی وقار کے زیرِ تدریس کتاب ''مقدمۂ ابن الصلاح'' میں روایت بالمعنی کے جواز وعدمِ جواز پر بحث کرتے ہوئے، علامہ ابن الصلاحؒ فرماتے ہیں:

"ثم إن هذا الخلاف لانراه جارياً ولا أجراه الناس فيما نعلم فيما تضمنته بطون الكتب، فليس لأحد أن يغير لفظ شيئ من كتاب مصنف ويثبت بدله فيه لفظاً آخر بمعناه"۔ (مقدمه ابن الصلاح، النوع السادس والعشرون)۔

(ہمارے علم کے مطابق کہ کتاب کے مندرجات کے بارے میں یہ اختلاف (روایت بالمعنی کے جواز اور عدم جواز) کسی کے یہاں نہیں ہے اور کسی نے اسے جائز نہیں قرار دیا لہذا کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ کسی مصنف کی کتاب کو تبدیل کرکے اس کی جگہ دوسرے ہم معنی الفاظ لکھ دے)۔

مولانا محترم کا ادعائے صحتِ حدیث، اور حضرات محدثین:

ظاہر ہے کہ اگر ان الفاظ کے ساتھ حدیث کسی کتاب میں موجود نہیں تو اس طریقۂ کار کو

مناسب نہیں کہا جا سکتا کہ اسے معنی روایت کر دیا جائے اور الفاظ حدیث کی قصداً مخالفت کی جائے، اور مولانا محترم کے ''دعوی باتفاقِ محدثین'' بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس قبیل کی اکثر روایتوں پر علمائے محدثین کا نقد اور سخت تبصرہ موجود ہیں، ہم ذیل میں ان کا ایک سرسری جائزہ پیش کرتے ہیں:

(۱) مسند أحمد میں حضرت نعمان بن بشیر کی روایت ہے کہ

"کنا جلوسا فی المسجد،فجاء أبو ثعلبة الخشنی فقال: یا بشیر بن سعد أتحفظ حدیث رسول الله ﷺ فی الأمراء فقال حذیفة:أنا أحفظ خطبته، فجلس أبو ثعلبة، فقال حذیفة:قال رسول الله ﷺ تکون النبوة فیکم ماشاء الله أن تکون ثم یرفعها الله إذا شاء أن یرفعها ثم تکون خلافة علی منهاج النبوة فتکون ماشاء الله أن تکون ثم یرفعها الله إذا شاء أن یرفعها ثم تکون ملکاعاضا، فیکون ماشاء الله أن یکون، ثم یرفعها الله إذا شاء أن یرفعها ثم تکون ملکاً وجبریة فتکون ماشاء الله أن تکون ثم یرفعها الله إذا شاء أن یرفعها ثم تکون خلافة علی منهاج النبوة، ثم سکت"۔

مسند أحمد ۱۸۴۳۰، ابو داؤد طیالسی ۴۳۸ مختصراً، والبزار ۲۷۶۹، کلهم من طریق داؤد بن ابراهیم الواسطی حدثنی حبیب بن سالم عن النعمان بن بشیر۔

حبیب بن سالم مولی النعمان بن بشیر وثقه ابو حاتم وذکره ابن حبان فی الثقات، وقال البخاری فیه نظر"۔

وقال ابن عدی فی الکامل ۲/۴۰۶ لیس فی متون أحادیثه حدیث منکر بل قد اضطرب فی أسانیده ما یروی عنه، وأعله البزار فی مسنده ۷/۲۲۴ بالإرسال، قال وهذا الحدیث لا نعلم أحدا قال فیه النعمان عن حذیفة إلا أبراهیم بن داؤد۔

(۲) روی أبو داؤد الطیالسی ۲۲۸والبیهقی فی الکبری ۱۶۴۰۷ وفی شعب الإیمان ۵۶۱۶ وأبو یعلی فی مسنده ۸۷۳ والطبرانی فی الکبیر ۳۶۷، ورواه ابن عبد البر فی التمهید ۱۴/۲۴۵، کلهم من طریق اللیث بن أبی سلیم عن عبد الرحمن بن

سابط عن أبی ثعلبة الخشنی عن أبی عبیدة بن الجراح ومعاذ بن جبلؓ عن النبی ﷺ قال: إن الله عز وجل بدأ هذا الأمر نبوة ورحمة ثم کائن خلافة ورحمة ثم کائن ملکا عضوضا، ثم کائن عتواً وحربة وفسادا فی الأمة... إلی آخر الحدیث"۔

یہ حدیث سنداً ومتناً دونوں حیثیت سے صحیح نہیں، اس روایت کی سند میں لیث بن أبی سلیم متروک روای ہے، تقریب التہذیب میں ہے صدوق اختلط جدا ولم یتمیز حدیثه فترك"۔

اور متن بھی اس آیت کے مخالف ہے "إن تنصروا الله ینصرکم"۔

تیسرا حوالہ:

(۳) عن أبی سعید بن جمهان قال حدثنی سفینة قال: قال رسول الله ﷺ الخلافة فی أمتی ثلاثون سنة، ثم ملك بعد ذلك"۔

(ترمذی ۲۲۲۶، ابوداؤد ۴۶۴۶، مسند احمد: ۲۱۹۱۹)

ابو داؤد کے الفاظ یہ ہیں خلافة النبوة ثلاثون سنة، ثم یؤتی الله الملك من یشاء"۔ (ترمذی نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے)۔

اس حدیث کو ترمذی کے علاوہ دیگر محدثین نے بھی صحیح کہا ہے، لیکن اس حدیث میں ملک کے ساتھ عضوض کا لفظ نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو حدیث ثابت ہے اس میں عضوض کا لفظ موجود نہیں ہے، اور جس حدیث میں وہ لفظ ہے وہ محدثین کے یہاں ثابت نہیں، اور اگر کسی کے یہاں ثابت ہے تو اس محدث کے نزدیک ملک عضوض سے حضرت معاویہؓ مراد نہیں۔

چنانچہ حضرت نعمان بن بشیر کی روایت جو حضرت حذیفہ سے مروی ہے اور مسند احمد میں درج ہے، اس کی تصحیح البانی نے اپنے سلسلہ میں کی ہے، لیکن وہ فرماتے ہیں کہ

"ومن البعید عندی جعل الحدیث علی عمر بن عبد العزیز لأن خلافته کانت قریبة العهد بالخلافة الراشدة ولم یکن بعد ملکان ملك عاض وملك

جبری، واللہ أعلم"۔

یعنی حضرت معاویہ کو ان کے نزدیک ملک عاض قرار دینا درست نہیں۔

یہ ہے مولانائے عالی شان کے اس دعوی کا حال کہ"یہ حدیث بالاتفاق محدثین کے یہاں صحیح ہے، اور جو اس کو نہ مانے وہ منکر حدیث ہے، ملعون ہے"۔

مولانا کی اس طفلانہ تحقیق پر قارئین کو یا تو تحیر ہوگا، یا بیساختہ ان کی حماقت پر ہنسی آئیگی، اور وہ اس پر ضبط نہیں کرسکیں گے، یہ مقام ہی ایسا ہے کہ اس پر ہنسا جائے یا آٹھ آٹھ آنسو بہائیں جائیں۔

کیا ہر خلافت محمود ہے؟

(۱) عن جابر بن سمرة قال سمعت رسول الله ﷺ يقول: لا يزال الإسلام عزيزا إلى اثنتي عشر خليفة"(مسلم:۱۸۲۱)

اور ابوداؤد کی روایت ہے کہ"يجتمع عليهم الناس"۔

حافظ ابن حجر نے ۱۲/خلفاء کی تعداد یوں ذکر کی ہے، کہتے ہیں:

"فإن جميع من ولى الخلافة من الصديق إلى عمر بن عبد العزيز أربعة عشر نفسا منهم اثنان لم تصح ولايتهما، ولم تطل مدتهما وهما معاوية بن يزيد، ومروان بن الحكم"۔ (فتح الباری)

(۲) عن ابی هريرة مرفوعا كانت بنو إسرائيل تسوسهم الأنبياء كلما هلك نبى خلفه نبى وإنه لا نبى بعدى، وسيكون خلفاء فيكثرون"۔ (بخاری: ۳۴۵۵)

اس سے معلوم ہوا کہ قیامت تک بہت سارے خلفاء ہوں گے۔

کیا ہر ملوکیت مذموم ہے؟

یہ امر حیرت واستعجاب سے خالی نہیں کہ خلافت وملوکیت کے بعد ہر خلافت کو محمود اور ہر ملوکیت کو مذموم مان لیا گیا، حالانکہ مطلقا ایسا کرنا صحیح نہیں معلوم ہوتا، مولانا محترم نے اپنی نگارشات میں یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ ملوکیت کی ہر شکل قابلِ مذمت ہے اور خلافت کی

ہر قسم لائق تحسین وقابلِ تعریف ہے۔

(۱) حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کے احسانات وانعامات کا تذکرہ کرتے ہوئے ملوکیت کو بھی بطور انعام خداوندی شمار کرایا ہے قرآن کا ارشاد ہے:

"وإذ قال موسى لقومه يا قوم أذكروا نعمة الله عليكم إذ جعل فيكم أنبياء وجعلكم ملوكا، وآتاكم ما لم يؤت أحدا من العالمين"۔ (المائدۃ:۲۰)

(۲) قرآن کریم میں طالوت کے بارے میں ہے

"إن الله قد بعث لكم طالوت ملكا"۔ (البقرۃ:۲۴۷)

(۳) حضرت سلیمانؑ نے تو یہ دعا فرمائی: "رب اغفر لي وهب لي ملكا لا ينبغي لأحد من بعدي"۔ (ص:۳۵)

(۴) واتبعوا ما تتلو الشياطين على ملك سليمان"۔ (البقرۃ:۱۰۲)

(۵) حضرت داؤدؑ کے بارے میں فرمایا: وآتاه الملك والحكمة وعلمه مما يشاء"۔

(البقرۃ:۲۵۱)

ان آیات سے اور درج بالا احادیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلق خلافت اور مطلق حکومت نہ تو معیوب ہے اور نہ محمود، اس لئے الخلفاء کے ساتھ الراشدون اور ملک کے ساتھ عضوض وغیرہ کی صفت لگائی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ملک کو عام معنیٰ میں استعمال کیا ہے، ارشاد ہے:

"قل اللهم مالك الملك تؤتي الملك من تشاء وتنزع الملك ممن تشاء"۔

کیا آپ کو نہیں معلوم کہ حضرت معاویہؓ اسلامی تاریخ کے ۱۲ خلفاء میں سرفہرست، اور جلیل القدر بادشاہوں میں شامل ہیں، اور یہ حضرت معاویہؓ کی شان میں نقص نہیں بلکہ ان کے حق میں سرمایۂ افتخار ہے۔

منکر حدیث کون ہے؟

عن ابن عباس رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ أول هذا الأمر نبوة ورحمة، ثم

يكون خلافة ورحمة، ثم يكون ملكاً ورحمة، ثم يكون إمارة ورحمة، ثم يتكادمون عليها تكادم الحمير، فعليكم بالجهاد وإن أفضل جهادكم الرباط وإن أفضل رباطكم عسقلان"۔

(رواه الطبرانی فی المعجم الکبیر: ۸ ۱۱۱۳۸، وقال الہیثمی فی المجمع رجالہ ثقات، علامہ البانی نے بھی اس حدیث کی اسناد کو جید کہا ہے)۔

علامہ ابن تیمیہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں

"وكانت إمارة معاوية ملكا ورحمة، وبعده وقع ملك عضوض"۔ (جامع المسائل: ۵/۱۵۴)۔

ملک عضوض والی روایت خواہ صحیح ہو یا غیر صحیح بہرحال اس کا اطلاق حضرت معاویہؓ پر نہیں ہوسکتا، کیونکہ ملک عضوض کے معنی ہیں ظالم وجابر بادشاہت اور حضرت معاویہؓ کی پوری زندگی عدل وانصاف، الفت ومحبت، امن وامان اور کرم گستری سے عبارت ہے، تاریخی شواہد بھی کثرت سے موجود ہیں۔

قال ابن أثير فی النهاية: ثم يكون ملك عضوض، أی يصيب الرعية فيه عسف وظلم كأنهم يعضون فيه عضاً"۔

اور سیدنا حضرت معاویہؓ کا حلم وعدل تو مشہور ہی ہے، اور یہ شہرت ہی اس تردید کے لیے کافی ہے، تو یہ روایت واقعہ کے خلاف ہوئی، اس لئے صحیح نہیں ہوسکتی، یا پھر اسے مؤول تسلیم کیا جائے، اور یہی بات راجح ہے، سیدنا حضرت معاویہؓ کی حکومت **"وملكاً رحمة"** کا مصداق ہے، اس کے دلیل کے طور پر چند نمونے اور مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) امام اعمش کے پاس حضرت عمر بن عبدالعزیز کا لوگوں نے تذکرہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ فكيف لو أدركتم معاوية؟ قالوا فی حلمه؟ قال: لا والله فی عدله"۔

(أخرجه الخلال فی السنة ٦٦٧)۔

امام مجاہد سے روایت ہے کہ

لو أدركتم معاوية لقلتم هذا المهدی۔ (السنة للخلال: ٦٦٨)۔

سیدنا حضرت معاویہؓ کا عدل وانصاف اور رعایا کے حق میں ان کی کرم گستری بہت معروف ہے، اور اس کی شہرت کا عالم یہ ہے کہ مشہور مؤرخ ابن خلدون نے یہاں تک فرمایا کہ ان کی حکومت کو خلافتِ راشدہ میں شمار کرنا چاہئے، یا یہ کہ وہ خلافت راشدہ کا تتمہ ہیں، ابن خلدون کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"إن دولة معاوية وأخباره كان ينبغي أن تلحق بدول الخلفاء الراشدين وأخبارهم فهو تاليهم في الفضل والعدالة والصحبة"۔ (تاریخ ابن خلدون: ۲/ ۴۵۸)

مولانا محترم!

یہ بتائیں کہ کیا آپ اس حدیث صحیح یعنی حدیث ابن عباس کے منکر ہیں؟ یا خلافت معاویہ کو خلافتِ عادلہ ماننے لگے ہیں۔

ملعون کون ہے؟

(۱) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا

"إن الله تبارك وتعالى اختارني واختار لي أصحابا فجعل لي منهم وزراء وأنصارا وأصهارا فمن سبهم فعليه لعنة الله والملائكة والناس أجمعين"۔ (مستدرك حاكم ٦٦٥٦، وقال هذا حديث صحيح الإسناد، ووافقه الذهبي)۔

(۲) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: من لعن شيئاً ليس له بأهل رجعت اللعنة عليه"۔ (ابو داؤد ۴۹۰۸، والترمذی: ۱۹۷۸)

(۳) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے "لعن المؤمن كقتله"۔ (بخاری)

مولانا محترم!

سیدنا حضرت معاویہؓ سے سیدنا حضرت حسنؓ نے صلح کی ہے، اور اس صلح کے ذریعہ انہوں نے اپنی سیادت ''ابنی ہذا سید'' ثابت کی ہے، اور وہ خود سیدا شباب أہل الجنۃ ہیں، اور تقریبا بیس برس تک ان کی حکومت کے خلاف حضرت حسنینؓ نے کبھی خروج نہیں کیا، آخر کیوں؟ وقت کے اس جابر بادشاہ کے خلاف اگر وہ جابر تھے تو کیوں خاموش رہے؟۔

آپ کی اس لعن طعن اور ہرزہ سرائیوں میں (نعوذ باللہ) کیا حضرات حسنین بھی شامل ہیں؟ اور حدیث بالا سے ظاہر ہے کہ کسی مسلمان پر لعنت کرنا ایسا ہی ہے جیسے اسے قتل کرنا تو کیا آپ یہ ذمہ داری لینے کے لیے تیار ہیں؟۔

آپ کے چھوٹے نانا مفکر اسلام سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ بھی حضرت معاویہؓ کے بارے میں اہلِ سنت و جماعت کا عقیدہ رکھتے ہیں، تو کیا وہ بھی منکر حدیث اور ملعون ہیں؟ آپ نے احقاقِ حق وابطال باطل کا جو معرکہ بپا کر رکھا ہے اس سے ہم امید کرتے ہیں کہ اپنی منافقانہ روش سے ذرا انحراف کرتے ہوئے حضرت مولانا علی میاںؒ کے بارے میں اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کریں گے۔

ہم یہاں حضرت مولانا کی کتاب ''المرتضیٰ'' سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔

مفکر اسلام رقمطراز ہیں:

''تاریخی حقائق اور خاص طور پر اس پیچیدہ اور مبہم دور کو سامنے رکھتے ہوئے جو حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد پیش آیا اور اسلامی معاشرہ اندرونی و بیرونی بدلتے ہوئے حالات کا جو ردعمل ہوا، ان سب کا جائزہ لینے سے جو بات نظر آتی ہے وہ یہ کہ حضرت معاویہؓ کو لوگوں کی نفسیات پہچاننے کا ملکہ، اور عرصۂ دراز تک حکومت کرنے کا جو تجربہ تھا، اس نے ان کو یقین دلایا کہ اس وقت کے اسلامی معاشرہ کی قیادت اور وسیع اسلامی مملکت کی سربراہی (جس کے عناصر میں تنوع پیدا ہو چکا تھا، اور جس کو چند در چند مسائل و مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا) خلافتِ راشدہ کے ان خطوط پر قائم نہیں رکھی جا سکتی جن پر خلفائے ثلاثہؓ چلتے رہے، اور جن کو پوری طاقت سے نباہتے رہے، حضرت معاویہؓ اس بات پر مطمئن ہو گئے کہ وقت کا تقاضا یہی ہے کہ اسلامی مملکت کو خطرات سے محفوظ رکھا جائے، امن وامان قائم رہے، غزوات وفتوحات کا سلسلہ جہاں تک جاری رہ سکتا ہے اس کو جاری رکھا جائے، اور اس کی خاطر ایک شخصی موروثی مگر عادل حکومت قائم ہو جائے تو کوئی حرج نہیں، حکومت اسلامی تعلیمات کی تابع ہو، مگر اس میں لچک ہو، اور شریعت کا پاس واحترام بھی امکانی حد تک قائم رہے، حکومت کے انتظامیہ اور حکومت چلانے کے طریقے اور لوگوں سے معاملہ کرنے کے اصول میں توسع سے کام لیا جائے اگر ضرورت وحالات اس کے

متقاضی ہیں تو اس میں کوئی نقصان نہیں ہے، مملکت تو دائرہ اسلام سے باہر نہیں جائے گی (جس کی نوعیت اب ایک بڑی سلطنت کی ہو چکی ہے، اور وہ مختلف نسلوں، تہذیبوں اور مذاہب کے ماننے والے عناصر پر مشتمل ہے) ہوشیاری اور لچک کے ساتھ معاملات سلجھائے جائیں، اور جو مشکلات سامنے آئیں ان کو حل کرنے میں حکمت عملی اور مصلحت وقت سے مدد لی جائے، وقت ومقام کے اختلاف کو پیش نظر رکھا جائے لہذا انہوں نے اپنی حکومت ایک مسلمان فوجی وانتظامی سربراہ کی حیثیت سے قائم کر لی۔

ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ

''اس میں شک نہیں حضرت معاویہؓ کے عہد میں اسلام اور مسلمانوں کو فتح وغلبہ حاصل ہوا، اسلام کو فتح مندیاں حاصل ہوئیں، اور اس کا دائرہ بڑھا، حضرت معاویہؓ نے غزوات کا سلسلہ جاری رکھا، اور فتوحات کا سلسلہ بری وبحری راستوں سے وہاں تک پہونچا جہاں مسلمان فاتحین کے قدم پہلے نہیں پڑے تھے، ان کی فتوحات بحر اوقیانوس (اٹلانٹک) تک پہنچ گئیں، ان کے مصر کے گورنر نے سوڈان کو اسلامی مملکت میں شامل کر لیا، ان کے زمانہ میں بحری بیڑے اس کثرت سے تیار ہوئے، ان کو خاص اہتمام تھا، یہاں تک کہ ان بیڑوں کی تعداد سترہ سو تک پہنچ گئی، یہ سب کشتیاں ہتھیار اور سپاہیوں سے بھرپور تھیں، ان بحری بیڑے کو وہ مختلف سمتوں میں روانہ کرتے، اور وہ کامیاب واپس آتے، ان کے ذریعہ متعدد علاقے فتح ہوئے ۴۸ھ میں حضرت معاویہؓ نے ایک بڑی فوج تیار کی تھی کہ وہ قسطنطنیہ پر بحری اور بری دونوں طرف سے حملہ کرے، مگر چونکہ اس کی شہر پناہ بہت مضبوط اور وہاں تک پہنچنا دشوار تھا اور چونکہ یونانی آتشیں حملہ نے ان کے بیڑوں کو تباہ کر دیا تھا، اس لئے وہ حملہ کامیاب نہ ہو سکا، اور قسطنطنیہ فتح نہیں ہوا، اس فوج میں شریک حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ حضرت ابوایوب انصاریؓ اور یزید بن معاویہ بن ابی سفیانؓ تھے، رسول اللہ کے میزبان حضرت ابوایوب انصاریؓ کی وفات اسی شہر پناہ کے حصار کے زمانہ میں ہوئی، اور ان کی تدفین شہر پناہ کے قریب عمل میں آئی''۔ (المرتضی:۲۷۱-۲۷۲)۔

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ ایک موقع پر تحریر فرماتے ہیں:

''یہ امر فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کے ایک ممتاز فرد ہیں، ان کے مناقب میں حدیثیں وارد ہوئی ہیں، جو لوگ ان پر زبان طعن دراز کرتے ہیں اور ان کے سلسلہ میں بیباکی و زبان درازی سے کام لیتے ہیں، ان کو اس امر کا پاس و لحاظ ہونا چاہئے، کہ وہ ایک ایسے صحابی ہیں جن کو قرابت کا شرف بھی حاصل ہے۔

امام ابوداؤد نے حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لاتسبوا أصحابي والذي نفسي بيده لو أنفق أحد كم مثل أحد ما بلغ مد أحدهم ولا نصيفه"۔

میرے صحابہ کی برائی نہ کرو، قسم اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اگر تم میں سے کوئی احد کے برابر بھی سونا اللہ کی راہ میں دیدے تو ان کی برابری کیا ان کے ایک مد اور آدھے مد کے برابر بھی نہیں آسکتا''۔

ابوداؤد نے ابوبکرہؓ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا:

"قال رسول الله ﷺ للحسن بن علي إن ابني هذا سيد وإني أرجو أن يصلح الله به بين فئتين عظيمتين من المسلمين"۔

ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"لعل الله أن يصلح به بين فئتين عظيمتين من المسلمين"۔

دیلمی نے حضرت حسن رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا:

"سمعت علياً يقول: سمعت رسول الله ﷺ يقول: لا تذهب الأيام والليالي حتى يملك معاوية"۔

آجری کتاب الشریعۃ میں عبدالملک بن عمیر سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ نے فرمایا:

''جب سے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ اے معاویہ اگر تم کو حکومت مل جائے تو اچھی طرح حکومت کرنا، اس وقت سے مجھے خلافت کے حصول کی تمنا تھی''۔

حضرت ام حرام رضی اللہ عنہما کی یہ حدیث ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"أول جیش من أمتي یغزون البحر قد أوجبوا"۔

اور پہلا شخص جو حضرت عثمانؓ کے عہد میں بحری راستہ سے جہاد کو نکلا وہ حضرت معاویہ تھے، اور حضرت ام حرامؓ اس فوج میں تھیں، اور سمندر عبور کرنے کے بعد ان کی وفات ہوئی ہے۔

یہ بات ثابت ہے کہ حضرت معاویہؓ کو رسول اللہ ﷺ نے اپنا کاتب بنایا تھا، اور آپ کاتب اسی کو بناتے تھے جو عدل وامانت کی صفات سے متصف ہو"۔ (المرتضی: ۲۷۴)۔

مولانا واضح رشید ندویؒ اور عدالتِ صحابہ

مفکر اسلام مولانا علی میاںؒ کے درج بالا اقتباسات جن سے حضرت معاویہؓ کے تعلق سے ان کا موقف واضح ہے کہ وہ ان کو ایک عادل وکرم گستر حاکم تسلیم کرتے ہیں اور ان کے بارے میں کسی قسم کی ردوقدح اور سب وشتم کو روا نہیں سمجھتے، اب ہم ذیل میں فکر اسلامی کے نقیب مخدومنا مولانا واضح رشید حسنیؒ کا ایک اقتباس نقل کرنا بھی مناسب سمجھتے ہیں تا کہ حضراتِ صحابہ کے بارے میں ندوہ وارباب ندوہ اور خصوصاً خانوادۂ حسنی کا موقف بھی کھل کر سامنے آجائے، اور کسی کو شبہ نہ رہے کہ وہ خاندانی قرابت داری کی وجہ سے مولانا محترم کے موقف کے مؤید یا حامی ہیں، مخدومنا مولانا واضح صاحبؒ نے وفات سے چند روز پیشتر ایک کتاب بنام "صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مثالی زندگی" طبع کرائی ہے، اور ہم متعدد شواہد وقرائن کی بنیاد پر یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ اس کتاب کے ذریعہ انہوں نے واضح انداز میں اپنا، اپنے خانوادہ کا، اور خاص طور پر ندوی برادری کا موقف امت کے سامنے پیش کیا ہے، اور اگرچہ مولانا حسینی کا کہیں نام تو نہیں لیا مگر یہ کتاب ان کے عقائد وافکارِ باطلہ کے رد میں ہے، اور مولانا حسینی کی تحریر وتقریر سے پیدا شدہ اضطراب وانتشار کا مثبت جواب ہے، اور کامیاب رد ہے، صراحت نہ کرنے میں درحقیقت مخدومنا مولانا واضح رشید ندویؒ کی افتادِ طبع اور سنجیدہ مزاجی کا دخل ہے کہ ان کے نزدیک صاحبِ فکر کی نہیں بلکہ مجرد فکر کی تردید ہونی چاہئے اور ان کی اکثر نگارشات میں یہ خوبی موجود ہے۔

مولانا واضح رشید حسنی ندویؒ تحریر فرماتے ہیں

"اس قدسی اور نبوی تربیت یافتہ جماعت کے فضل سے قرنِ اول میں اسلام پوری دنیا میں

پھیلا، لہذا صحابہ کرام اس امت کا خلاصہ وعطر ہیں، بلکہ انبیاء اور رسولوں کے بعد پوری نوع انسانی میں سب سے افضل اور برتر ہیں، اللہ کو ایک مانا اور اسلام کو اپنا مانا، اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رسول مانا یہ ایمان ان کے دلوں میں پہاڑ کی طرح راسخ اور مستحکم تھا، ایمان لاتے ہی ان کی دنیا بدل گئی، گویا ابھی پیدا کئے گئے ہوں، ان کا تاریک ماضی روشن ہوگیا، ان کے وجود میں ایمان کی لہر دوڑ گئی، اب بس ایک ہی مقصد تھا کہ اللہ کی رضا وخوشنودی حاصل ہوجائے، ان پر آخرت میں اپنے رب سے ملاقات کا شوق چھا گیا، اور اس جنت کی طلب صادق پیدا ہوگئی، جس کی وسعت زمین وآسمان بیان کی گئی ہے، صحابہ کرامؓ نے ایمان کے راستہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا، اللہ کی رضا کی خاطر اپنا وطن چھوڑا، گھر بار چھوڑا، طرح طرح کی اذیتیں اور مشقتیں برداشت کیں، جہاد کیا، اللہ اور اس کے رسول کے لیے قربانیاں دیں، انہی کی بدولت اسلام کا بول بالا ہوا، اس کو قوت واستحکام حاصل ہوا، اور پھر لوگ اسلام میں جوق در جوق داخل ہو گئے۔

صحابہ کرامؓ کی نسل ممتاز ترین اور افضل ترین نسل ہے، جس کی اسلامی دعوت کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی، بلکہ انبیاء کی تاریخ میں ایسا نمونہ نظر نہیں آتا، صحابہ کرام کے فضل واحسان کا انکار ہٹ دھرم اور سرکش شخص ہی کر سکتا ہے، تمام صدیوں میں اس امت پر ان کے احسانات ہیں اور وہ بغیر تفریق وامتیاز کے قیامت تک نمونہ اور معیار ہیں۔

بلا شبہ تمام صحابہ کرامؓ نبوی مدرسہ کے فیض یافتہ ہیں، اور شجر نبوی کے پھل ہیں، اور ابتلاء وآزمائش کے مختلف مراحل سے گذر کر پروزانۂ الہی ''رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ'' سے سرفراز ہوئے، اس قدسی جماعت پر جس سے اللہ اور اس کا رسول راضی ہوا گر کوئی کیچڑ اچھالتا ہے تو وہ درحقیقت نبوی تعلیم وتربیت اور شجر نبوی پر کیچڑ اچھاتا ہے''۔

موجودہ عہد میں ایک بار پھر ایسی کوششیں ہو رہی ہیں اور کچھ ایسی کتابیں ومقالات لکھے جا رہے ہیں جن سے اسلامی تاریخ کا روشن چہرہ داغ دار ہو رہا ہے، اور بعض اسلامی شخصیتوں کو اور تاریخ میں ان کے مثالی کردار کو نشانہ بنایا جا رہا ہے، حتی کہ صحابہ کرام، امہات المؤمنین اور صحابیات کو نشانہ بنایا جا رہا ہے، ان مؤرخین اور مقالہ نگاروں کا مرجع وہ کتابیں ہیں جو تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں تصنیف کی گئیں، جب اسلامی معاشرہ مختلف عناصر پر مشتمل تھا، خصوصا

فارسیوں (ایرانیوں) کا غلبہ تھا، جن کا دل صاف نہیں تھا، اوران کے دل ودماغ میں عربوں کے ہاتھوں قادسیہ کا زخم مندمل نہیں ہوا تھا، فقہی مسالک اور فرقوں کی وجہ سے بھی بعض صحابہ کونشانہ بنایا گیا۔(صحابہ کرام کی مثالی زندگی ۱۸-۲۱)۔

نوٹ:

اس قسط کی تیاری میں مصروف تھا کہ معلوم ہوا کہ مولانا حسینی نے پھر خاموشی توڑی ہے، اور ایک نئی تحقیق بنام ''ملک عضوض'' لے کر منظر عام پر آئے ہیں، کتاب دیکھی تو محسوس ہوا کہ سابقہ تلبیسات وتحریفات کی طرح یہاں بھی تلبیسات وتدلیسات اور موضوع روایات کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے، پتہ نہیں مولانا محترم کو آخر گندگی ہی کیوں پسند ہے، اور عمدہ ونفیس کتابوں سے گندگی وغلاظت ہی کا انتخاب کیوں کرتے ہیں؟ اگر یہی شوق ہے تو کلبی اور کلینی کی کسی کتاب کو جو مثالب صحابہ پر ہے اپنے نام اور مقدمہ سے کیوں نہیں طبع کرا دیتے؟ جب کہ یہ ان کا محبوب مشغلہ ہے۔

بہر حال اگلی قسط میں ان شاء اللہ اس کے متعلق کچھ عرض کیا جائے گا۔

قسط نمبر-۲۸

ملک عضوض-ایک تنقیدی جائزہ

استاد محترم مولانا سلمان حسینی صاحب کی ایک نئی کتاب ''ملک عضوض'' کے نام سے ابھی چندروز قبل شائع ہوئی ہے، اس کتاب کا بنیادی مقصد حضرت معاویہؓ اورعہد بنی امیہ پر نقد وتبصرہ ہے، اس سے یہ ثابت کرنے کوشش کی گئی ہے اسلام کا عہدِ اولیں جس میں ہمیں فتوحات کا سیل رواں نظر آتا ہے، اور جس عہد میں اسلام اور اسلامی تعلیمات سے عرب وعجم اورشرق وغرب فیض پا رہے تھے، وہ ظالمانہ و جابرانہ دور تھا، اوراس عہد کے وہ نامور فاتحین جو اعلائے کلمۃ اللہ کا فریضہ ادا کرتے ہوئے دادشجاعت دے رہے تھے، وہ باکمال وبے مثال مجاہدین جن کی جرأت واستقامت اورشجاعت وبہادری سے ایوانِ کسری وقیصر لرز گئے تھے، وہ سرفروشانِ اسلام جن کی جوانمردی اور بسالت سے کوہ ودمن میں خوف وہراس دوڑ جاتا تھا، جوحق کے شیدائی، اور راہ عزیمت کے راہی تھے، مصر وشام کی فتوحات جن کی ہمت وجرأت اورعظمت کا نشان ہیں، جن کی زبان سے بلند ہونے والے نعرۂ تکبیر ''اللہ اکبر'' کے گواہ شمس وقمر بھی ہیں اور بحر وبر بھی، اورجن کی شمسیر خاراشگاف کی جھنکار سے ہر کان آشنا ہے، اور قادسیہ ویرموک کے میدان کارزار جن کے خون سے لالہ زار ہیں، اورجن کے زورِ بازو اور عدل پروری کے قصے اسلامی تاریخ کا روشن باب بنے، وہ فاتحین درحقیقت مولانا محترم کی تحقیق کے مطابق ظالم وجابر اور باغی تھے، وہ انسانیت کے قاتل بلکہ خونِ مسلم سے ان کے ہاتھ آلودہ تھے یاللعجب۔

قارئین کرام!

مولانا محترم نے اپنی کتاب کے سرورق پر یہ آیت چسپاں کی ہے: "ولا ترکنوا إلی الذین ظلموا فتمسکم النار"۔

اوراس آیتِ قرآنی میں ظالم کا مصداق عہد بنی امیہ کے نامور فاتحین اسلام مثلاً حضرت معاویہؓ ان کے بیٹے یزید، جلیل القدر صحابی مغیرہ بن شعبہ، فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص، ولید بن عقبہ، مروان بن حکم وغیرہم کا کو قرار دیا ہے۔

اس کے بعد مولانا محترم نے ایک روایت نقل فرمائی ہے، اور درحقیقت یہی روایت ان کی اس کتاب کی بنیاد، اور ان کی فکرِ منحرف کی اصل الأ ساس ہے، اور شاید یہی جمہور اہلِ سنت کی شاہراہ حق وعدل سے گریز کی محرک بھی، وہ روایت حسبِ ذیل ہے:

"ستكون الخلافة بعدى ثلاثين سنة ثم ملك عضوض ثم جيرية وعتو وفى بعض الروايات ثم خلافة راشدة. (أخرجه أحمد. ۵/۲۲۰، والطيالسى ۲/۱۶۳ وابوداؤد ۴۶۴۶ والطحاوى فى مشكل الآثار ۴/۳۱۳ والطبرانى ۱۳، والترمذى ۲۲۲۶، وابن حبان ۱۵۳۴، ۱۵۳۵، والحاكم ۳/۷۱. ۱۴۵ ووافقه الذهبى)"

مولانا محترم کی پیش کردہ حدیث کے مراجع کا علمی جائزہ

دراصل اس حدیث سے مولانا محترم کا استدلال یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ۳۰ سال بعد خلافت ختم ہوگئی، اور اس کے بعد ''ملک عضوض'' کا دور شروع ہوا اور اس اعتبار سے حضرت معاویہؓ مِلکِ عضوص یعنی ظالم بادشاہ ہیں، اور سرورق میں موجود آیت سے استدلال یہ ہے کہ ان کے حق میں کوئی دوسری تاویل کرنے والے اور ان کو عادل بادشاہ ماننے والے لوگ جہنمی ہیں، ذیل میں ہم مولانا محترم کی پیش کردہ دلیل کا علمی بنیادوں پر جائزہ پیش کریں گے۔

مولانا محترم نے جیسا کہ آپ نے دیکھا یہ حدیث پیش کی ہے اور مراجعت کے لیے حوالے بھی لکھے ہیں، ذہبی کی موافقت کا تذکرہ کیا ہے، ان میں سات کتابوں کا ذکر ہے، جبکہ ان الفاظ میں ان ساتوں میں کسی جگہ یہ روایت موجود نہیں، ہم ترتیب وار مولانا محترم کی بیان کردہ حوالوں سے وہ روایت پیش کرتے ہیں۔

سب سے پہلے ہم مولانا کی پیش کردہ احادیث کو ان کے اصل مراجع سے ذکر کرتے ہیں، مولانا محترم کا پہلا حوالہ مسند احمد کا ہے، مسند احمد کی روایت حسب ذیل ہے

۱۔ حديث أبي عبدالرحمن سفينة مولى رسول الله صلى الله عليه وسلم
حدثنا عبدالله حدثني أبي ثنا بهز ثنا حماد بن سلمة ثنا سعيد بن جمهان
وعبدالصمد حدثني سعيد بن جمهان بن سفينة قال سمعت رسول الله صلى الله
عليه وسلم يقول الخلافة ثلاثون عاماً ثم يكون بعد ذلك ملك، قال سفينة
أمسك خلافة أبي بكر رضى الله عنه سنتين و خلافة عمر رضى الله عنه عشر
سنين وخلافة عثمان رضى الله عنه اثني عشر سنة وخلافة على ست سنين رضى
الله عنهم۔ (احمد ۵/۲۲۰)۔

اس کے بعد مسند ابوداؤد طیالسی کی روایت ملاحظہ ہو

۲۔ حدثنا ابودائود قال حدثنا الحشرج بن نباته قال حدثني سعيد بن
جمهان قال حدثني سفينة قال خطبنا رسول الله فقال "الخلافة فى أمتى ثلاثون
سنة ثم يكون ملك" ثم قال سفينة أمسك خلافة أبي بكر وخلافة عمر ثنتا
عشرة سنة وستة أشهر وخلافة عثمان ثنتاعشره سنة، ثم خلافة على تكملة
الثلاثين قلت: فمعاوية؟ قال: كان أول المللوك۔ (مسند ابودائود الطيالسى
رقم الحديث ۱۲۰۳ / ۲/ ۱۶۳)۔

ابوداؤد کی روایت ملاحظہ ہو

۳۔ حدثنا سوار بن عبدالله بن سوار: حدثنا عبدالوارث بن سعيد و
حدثنا عمرو بن عثمان: حدثنا هشيم عن العوام بن حوشب، المعنى جمعيا عن
سعيد بن جمهان عن سفينة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم "خلافة
النبوة ثلاثون سنة ثم يؤتى الله الملك أو ملكه من يشاء" قال سعيد: قال لى
سفينةأمسك عليك أبابكر سنتين وعمر عشراً و عثمان اثنتى عشرةو على كذا،
قال سعيد قلت لسفينة: إن هولاء يزعمون أن عليا رضى الله عنه لم يكن
بخليفة، قال كذبت استاه بنى زرقاء، يعنى بنى مروان۔ (ابودائود ۴۶۴۶)

وأخبر عمرو بن عون: حدثنا هشيم عن العوام بن حوشب المعنى جميعا

عن سعید بن جمھان عن سفینۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خلافۃ النبوۃ ثلاثون سنۃ ثم یؤتی اللہ الملک من یشاء۔ أو ملکہ من یشاء۔

(ابوداؤد ۴۶۴۷)

شرح مشکل الآ ثار کی روایت ان الفاظ میں ہے

۴۔ قال حدثنا عبدالرحمن بن زیاد حدثنا حماد بن سلمۃ عن سعید بن ابی جمھان عن ابی عبدالرحمن سفینۃ: سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم وآلہ وسلم یقول: الخلافۃ ثلاثون عاماثم یکون الملک،ثم قال سفینۃ: أمسک سنتین ابوبکر، وعشر سنین عمر،واثنتی عشر سنۃ عثمان، وست سنین علی، فدل ھذا الحدیث أن سنی خلافۃ النبوۃ ھی ھذہ الثلاثون سنۃ التی قد دخلت فیھا مدۃ خلافۃ أبی بکر ومدۃ خلافۃ عمر ومدۃ خلافۃ عثمان ومدۃ خلافۃ علی رضی اللہ عنھم (مشکل الآثار ۴/ ۳۱۳)۔

طبرانی کی ذکر کردہ روایت یہ ہے

۵۔ حدثنا علی بن عبدالعزیز ثنا حجاج بن المھالہ، (ح) وحدثنا المقدام ثنا اسد بن موسی قالاثنا حماد بن سلمۃ عن سعید بن جمھان عن سفینۃ مولی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: الخلافۃ ثلاثون سنۃ ثم یکون ملکاً، قال: أمسک ثنتین أبوبکر وعشراً عمر،واثنتی عشرۃ عثمان وستا علی رضی اللہ عنھم (الطبرانی فی المعجم الکبیر حدیث ۱۳)۔

ترمذی کی روایت حسب ذیل ہے

۶۔ حدثنا احمد بن منیع: أخبرنا سریج بن النعمان، حدثنا حشرج بن نباتۃ عن سعید بن جمھان، قال: حدثنی سفینۃ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: الخلافۃ فی أمتی ثلاثون سنۃ، ثم ملک بعد ذلک، ثم قال لی سفینۃ: أمسک (علیک) خلافۃ أبی بکر، ثم قال: وخلافۃ عمر، وخلافۃ عثمان، ثم قال [لی] أمسک خلافۃ علی قال: فوجدناھا ثلاثین سنۃ، قال سعید: فقلت لہ: إن بنی

أمية يزعمون أن الخلافة فيهم، قال: كذبوا بنوا الزرقاء بل هم ملوك من شر الملوك۔ [قال ابو عيسى:] وفى الباب عن عمر وعلى قالا: لم يعهد النبى صلى الله عليه وسلم فى الخلافة شيئا، [و] هذا حديث حسن قد رواه غير واحد عن سعيد بن جمهان ولا نعرفه إلا من حديثه۔ رواه الترمذى ۲۲۲۶۔

صحیح ابن حبان (بترتیب المصنف) کی روایت یہ ہے

۷۔ أخبرنا الحسين بن عبدالله بن يزيد القطان أبو على بالرقة، حدثنا هشام بن عمار، حدثنا شعيب بن اسحاق، عن الأوزاعى، عن قرة، عن الزهرى، عن أبى سلمة، عن ابى هريرة، قال:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: "كل أمر ذى بال لا يبدأ فيه بحمد الله أقطع"۔ (صحيح ابن حبان:۱۵۳۴)

صحیح ابن حبان (بترتیب المصنف) کی دوسری روایت یہ ہے

۸۔ أخبرنا عبدالله بن محمد الأزدى، حدثنا اسحاق بن ابراهيم، أخبرنا الحبان، عن الزهرى، عن أبى سلمة، عن أبى هريرة قال: أبصر الأقرع بن حابس التميمى النبى صلى الله عليه وسلم: يقبل الحسن بن على، فقال: إن لى عشرة من الولد، ما قبلت أحدا منهم! فقال نبى الله صلى الله عليه وسلم: من لا يرحم لا يرحم۔ (صحيح ابن حبان:۱۵۳۵)۔

الإحسان فى تقريب صحيح ابن حبان (بتريتب ابن بلبان) کی روایت حسب ذیل ہے:

۹۔ أخبرنا محمد بن عبدالله بن عبدالجبار: قال: حدثنا قتيبة بن سعيد، قال: حدثنا أبوالأحوص، عن سماك عن جابر بن سمرة، قال: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يؤخر العشاء الآخرة۔ (ترتيب ابن بلبان لصحيح ابن حبان:۱۵۳۴)

دوسری روایت ان الفاظ میں ہے

۱۰۔ أخبرنا ابن قتيبة اللحمى بعسقلان، قال: حدثنا حرملة بن يحىٰ، قال:

حدثنا ابن وهب، قال: اخبرنا يونس عن ابن شهاب، قال: أخبرني عروة أن عائشة قالت: أعتم رسول الله صلى الله عليه وسلم ليلة من الليالى بصلاة العشاء، وهى التى تدعى العتمة، فلم يخرج رسول الله، صلى الله عليه وسلم حتى قال عمربن الخطاب، نام النساء والصبيان، فخر ج رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال لأهل المسجد حين خرج عليهم، ما ينتظرها أحد من أهل الأرض غيركم، وذلك قبل أن يفشوا الإسلام فى الناس"۔ (الإحسان فى تقريب صحيح ابن حبان ۱۵۳۵)۔

مستدرک حاکم کی روایت ملاحظہ ہو:

۴۶۹۷/۲۹۵: حدثنا أبو العباس محمد بن يعقوب، ثنا إبراهيم بن مرزوق البصرى بمصر، ثنا عبدالصمد بن عبدالوارث بن سعيد، حدثنى أبى ثنا سعيد بن جمهان، عن سفينة أبى عبدالرحمن مولى النبى صلى الله عليه وسلم أن النبى ﷺ قال: وخلافة النبوة ثلاثون سنة قال سعيد: أمسك ابوبكر سنتين وعمر بن الخطاب عشر سنين وعثمان بن عفان اثنتى عشرة سنة وعلى ست سنين۔

(مستدرك حاكم ۱۵۶/۳)۔

اوراس کے حاشیہ پرلکھا ہے ۴۶۹۷۔حذفه الذهبى من التلخيص بضعفه۔

جب کہ مولانا محترم نے اس ایک حدیث کے لئے (۱۴۵-۷۱/۳) یعنی ۶۲/صفحہ کا حوالہ دیا ہے ایسے حوالہ سے بہتر تھا کہ آپ صرف کتب حدیث لکھ دیتے، اور تلاش وجستجو کی ذمہ داری ہمارے حوالہ کردیتے، ایک روایت کی خاطر ۶۲/صفحات کا حوالہ دینے کی کیا وجہ تھی؟ اور مزید برآں ذہبی کی موافقت بھی درج کی ہے۔

قارئین کرام! آپ نے ملاحظہ کیا کہ ہم نے مولانا محترم کے پیش کردہ تمام مراجع کا جائزہ لیا ہے اوران مراجع سے احادیث پیش کردی ہیں، اب آپ ذرا غور کریں کہ مولانا کی کتاب میں موجود''ملک عضوض'' والی روایت ان میں سے کس کتاب میں ان الفاظ کے ساتھ موجود ہے، اور کس سے ان کا مدعا ثابت ہوتا ہے، ان احادیث سے تو اہلِ سنت وجماعت کا موقف ہی ثابت

ہوتا ہے، یہ حدیث ہماری دلیل ہے، ہم حضرت ابوبکر وعمر وعثمان وعلی رضی اللہ عنہم کو خلفائے راشدین مانتے ہیں، جہاں تک مولانا محترم کا تعلق ہے تو یہ حدیث ان کے اوران کے ہمنوا اہل تشیع کے خلاف برہان قاطع ہے۔

حضور والا!

آپ کے نزدیک تو حضرات شیخین غاصب ہیں، ظالم ہیں، کیونکہ ان حضرات نے حضرت علیؓ وعباسؓ رضی اللہ عنہم کو بغیر بتائے سقیفہ بنی ساعدہ میں جا کر چوری چھپے بیعت کر لی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصرار پر بھی یہ لوگ حضرت اسامہؓ بن زیدؓ کے لشکر کے ساتھ روانہ نہیں ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ پر بھی اتنا دباؤ بنا رکھا تھا کہ وہ حضرت علی کی خلافت وولایت کا اعلان نہ کر سکے۔ وغیرہ وغیرہ۔ (العیاذ باللہ)

(دیکھیں ازالہ کا ازالہ: ۹-۱۰)۔

اور رہے حضرت عثمانؓ تو ان پر آپ کا الزام یہ ہے کہ انہوں نے اقربا پروری کی اور سیاسی دباؤ میں فیصلے لئے، جس کی وجہ سے انقلاب آ گیا۔

(ضیاء العلوم میں حسینی صاحب کا خطاب)۔

مولانا محترم!

اگر آپ نے اس حدیث کو حجت مانا ہے تو آپ کو یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ حضرت ابوبکر وعمر و عثمان رضی اللہ عنہم کی خلافت لسانِ نبوت سے ثابت ہے، اور اگر آپ یہ تسلیم کرتے ہیں تو اس کے معنی یہی ہوئے کہ

لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

"ونقذف بالحق على الباطل فيدمغه فاذا هو زاهق" صدق الله العظيم۔

قارئین کرام!

آپ ایک بار پھر بنظر غائر مطالعہ کر لیں، کیا مولانا نے جن حدیثوں کا حوالہ دیا تھا، ان میں یہ "ملك عضوص وجبرية وعتو" وغیرہ کے الفاظ ہیں؟

ہم مولانا محترم کی جرأت وڈھٹائی پر انگشت بدندان ہیں کیا کوئی مسلمان کسی حدیث کے

ساتھ اس طرح کی چھیڑ چھاڑ کرسکتا ہے!! کوئی بھی شخص جس میں ادنی درجہ کا بھی ایمان و اسلام ہو ایسی گستاخی کرسکتا ہے! بہر حال مولانا کی اس جرأت و جسارت کو کیا نام دیا جائے، اسے وضعِ حدیث کہا جائے یا کذب بیانی وافترا پردازی؟ یہ فیصلہ آپ خود کرلیں، مولانا محترم کا حال تو یہ ہے کہ ''کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کھمبا جوڑا''۔

وضع حدیث، شرعی ہدایات اور علما کا موقف:

حضور والا آپ کیسے محدث ہیں؟ حفاظِ حدیث نے اس باب میں کس حزم واحتیاط کا ثبوت دیا ہے اس سے آپ ناواقف نہیں ہیں، حضور والا! حدیث کے باب میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے ورنہ اس کا انجام بھی زبان حق ترجمان سے سن لیجئے

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من حدث عني بحديث يرى أنه كذب فهو أحد الكاذبين (مقدمہ مسلم حدیث نمبر ۱)

اور حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من كذب علي متعمداً فليتبوا مقعده من النار''۔ (مقدمہ مسلم: ۳)

امام نووی فرماتے ہیں: وأما متن الحديث فهو حديث عظيم في نهاية من الصحة، وقيل: إنه متواتر، یہ حدیث ۶۲ صحابہ سے مروی ہے، اور عشرہ مبشرہ نے اس حدیث کو روایت کیا ہے، اس کے علاوہ اور کوئی حدیث اس کثرت سے منقول نہیں، بعض محدثین کی رائے ہے کہ یہ حدیث دوسو صحابہ سے مروی ہے، اور یہ تنہا ایسی حدیث ہے جس کو عشرہ مبشرہ نے مجموعی طور پر نقل کیا ہے۔

بہر نوع! وضع حدیث کا جرم اس قدر شدید ہے کہ اس کے ارتکاب کو نہ صرف اکبر الکبائر گردانا گیا بلکہ ابو محمد الجوینی جیسے محدثین نے حدیث گڑھنے والے کو کافر قرار دیا ہے۔ (موضوع اور ضعیف احادیث کے محرکات)۔

امام یحییٰ بن معین نے اسی جرم میں ''سوید الأنباری'' کے بارے میں مباح الدم ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔ (میزان الاعتدال ۱/ ۴۳۵)

وضع حدیث کے اسباب:

صحابہ کرام نے مشاجرات کے درمیان کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ نہیں بولا، سب سے پہلے روافض نے حضرت علی کی شان میں مرفوع احادیث گڑھنے کی طرح ڈالی اور خوف خدا سے بے نیاز ہوکر یہ لوگ اس قدر بے باک اور جری ہو گئے کہ اپنے غلط مقصد کی تائید کے لیے ہر چیز کو حدیث نبوی بتا دیتے تھے، ایک شیعہ مجتہد کا بیان ہے حماد بن سلمہ فرماتے ہیں کہ روافض کے ایک شخص نے کہا:

"کنا إذا استحسنا شيئاً جعلناه حديثاً"۔ (اللآلی المصنوعة فی الأحادیث الموضوعة ۲/۲۴۸)۔

حضرت علی کے فضائل میں بیشمار احادیث وضع کی گئی ہیں، حافظ ابویعلی الخلیلی نے اپنی کتاب ال ارشاد میں فرمایا ہے کہ حضرت علی کے فضائل میں اہلِ تشیع نے تین لاکھ حدیثیں وضع کی ہیں، حافظ ابن قیم اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں "ولا تستبعد هذا فإنك لو تتبعت ما عندهم من ذلك لوجدت الأمر كما قال"۔ (المنار المنيف:۱۱۶ تحقيق عبد الفتاح أبو غدة)۔

چونکہ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان جنگ صفین ہوئی تو جب روافض کی طرف سے احادیث وضع کی گئیں تو اس کے جواب میں حضرت معاویہؓ کے ہمنواؤں نے بھی احادیث وضع کی ہیں۔

ابن ابی عاصم اور غلام ثعلب اور ابوبکر نقاش نے فضائل معاویہؓ پر مستقل کتابیں تصنیف کیں، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: ليس فيه ما يصح عن طريق الإسناد" اور بعض محدثین نے تو یہاں تک فرمایا کہ فضائلِ معاویہؓ میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہے۔

نوٹ: مولانا حسینی فرماتے ہیں امام اسحق بن راہویہ نے بصراحت ارشاد فرمایا کہ معاویہؓ کے بارے میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہے۔

(زوائد السنن بترتیب صالح احمد الشامی، ازالہ کا ازالہ: ۱۷)۔

حافظ ابن قیم فرماتے ہیں کہ امام اسحٰق بن راہویہ اور دیگر محدثین کے قول کا مطلب یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کا نام لے کر ان کی فضیلت میں کوئی حدیث صحیح نہیں ہے''۔ (المنار المنیف: ۱۱۶)۔

چنانچہ ہم نے حضرت معاویہؓ کے فضائل کو ثابت کرنے والی احادیث اس سلسلہ کی قسط نمبر ۷ میں ذکر کی ہیں، وہاں ملاحظہ کر لی جائیں، اس سے معلوم ہوگا کہ حضرت معاویہ کے فضائل میں صحیح اور مستند روایات بخاری وغیرہ میں مذکور ہیں البتہ ان کا نام لے کر نہیں ہیں اور امام اسحٰق بن راہویہ کے قول کا بھی یہی مطلب ہے، اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ان کی فضیلت کسی حدیث سے ثابت نہیں اور نہ اسحٰق بن راہویہ اس کے منکر ہیں۔

ملک عضوض ایک اجمالی جائزہ:

مولانا حسینی صاحب نے اپنی کتاب ''ملک عضوض'' حضرت معاویہؓ اور بنی امیہ کی مذمت میں تألیف کی ہے، اور اس میں وضاعین وکذابین کی روایتیں جمع کرنے کی سعی فرمائی ہے، اگر کوئی روایت صحیح آ بھی گئی ہے تو اس کے معنی ومفہوم میں مولانا نے کلا بازیاں دکھائی ہیں، ہم ہر ایک روایت پر تبصرہ کر کے آپ کا اور اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے اس لئے اصولی بات ذکر کر دیتے ہیں۔

امام ابن قیمؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ آپ چند ایسے اصول بتا دیں جس سے موضوع روایت کو بغیر سند دیکھے جان لیا جائے، تو امام ابن قیمؒ نے موضوع حدیث کی علامتیں بیان کرتے ہوئے درج ذیل اصول بھی ذکر کئے، ہم ان کی کتاب سے وہ اصول ذکر کئے دیتے ہیں۔

المنار المنیف کی فصل نمبر (۳۸) میں امام ابن قیمؒ نے موضوع حدیث کی علامتیں بیان کیں ہیں، فرماتے ہیں:

۲۵۱ – موضوع حدیث میں وہ احادیث بھی ہیں جو حضرت معاویہ کی مذمت میں ہوں۔

۲۵۲ – ہر وہ حدیث جس سے حضرت معاویہؓ کی مذمت ثابت ہوتی ہو موضوع ہے۔

۲۵۳ – ہر وہ حدیث جو حضرت عمروؓ بن العاص کی مذمت میں ہو موضوع ہے۔

۲۵۴ – ہر وہ حدیث جو بنی امیہ کی مذمت میں ہو موضوع ہے۔

۲۶۲- ہر وہ حدیث جو ولید اور مروان بن حکم کی مذمت پر مشتمل ہو موضوع ہے۔

ابن قیمؒ و دیگر محدثین کی تحقیق اور ان کے پیش کردہ اصول کی روشنی میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ مولانا محترم نے ''ملک عضوض'' نامی کتاب موضوعات سے منتخب فرمائی ہے، مولانا محترم نے پورے ہوش وحواس اور علمی شعور کی حالت میں ابو جناب کلبی، ابو مخنف اور واقدی جیسے کذابین اور وضاعین کی روایتیں درج کی ہیں، حالانکہ ان کو خوب معلوم ہے یہ راوی کس قماش اور کیسی طبیعت کے تھے اور ان کی روایات کا محدثین کے یہاں کیا مقام ہے؟ اور ایک موقع پر انہوں نے خود ان پر اپنے غم وغصہ کا اظہار کیا ہے (دیکھیں مولانا کا رسالہ شیعیت سنیت ناصبیت)، اب مولانا محترم کو ان کی روایات سے اتنا شغف کیوں ہو گیا ہے؟ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کو حضرت معاویہؓ اور ان کے ہمنوا رفقاء سے بغض اور قلبی نفرت ہے۔

ہم ذیل میں چند رواتیں ذکر کرتے ہیں جس سے مولانا محترم کے رسالہ کی حیثیت اور زیادہ مبرہن ہو کر سامنے آجائے گی۔

حضرت مغیرہؓ بن شعبہ:

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کا شمار کبار صحابہ میں ہوتا ہے، آپ بیعتِ رضوان میں شریک تھے، نہایت بیدار مغز قائد اور دانشور ومدبر صحابی تھے، امام زہری سے روایت ہے فرماتے ہیں: **كان دهاة الناس في الفتنة خمسة فمن قريش: عمرو ومعاوية، ومن الأنصار قيس بن سعد، ومن ثقيف المغيرة، ومن المهاجرين عبد الله بن بديل بن ورقاء**''۔

حدیبیہ کے موقع پر قریش کی طرف سے عروہ بن مسعود ثقفی آپ ﷺ سے بات کرنے کے لیے آیا تو وہ دوران گفتگو آپ ﷺ کی داڑھی بار بار پکڑ لیتا تھا، حضرت مغیرہ خود پہنے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے قریب ہی کھڑے تھے، ان سے عروہ کی یہ حرکت برداشت نہ ہو سکی، بول پڑے کہ رسول اللہ ﷺ کی داڑھی مبارک سے اپنے ہاتھ دور رکھو، نہیں تو ہاتھ کاٹ کر پھینک دوں گا'' **كف يدك قبل أن لا تصل إليك**''۔

امام شعبی نے حضرت مغیرہ سے روایت کیا ہے حضرت مغیرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی

انگوٹھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تدفین کے موقع پر قبر اطہر میں گرادی تو حضرت علی نے کہا اٹھا لو، میں نے اس بہانے سے کفنِ مبارک کے اوپر سے ہاتھ پھیرا اور پھر نکال لیا۔ (یہ محبت کے نرالے انداز ہیں) جنگِ یرموک میں آپ کی ایک آنکھ شہید ہوئی تھی۔

حضرت عمرؓ نے ان کو بحرین کا گورنر بنایا، پھر انہیں بصرہ کا بھی گورنر بنایا، حضرت عثمان کے دور میں بھی آپ گورنر رہے، اور حضرت معاویہؓ نے بھی آپ کو گورنر بنایا، صحیحین میں آپ کی ۱۲ حدیثیں منقول ہیں۔ (یہ تفصیل ہم نے سیر أعلام النبلاء سے لی ہے)۔

مولانا محترم کی کتاب ''ملک عضوض'' کا بڑا ماٴخذ امام ذہبیؒ کی سیر أعلام النبلاء ہے، کیا یہ فضائل اور ان کے یہ عظیم کارنامے مولانا کو اس کتاب میں نظر نہیں آئے؟ یا بدنیتی کے ارادہ سے قصداً ان سے تغافل برتا ہے؟۔

مولانا محترم فرماتے ہیں کہ ''کیا معاویہ کو اپنے بیٹے یزید کے حالات معلوم نہیں تھے؟ کیا مغیرہ بن شعبہ کو جب کوفہ میں گورنری سے انہوں نے ہٹایا تھا تو انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ اب میں ان سے یزید کی ولی عہدی کی بات کروں گا، اور جب ان کو یہ مشورہ دیا تو انہیں کوفہ کی گورنر شپ پھر واپس مل گئی اور پھر مغیرہ نے کہا تھا کہ میں نے معاویہ کو ایسی دلدل میں پھنسایا ہے جس سے وہ کبھی نہ نکل سکیں گے''۔ (ازالہ کا ازالہ:۱۶)۔

اسی طرح کی بکواس حضرت والا نے ''ملک عضوض'' کے ۳۸-۴۰ پر کی ہے۔

دراصل یہ سوال مولانا حسینی کا جمہور اہلِ سنت سے نہیں بلکہ اللہ رب العزت سے ہونا چاہئے کہ جس پر حسینی صاحب اتنے خفا ہیں ان کو بیعتِ رضوان میں اللہ تعالی نے کیوں شامل رکھا، اور ان کو اتنے انعامات کی بشارت کیوں دی؟ چنانچہ ان کا یہ اختلاف درحقیقت اللہ تعالی سے ہے کیونکہ حضرت مغیرہ بیعتِ رضوان میں شریک تھے جیسا کہ گذر چکا ہے، اللہ تعالی نے قرآن مجید میں شرکائے بیعت رضوان بشمول حضرت مغیرہ بن شعبہ سے اپنی رضامندی کا اظہار کیا ہے، قرآن کا ارشاد ہے کہ "**لقد رضى الله عن المؤمنين إذ يبايعونك تحت الشجرة فعلم ما فى قلوبهم فأنزل السكينة عليهم وأثابهم فتحاً قريباً**"۔ **(الفتح:۱۸)**۔

اور مولانا محترم نے اپنی ناراضگی کا اظہار ''ازالہ کا ازالہ'' اور ''ملک عضوض'' میں کر دیا ہے، اب یہ معاملہ خدائے احکم الحاکمین کے سپرد ہے اور روز محشر اس کا فیصلہ وہیں ہو کر رہے گا۔

سیدنا حضرت معاویہؓ:

عن أم حرام أنها سمعت رسول الله ﷺ يقول: أول جيش من أمتي يغزون البحر قد أوجبوا"۔

حضرت ام حرامؓ نے خود اس غزوہ میں شرکت کی، فخرجت مع زوجها عبادة بن الصامت غازيا أول ما ركب المكسلمون البحر مع معاوية"۔ (بخاری: ۲۷۹۹-۲۸۰۰)۔

فائدہ:

بخاری حدیث ۲۹۲۴ سے معلوم ہوا کہ اس امت کا پہلا گروہ جو سمندری جہاد کرے گا وہ جنتی ہوگا، اور بخاری کی دیگر روایات ۲۸۰۰-۲۷۹۹ سے معلوم ہوا کہ پہلا غزوہ حضرت معاویہؓ نے کیا، یعنی صحیح بخاری کی حدیث کی صراحت کے بموجب حضرت معاویہؓ جنتی ہیں۔

یزید بن معاویہؓ:

آپ ﷺ نے فرمایا کہ "أول جيش من أمتي يغزون مدينة قيصر (قسطنطينية) مغفور لهم"۔ (بخاری: ۲۹۲۴)۔

قال محمود بن ربيع فحدثتها قوماً فيهم أبو أيوب صاحب رسول الله ﷺ فى غزوته التي توفي فيها ويزيد بن معاوية عليهم بأرض الروم"۔ (بخاری:۱۱۶۸)۔

بخاری کی حدیث نمبر ۲۹۲۴ سے معلوم ہوا کہ جو جماعت سب سے پہلے قیصر کے شہر پر حملہ کرے گی وہ جنتی ہے اور بخاری کی حدیث نمبر ۱۱۸۶ سے معلوم ہوا کہ یہ سعادت یزید بن معاویہؓ کو حاصل ہوئی، اور اس جماعت میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ بھی شریک تھے، یعنی صحیح بخاری کی صراحت کے روشنی میں یزید جنتی ہے۔

فاتح مصر عمرو بن العاصؓ:

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص بڑے جلیل القدر صحابی ہیں اور مکثرینِ صحابہ میں ان کا

شمار ہوتا ہے، حضرت عمرو بن العاص کے انتقال کے وقت ان کے پاس موجود تھے، اور اپنے والد محترم عمرو بن العاص کو تسلی دے رہے تھے کہ ابا جان اللہ پر بھروسہ رکھئے، کیا رسول اللہ ﷺ نے آپ کو فلاں فلاں خوشخبری نہیں دی تھی، فجعل ابنه يقول ياأبتاه: أما بشرك رسول الله ﷺ بكذا ؟ أما بشرك رسول الله ﷺ بكذا ؟۔ (مسلم: ۱۲۱)

مسلم کی اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرو بن العاص جنتی ہیں، ظاہر ہے کہ انتقال کے وقت نبوی بشارت کے ذکر سے اس کے علاوہ اور کیا مراد لیا جا سکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مولانا محترم نے اپنے رسالہ ''صحابہ'' ''ازالہ کا ازالہ'' اور ''ملک عضوض'' میں جس بھونڈے انداز میں حضرات صحابہ حضرت معاویہؓ عمرو بن العاصؓ، اور مغیرہؓ بن شعبہ کو نشانہ بنایا ہے اس سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ مولانا محترم کا اختلاف درحقیقت جمہور اہلِ سنت سے نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول سے ہے ورنہ کیا وجہ تھی کہ اللہ و رسول ﷺ جس کے بارے میں جنتی ہونے کی بشارت دیں اور جن کے فضائل زبانِ نبوت سے ثابت ہوں، مولانا محترم ان کے خلاف ہرزہ سرائی کریں، اور ان کے تعلق سے ذہن و دماغ میں بدگمانیاں بسائے رہیں، یہ قطعی طور پر ایمان و اسلام کے منافی ہے کہ کوئی شخص اللہ و رسول ﷺ کے فیصلہ کی مخالفت کرے، اور اسے قبول نہ کرے قرآن کریم کا ارشاد ہے: ما كان لمؤمن ولا مؤمنة إذا قضى الله ورسوله أمراً أن يكون لهم الخيرة من أمرهم، ومن يعص الله ورسوله فقد ضل ضلالاً مبيناً۔

یہ قرآنی حدود و ضوابط ہیں، یہ نبوی قرار دادیں ہیں، اور فیصلے ہیں، جس کے مطابق صحابہ ومبشرین بالجنۃ کے خلاف ہرزہ سرائی کو گمراہی قرار دیا گیا ہے۔

مروان بن حکم

مروان بن حکم جلیل القدر تابعی اور ثقہ روای ہیں جن سے امام بخاری، امام احمد، امام مالک اور دیگر محدثین نے روایتیں لی ہیں، امام مالک نے تو کئی جگہ اپنے فتوی کی بنیاد ہی مروان کے فیصلہ پر رکھی ہے، سہل بن سعد الساعدی صحابی ہیں لیکن انہوں نے مروان سے روایت کی ہے۔

مروان کے خلاف کلام کر کے اور ان کی ثقاہت وایمان پر عدمِ اطمئنان کا اظہار کر کے مولانا محترم نے تمام ائمہ محدثین وناقدینِ حدیث سے اختلاف کیا ہے، تو یہاں درحقیقت مولانا کا اختلاف ائمہ محدثین ومجتہدین سے ہے اور وہ تمام محدثین جنہوں نے مروان پر اعتماد کیا ہے مولانا کے اس سوال کے جوابدہ ہیں۔

عبدالملک بن مروان:

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "لا يزال الإسلام عزيزا إلى اثني عشر خليفة"۔ (مسلم:۱۸۲۱)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے "أول هذا الأمر نبوة ورحمة ثم يكون خلافة ورحمة ثم يكون ملكا ورحمة"۔ (رواہ الطبرانی وقال الہیثمی فی المجمع رجالہ ثقات)۔

اور اللہ رب العزت کا ارشاد ہے "هو الذي أرسل رسوله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين كله ولو كره المشركون"۔ (سورة التوبة:۳۳)۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثتِ مبارکہ کا مقصد اِعلاءِ کلمۃ اللہ اور غلبۂ دین ہے، اور مسلم شریف کی روایت سے معلوم ہوا کہ یہ دین ۱۲ خلفاء کا تک غالب رہے گا، حکمرانوں کے تمام عیوب ونقائص کے باوجود اسلام کی حقانیت اور بالا دستی قائم رہے گی۔

اور طبرانی کی مذکورہ روایت اس امر کی دلیل ہے جب تک اس روئے زمیں پر حق اپنی تابانی کے ساتھ موجود رہے گا، اور دین کا غلبہ رہے گا یہ دور ملوکیت اور بادشاہت کے ہونے کے باوجود "رحمت" کا دور کہا جائیگا، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں عبدالملک بن مروان کو بارہ خلفاء میں شمار کیا ہے۔

دراصل عبدالملک بن مروان کے سلسلہ میں شارحینِ حدیث اور علمائے عظام سے مولانا محترم کا اختلاف ہے، اسلئے کی جمہور اہلِ علم جس فکر وعقیدہ کے قائل ہیں اور احادیث کے مدلولات جو ان کے نزدیک ہیں، مولانا محترم نے بہت شدت کے ساتھ ان کا انکار کیا ہے، اور اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کی کوشش کی ہے، کیونکہ حضراتِ محدثین کے یہاں جو شخص

خلفاء میں شامل ہے، حضور والا اس کے اسلام وایمان اور اس کے دور رحمت ہونے کا انکار کرتے ہیں، اور اسکے سلسلہ میں بے اطمینانی کا اظہار کرتے ہیں۔

فإلی اللہ المشتکی، (جاء الحق وزهق الباطل إن الباطل كان زهوقا)۔

قارئین کرام!

اس رسالہ (ملک عضوض) کے تعاقب میں جو لکھ دیا گیا اتنا بہت کافی ہے، جبکہ یہ رسالہ علمی خیانتوں اور موضوع روایات کی کثرت کی بنیاد پر اس کا مستحق نہیں تھا کہ اس پر توجہ صرف کی جائے۔

اخیر میں مولانا محترم سے درخواست ہے کہ فضائل حضرت علیؓ میں جو تین لاکھ احادیث وضع کی گئی ہیں ان کو جمع کرنے کا اہتمام فرمائیں تا کہ ان احادیث کی بنیاد پر حضرت علیؓ کو خلیفۂ بلافصل اور وصی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ثابت کیا جا سکے بلکہ ان کی الوہیت تک کے عقیدہ پر ان احادیث سے استدلال کیا جا سکے، یہ کام آپ سے زیادہ بہتر انداز میں بھلا اور کون کر سکتا ہے؟ کیونکہ اب تک آپ کی کسی کتاب سے، اور ان میں موجود قرآن وصحیح احادیث سے آپ کا موقف مؤید نہیں ہو سکا، ماشاء اللہ! آپ کی کتابوں سے جس فکر وعقیدہ کا ترشح ہو رہا ہے اور آپ کا منہج استدلال جس کا انداز کا ہے اس اعتبار سے آپ ہی اس عظیم ذمہ داری کے اہل ہیں آپ کی نگاہ میں اس فکر وعقیدہ کے تمام مراجع ومصادر تو ہوں گے ہی، اور نہ بھی ہوں تو کیا ہوا؟ آپ کو ان مصادر کی احتیاج بھی کہاں ہے، ہماری نظر میں اس سعادتِ بیش بہا کے سب سے زیادہ حقدار آپ جیسے مجتہدِ دوراں ہی ہیں اور "صاحب البيت أدرى بما فيه" کا مصداقِ حقیقی آپ سے بڑھ کر اور کوئی نہیں ہے۔

قسط نمبر-۲۹

مولانا سلمان حسینی صاحب کی نادر تحقیقات کے سلسلہ نمبر ۶ میں ہم نے مولانا محترم کے قرآن کریم کے تیس پاروں کی تقسیم کے نظریہ کے تعلق سے کچھ معروضات احباب کی خدمت میں پیش کی تھیں، اور احباب کے سامنے اپنے عدمِ اتفاق کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ مولانا محترم کی یہ کاوش توارثِ سلف کے مخالف اور ایک نئے فتنہ کا سامان ہے تو اس پر بعض احباب نے ناگواری کا اظہار کیا تو بعض نے ہم پرستی شہرت کے حصول کا الزام لگایا- عفا اللہ عنہم۔

آج چونکہ ذرائعِ ابلاغ کا دور ہے، جدید سہولیات سے آراستہ ٹیکنالوجی کے اس دور میں بہت سی ایسی چیزیں حاصل ہوجاتی ہیں جو پہلے حاصل نہیں ہو پاتی تھیں، چنانچہ ہم یہاں شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی -دامت برکاتہم- کا ایک مکتوب جو کہ مفتی صاحب نے مولانا سلمان صاحب کو ارسال کیا تھا یہاں پر من وعن نقل کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ احباب جو مولانا سلمان صاحب کے متعلق ان کی سابقہ خدمات کی وجہ سے حسنِ ظن میں مبتلا ہیں ان کے لیے بھی غور وفکر کی کچھ راہیں ہموار ہوں اور ان کو از سر نو مولانا سلمان صاحب کے نظریۂ صحابہ اور نظریۂ تقسیمِ اجزائے قرآن کے متعلق جائزہ لینے کا موقع ملے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گرامی قدر مکرم جناب مولانا سلمان ندوی صاحب-حفظہ اللہ-

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں پچھلوں دنوں جدہ میں تھا تو مجھے ایک صاحب نے ایک لفافہ پہنچایا جس کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ یہ آپ نے مجھے بھیجا ہے اور اس پر مرسل کی جگہ پر آپ ہی کا اسم گرامی تھا اندر کوئی خط نہیں تھا، بلکہ ترتیب وتدوین قرآنی کے عنوان سے ایک کتابچہ کی فوٹو کاپی تھی جس پر مؤلف کے طور پر آپ کا اسم گرامی درج تھا، اس میں ابتدائی تین صفحوں کے بعد بندے کی کتاب

علوم القرآن کا ایک طویل اقتباس درج ہے، آپ نے اس اقتباس پر جو ہمت افزائی کے الفاظ لکھے ہیں ان پر میں آپ کا شکر گذار ہوں، البتہ کتابچہ کی ابتداء میں آپ نے قرآن کریم کے پاروں کی موجودہ ترتیب سے اختلاف کرتے ہوئے پاروں کی نئی ترتیب تجویز فرمائی ہے اوراس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اس ترتیب میں قرآن کریم کے معنی کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا بلکہ بسا اوقات ناتمام بات پر پارہ ختم ہوگیا ہے، اسے پڑھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور تشویش بھی، چنانچہ اس سلسلے میں مجھے آپ سے چند اہم گزارشات کرنی ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) اگر بالفرض آپ کی بات سو فیصد درست ہو تب بھی اس مسئلہ کو شدت کے ساتھ اٹھانے میں مجھے شدید خلفشار بلکہ فتنے کا خطرہ محسوس ہوتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بناء ابراہیمی پر کعبہ شریف کی تعمیرِ نو اس لئے ترک فرمائی ہے کہ اس سے فتنے کا اندیشہ تھا حالانکہ قریش کی بنیاد پر کعبہ شریف کو باقی رکھنے میں استقبالِ قبلہ کے بعض مسائل پر اثر پڑتا ہے، پھر جب حجاج بن یوسف نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی تعمیرِ نو کو ختم کرکے قریش ہی تعمیر کو برقرار رکھا اور پھر بعد میں مہدی بن منصور نے اسے دوبارہ بناء ابراہیمی پر تعمیر کرنے کا ارادہ کیا تو حضرت امام مالکؒ نے اسی لئے منع فرمایا کہ اس طرح کعبہ بازیچۂ سلاطین بن جائے گا۔

اسی طرح ہندوستان کی بہت سی مسجدیں قبلہ کی حقیقی سمت سے کچھ ہٹی ہوئی تھیں بعض لوگوں نے انہیں منہدم کرنے اور ازسرنو تعمیر کرنے کی تجویز پیش کی تو علماے ہندوستان نے اس کی مخالفت کی اور قدیم محرابوں کو باقی رکھا حالانکہ وہاں بھی قبلہ کی حقیقی سمت کا مسئلہ تھا۔

قرآن کریم کی موجودہ تیس پارے اپنی ترتیب کے ساتھ صدیوں سے مقبول چلے آرہے ہیں ان کو بے بنیاد قرار دے کر ازسرنو ترتیب کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے اور اس مسئلے کو اٹھانے کا نتیجہ میرے نزدیک سوائے انتشار اور قرآن کریم کے بارے میں ایک نئے مباحثہ کا دروازہ کھولنے کے سوا کچھ فائدہ نہیں، اور میرے علم میں آیا ہے کہ اس پر مباحثہ کا دروازہ کھل چکا ہے، ایک ایسے وقت میں جبکہ امت کے سامنے چند در چند مسائل ہیں ایک نئے جدال کا دروازہ کھولنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

(۲) آپ نے فرمایا ہے کہ ''پاروں کی تقسیم اگر حروف والفاظ کی تعداد کی بنیاد پر کی گئی ہے تو

غلط کام کیا گیا ہے، قرآن حسابی اور ریاضی تقسیم کے لیے نہیں ہے'' اور یہ کہ ''یہ قرآن کے معانی پر سخت ظلم ہے'' اور ''ان دونوں ترتیبوں کا مرتب کون ہے؟ آج تک عوام کو کیا اہل علم کو بھی اس کا علم نہیں''۔

یہ درست ہے کہ مرتب کا تعیین کے ساتھ علم نہیں ہے لیکن مرتب یا مرتبین جو بھی ہوں بندے کے خیال میں وہ مقبول من اللہ ضرور تھے، کہ ان کی اس ترتیب کو صدیوں سے پورا عالم اسلام بلا اختلاف قبول کرتا چلا آرہا ہے، اور کچھ بعید نہیں کہ یہ ترتیب خیر القرون کے دور سے ہو جیسا کہ اس کے بعض اشارے بھی ملتے ہیں، ایسی صورت میں نہ صرف مرتب بلکہ صدیوں سے اس ترتیب پر عمل کرنے والوں کے بارے میں ایسا انداز اختیار کرنا جو ان کی تجہیل وتحمیق پر منتج ہو کسی طرح بھی آپ کے شایانِ شان نہیں۔

(۳) یہ بات کہ پاروں کی تقسیم معانی کے اعتبار سے نہیں ہے اتنی واضح ہے کہ اس پر کوئی دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں، اور پاروں کا مرتب کوئی بھی ہو یقیناً اس پر بھی یہ بات مخفی نہیں تھی، یہ بات بھی واضح ہے کہ رکوع اور سورتوں کی ترتیب معانی کے اعتبار سے ہے، لہٰذا اگر کسی نے کوئی دوسری ترتیب کسی اور اعتبار سے کی ہے تو چنداں وہ قابلِ اعتراض نہیں، درحقیقت یہ ترتیب قرآن کریم کے حروف کی تعداد کے اعتبار سے ہے، اور اس کا مقصد بظاہر روزانہ تلاوت کی ایک مساوی مقدار طے کرنا ہے، یہ بات نہیں بھولنی چاہئے کہ قرآن کریم کا اصل مقصد اگرچہ ہدایت ہے جو اس کے معانی سے حاصل ہوتی ہے لیکن اس کی تلاوت چاہے سمجھے بغیر ہو وہ بھی ایک مستقل عبادت اور "یتلو علیھم آیاته" کے تحت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک مستقل فرضِ منصبی ہے، اسی کے تحت ہر حرف پر دس نیکیاں ملنے کی بشارت دی گئی ہے، چاہے وہ سمجھے بغیر پڑھا جائے، نماز میں فریضہ قراءت کی ادائیگی کے لیے ادھورے مفہوم کی آیات بھی کافی ہوجاتی ہیں، اور خیر القرون میں دس دس آیتوں کی تعلیم اور ان پر نشان لگانا بھی معنی کے لحاظ سے نہیں، بلکہ تلاوت کی آسانی ہی کے لیے تھا، لہٰذا اگر کسی بندۂ خدا نے روزانہ معمول کے لیے حروف کی کوئی تعداد تلاوت کی غرض سے بنا دی ہے تاکہ روزانہ ایک معمول کے مطابق حروف کی ایک تقریباً مساوی تعداد کی تلاوت ہوجایا کرے اور امت نے اس عمل کو بلا اختلاف قبول کرلیا تو اس پر

اعتراض اٹھا کر نئے سرے سے ترتیب کی دعوت دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ کعبہ کو بناء ابراہیمی پر تعمیر کرنے کی دعوت ہے جس کو امام مالک نے کعبہ کو بازیچۂ سلاطین بنانے سے منع فرمایا تھا۔

(۴) آپ اگر آج ایک نئی ترتیب اس معنی میں قائم میں کرنا چاہتے ہیں کہ پارہ کسی نئے مفہوم سے شروع ہو تو اس میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں: ایک یہ کہ آپ کی نظر میں جہاں سے پارہ شروع ہونا چاہئے کسی دوسرے کو اس معنی کے لحاظ سے اس سے اختلاف ہوسکتا ہے اور وہ کہیں اور سے پارہ شروع کرسکتا ہے، اس کی کیا وجہ کیا ہوگی کہ آپ کی تجویز ہی پر سب متفق ہوں ؟ مثلاً آپ فرماتے ہیں کہ پانچواں پارہ یا تو "حرمت علیکم" سے شروع ہو یا "یاأیها الذین آمنوا لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل" سے یا "ومن لم يستطع منكم طولا" سے، جب تینوں احتمال ہیں تو تینوں رائیں ہوسکتی ہیں، آپ نے اگر "**حرمت علیکم**" سے شروع کرنے کو اختیار فرمایا ہے تو دوسرے کو حق ہے کہ وہ دوسرے احتمال پر عمل کرکے پارے کا آغاز کہیں اور سے کرے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ عالمِ اسلام کے بہت سے ممالک میں پاروں کو نمبروں سے زیادہ ان کے ناموں سے پہچانا جاتا ہے، مثلاً پانچویں پارے کو "والمحصنات" کا پارہ کہا جاتا ہے، اور ہمارے مصاحف میں یہ نام لکھا بھی جاتا ہے، اب اگر اسے آپ کی تجویز کے مطابق کہیں اور سے شروع کیا جائے تو اس پارے کو "حرمت علیکم" کا پارہ کہیں گے یا "یا أیها الذین آمنوا" کا یا بدستور وہ "والمحصنات" ہی کہلائے گا؟ پہلی سورت میں کیا لوگوں کے لیے ایک نئی مشکل کھڑی نہیں ہوجائے گی؟ نیز کیا اس پر آپ لوگوں کو متفق کرسکیں گے؟ اور کیا اس سے لوگوں کے ذہن میں خلفشار پیدا نہیں ہوگا؟، اور اگر پارہ "والمحصنات" ہی کہلائے گا تو کسی اور جگہ سے شروع کرنے کا فائدہ کیا ہوا؟ اب بھی بہت سے مصاحف ایسے ہیں جن میں نیا پارہ نئے صفحے سے شروع نہیں ہوتا، اس وقت بھی ایسا ہی ہوگا۔

(۵) آپ کو جو تشویش ہے اس کا سیدھا سادہ حل یہ ہے کہ اہلِ مدارس و مکاتب کو اس طرف متوجہ کیا جائے کہ وہ رکعت ختم کرنے میں پارے کی انتہا کے بجائے رکوعات پر ختم کرنے تربیت دیں اگر لوگوں کو اس طرح تربیت دینے کا اہتمام کیا جائے تو مقصد کسی نئے خلفشار کو جنم

دیئے بغیر حاصل ہوسکتا ہے اس کے لیے نہ ترتیبِ نو ضرورت ہے اور نہ تواتر سے چلی آئی ہوئی ترتیب کو غلط اور بے بنیاد قرار دینے کی، اس کوشش کا ان شاء اللہ کچھ نہ کچھ نتیجہ ضرور نکلے گا، لیکن ترتیبِ نو کی کوشش کا کوئی نتیجہ بجز خلفشار کے مجھے نظر نہیں آتا۔

(۶) قرآن کریم کے اس وضع کے بارے میں جو تعامل صدیوں سے چلا آرہا ہے اس کے بارے میں آپ کے یہ فقرے کہ ''روایت پرستی اور تقلید کا مزاج امت میں اتنا پختہ ہے الخ'' اور ''اس بے بنیاد ترتیب کا اس درجہ رواج تعجب انگیز ہے اور لائقِ تنقید بھی'' نیز ''ربما یود الذین سے چودھواں پارہ شروع کرنے کی کیا مصیبت ہے؟'' اس ذہن کی عکاسی نہیں کرتے جس کی آپ جیسے اہلِ علم سے توقع ہونی چاہیئے، یہی ذہن آگے بڑھ کر نہ جانے کیا کیا صورتیں پیدا کر چکا ہے۔

اگر یہ مضمون کسی اور کا ہوتا تو شاید میں اس پر لکھنے کی کی ضرورت نہ سمجھتا لیکن آپ سے جو تعلقِ محبت رہا ہے اور ہے، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب قدس سرہ سے آپ کو جو نسبت حاصل ہے اس کے پیشِ نظر مجھے یہ برادرانہ گذارشات پیش کرنا مناسب معلوم ہوا، اگر اس میں مجھ سے کوئی گستاخی ہوئی ہو تو اس پر میں معذرت خواہ ہوں۔

والسلام

بندہ محمد تقی عثمانی

۲۱/۱۱/۱۴۳۶ھ

قسط نمبر ۔ ۳۰

مولانا سلمان حسینی ندوی صاحب کا اجماعِ امت کے خلاف ایک ناپسندیدہ اقدام

مولانا حسینی صاحب نے اپنی زندگی میں بیشمار کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں، اور یوں لگتا ہے کہ جیسے ہر وہ عمل جس سے امت کی زبوں حالی میں اضافہ ہوتا ہو، یا ذہنی انتشار اور خلفشار سے امت کے دوچار ہونے کا امکان ہو اس عمل کو بڑی توجہ اور اہتمام سے انجام دیتے ہیں، ممکن ہے ان کا ارادہ ایسا نہ ہو لیکن بظاہر ان کے اکثر اقدامات اور اس سے ظہور میں آنے والے نتائج اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، اس قسط میں ان کے تمام ناروا اقدامات، نادر تحقیقات اور پریشاں خاطری پر مبنی کاوشوں کا تذکرہ مقصود نہیں بلکہ یہاں ان کے صرف ایک اقدام سے آگاہ کرانا مقصود ہے، اور وہ ہے قرآن کی ''نزولی ترتیب'' کے اعتبار سے طباعت، مولانا محترم کا یہ اقدام نہ صرف یہ کہ اجماعِ امت کے خلاف ہے، بلکہ عوام الناس کے لئے بڑے فتنہ کا سامان بھی ہے، ایسے حالات میں جب امتِ مسلمہ کے سامنے بیشمار چیلنجز ہوں اور داخلی وخارجی ہر اعتبار سے وہ نت نئے مسائل کا شکار ہو، اتحاد کا شیرازہ پارہ پارہ ہو چکا ہو، مختلف قسم کے مسلکی وگروہی اختلافات جسے کسی طور متحد نہ ہونے دے رہے ہوں، ایسے حالات میں ایک نئے فتنے کی آمد اور نئے انتشار کے راہ ہموار کرنا کیا کسی نیک نیتی کا جذبہ کہا جا سکتا ہے؟۔

ہم نے اپنے سلسلہ تعاقب بنام ''مولانا سلمان حسینی کی نادر تحقیقات'' میں بھی اس رائے کا جائزہ لے کر اہلِ علم کے اقوال اور متقدمین کی آراء کی روشنی میں اس کا غلط ہونا واضح کر دیا ہے، مولانا محترم کا یہ عمل کسی بھی طور پر درست نہیں ہے، اور امت کے قدیم طرزِ عمل کے خلاف بھی ہے۔

مولانا محترم نے اپنے ''مقدمۂ قرآن کی نزولی ترتیب'' میں فرماتے ہیں:

آج حالات پر قرآن کو منطبق کرنا مشکل ہوگیا ہے، اس کو جلالین زمخشری، اور آلوسی کے درجوں کی چہار دیواری میں محفوظ کر دیا گیا، جواب دینے والے بہت سے جواب دیدیں گے، اور اپنی تسلی یا فتح کا ڈھنڈورا پیٹ دیں گے، لیکن تنزیل قرآنی کا حق ادا کرسکیں گے، اور نہ اپنی وضع اور روش بدلیں گے'' ۔ (مقدمہ قرآن کی نزولی ترتیب: ۱۵)

آگے ارشاد فرماتے ہیں:

''یہ خیال رہے کہ مکمل سورتوں کے بارے میں ایک ہی وقت میں نزول کا دعوی صحیح نہیں، اور متعدد سورتوں کے بارے میں مکی اور مدنی کا اختلاف بھی رہا ہے'' ۔

حضور والا! جب آپ کو اقرار ہے مکمل سورتیں ایک ہی بار میں نازل نہیں ہوئیں، بلکہ چند آیات کبھی اس سورت کی نازل ہوئیں اور پھر چند آیات دوسری سورت کی، اور آپ ﷺ کی ہدایت کے مطابق ان نازل شدہ آیات کو ان کی مناسب جگہ مرتب کر دیا جاتا تھا، اس طرح درپیش مسائل کا حل ہوتا رہتا تھا اور موقع ومحل کے اعتبار سے مناسب رہنمائی ملتی رہتی تھی، اب اگر اسے سورت کے اعتبار سے مرتب کیا جائے تو حقیقی ترتیب کیونکر کہلانے کی مستحق ہوگی؟ مثلاً سورہ علق کی پانچ آیات سب سے پہلے نازل ہوئیں، پھر سورہ مدثر ومزمل وغیرہ کی آیات نازل ہوئیں، مولانا محترم نے اپنی ''نزولی ترتیب'' میں پوری سورہ علق پہلے نمبر پر نقل کر دی ہے، تو بھلا آپ ہی فیصلہ کریں کہ مولانا محترم نے جس ترتیب قرآن کا بلند بانگ دعوی کیا ہے، کیا ان کا یہ طرز عمل بھلا ان کے دعوی کی دلیل بن سکتا ہے؟ اگر نہیں تو اتنا بڑا دعوی کس غرور علم کی بنیاد پر کیا گیا؟ اور لوگوں کو اس نئے فتنہ میں مبتلا کرنے کے پسِ پردہ ان کے مقاصد کیا ہیں؟ ۔

واقعہ یہ ہے نزول قرآن کے چودہ سو سال بعد اگر کوئی شخص یہ دعوی کرتا ہے کہ وہ قرآن کریم کا نزولی ترتیب کے اعتبار سے کوئی نسخہ پیش کرسکتا ہے، تو اس کا یہ دعوی یقینا جہالت ولاعلمی پر مبنی ہے، اس کے علاوہ کسی اور صورت میں یہ دعوی صحیح نہیں ہوسکتا ہے، جبکہ تاریخی حقائق اس بات کی صداقت کے گواہ ہیں کہ مصحف عثمانی کی تدوین کے بعد اب نہ مصحف علی؄ موجود ہے، اور نہ ہی دیگر مصاحف، علامہ سیوطیؒ نے احادیث وآثار کی بنیاد پر صرف سورتوں کی ترتیب وتعیین ذکر کی ہے، اور ظاہر ہے سورتوں کے ساتھ آیات کی ترتیب وتعیین یا اس کا نسخہ شائع نہیں کیا، مولانا محترم کا

کمال ہے کہ سورتوں کی ترتیب وتعین کے ساتھ انہوں نے مکمل قرآن کریم کا نسخہ شائع کر دیا ہے، اس میں آیات کی ترتیب اور ان کی تقدیم وتاخیر کے ان کے پاس دلائل کیا ہیں اس کا تذکرہ نہیں کیا۔

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کا ایک طویل اقتباس پیش ہے جس سے اس مسئلہ کو سمجھنے میں کافی مدد ملے گی:

قرآن کریم کی ترتیب وتدوین

''لیکن عہد عثمانی میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ کے مجلد کراتے ہوئے قرآن کی نقلیں حکومت نے مرکزی صوبوں میں تقسیم کر کے یہ حکم مسلمانوں کو جب دیا کہ سورتوں کی ترتیب میں بھی اسی پابندی کی جائے، اور اس حکم کے بعد دوسری ترتیب سورتوں میں بھی قانوناً ممنوع قرار دی گئی، تو اسوقت سے یہ اختلاف بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

باقی یہ سوال کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد حکومت میں جس ترتیب سے سورتوں کی جلد بندی کرائی تھی آیا یہ صحابہ کی رائے سے فیصلہ کیا گیا تھا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے یہ ترتیب سورتوں میں قائم کی گئی، کوئی واضح روایت اس باب میں نہیں ملتی، لیکن امام مالکؒ فرمایا کرتے تھے کہ:

"إنما ألفوا القرآن على ما كانوا يسمعونه من النبي ﷺ"۔ (اتقان: ۱/ ۶۲)

ترجمہ: ''یعنی اس وقت قرآنی سورتوں میں ترتیب اس ترتیب کی پیروی میں دی گئی جس ترتیب سے صحابہ قرآن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنتے تھے''۔

امام مالکؒ کی اس تاریخی شہادت کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ جس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوئی، جبرئیل علیہ السلام کو اس سے پہلے جو رمضان گزرا تھا، دو دفعہ قرآن آپ نے سنایا تھا۔

یہ روایت بخاری (۱/ ۳) وغیرہ تمام صحاح کی کتابوں میں پائی جاتی ہے اس وقت تک بجز چند آیتوں کے قرآن پورا نازل ہو چکا تھا، پس جس ترتیب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبرئیل کو سنایا تھا، کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ سورتوں کی جلد بندی میں اس طرز عمل کی پیروی نہ کی جاتی پس

سورتوں کی ترتیب کا مسئلہ بھی اس لحاظ سے جبرئیل امین ہی کا توثیق یافتہ ہے، اور خدا کا فضل ہے کہ عہدِ عثمانی کے اس فرمان کے بعد جس میں عہدِ صدیقی کے مرتبہ مصحف کی پیروی ہر مسلمان کے لئے لازم کر دی گئی، اس وقت تک مسلمان مشرق ومغرب میں اول سے آخر تک اسی کے پابند ہیں، البتہ ضرورتاً جیسے بچوں کی تعلیم وغیرہ کی سہولت کے لئے کبھی اس آزادی سے نفع اٹھالیا جاتا ہے جو اس فرمان کے نفاذ سے پیشتر صحابہ میں پائی جاتی تھی۔

خلاصہ یہ ہے کہ گو قرآن کے پڑھنے پڑھانے کے سلسلے میں تجویدی خدمات اور اس کے سمجھنے سمجھانے میں تفسیری کارناموں کے سوا خود قرآن کے لکھنے لکھانے میں بھی مسلمانوں نے جن اولوالعزمیوں کا بھی ثبوت دیا ہو عربی غیر عربی ہر قسم کے مسلمانوں کے لئے قرآن کا پڑھنا آسان ہو جائے، اس کے لئے انہوں نے جو کچھ بھی کیا ہو حروف میں غیر معمولی محاسن پیدا کئے، اعراب وزیر وزبر وپیش، جزم تشدید وغیرہ جیسی ایجادیں کی گئیں حتی کہ یہ واقعہ ہے کہ قرآن کو مسلمانوں نے سونے موتی اور مختلف قسم کے جواہر کے سیال محلول سے بھی بکثرت لکھوایا، اور کیا کیا بتاؤں کہ اس تیرہ سو سال کے عرصے میں کیا کچھ نہیں کیا۔

لیکن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے چودہ (۱۴) سو سال بعد عہد عثمانی میں قرآنی سورتوں کی جس ترتیبی شکل پر اتفاق واجماع قائم ہو گیا، اس کے متعلق یہ خیال کہ اس دور میں ردو بدل کی کسی حیثیت سے بھی کچھ امکان ہے خیال تو خیال حقیقت یہ ہے کہ کسی زمانہ میں کسی کو کسی قسم کا خطرہ بھی اس وقت تک نہ ہوا تھا، جب تک عیسائی پادریوں نے استشراقی کھال اوڑھ کر اغوائی القاء اور وسوسہ اندازیوں کی مہم شروع نہ کی تھی، لیکن:

"يأبى الله إلا أن يتم نوره ولو كره الكافرون"۔ (التوبة: ۳۲)۔

مولانا گیلانی نے جس حقیقت کا اظہار فرمایا قاضی ابوبکر نے "الانتصار" میں کچھ اسی قسم کا تبصرہ کیا ہے، فرماتے ہیں:

"وإنما قصد (عثمان) جمعهم على القراءة الثابتة المعروفة عن النبی ﷺ وإلغاء ماليس كذلك، وأخذهم بمصحف لا تقديم فيه ولا تأخير"۔

(الإتقان: ۱/ ۲۱۳)

صاحب مناہل العرفان نے اپنی کتاب میں یہ عنوان قائم کیا ہے

احترام هذا الترتيب

وسواء كان ترتيب السور توقيفيا أم اجتهاديا فإنه ينبغي احترامه خصوصاً في كتابة المصحف، لإنه من إجماع الصحابة والإجماع حجة، وإن خلافه يجر إلى الفتنة، ودرأ الفتنةوسد ذرائع الفساد واجب"۔

(مناهل العرفان ترتيب آيات القرآن وسورة: البحث التاسع)۔

قسط نمبر-۳۱

صحابہ کی تعریف، مولانا حسینی کے شبہات واعتراضات کا علمی تجزیہ اور جمہور علماء کا موقف

استاد محترم مولانا سید سلمان حسینی صاحب کی ایک جدید کتاب "تهذيب وتيسير نزهة النظر في توضيح نخبة الفكر" کے نام سے حال میں ہی طبع ہوئی ہے، مولانا محترم نے حافظ ابن حجر کے نزدیک صحابی کی تعریف کی نقل کرنے کے بعد بین القوسین میں ایک تعلیق کی ہے (وهناك أقوال آخر تنتظر طول الصحبة والمشاركة في بعض الغزوات والرواية عنه)۔

ویسے مولانا محترم نے اپنے رسالۂ "صحابہ" میں صحابی کی تعریف کے سلسلہ میں ان اقوال کا تذکرہ بھی کیا ہے، اس رسالہ کا رد علمی انداز میں مفتی عتیق صاحب قاسمی نے اپنے جامع رسالہ "صحابی کی تعریف اور صحابہ کے مقام ومرتبہ کے بارے میں غلط فہمیوں کا ازالہ" میں کر دیا ہے۔

اور مفتی شکیل منصور القاسمی نے اصحاب رسول میں بھی بھرپور انداز میں ان کا تعاقب کیا ہے اور ائمہ حدیث کے اقوال نقل کئے ہیں اور ان کی آراء کی روشنی میں مولانا محترم کے دعویٰ بلا دلیل کے تارو پور بکھیر دئے ہیں، اس لئے جس کو بھی صحابی کی تعریف اور علماء کے دلائل کی جستجو ہو اسے چاہئے کہ ان رسالوں کی طرف رجوع کرے، ہم نے اس لئے اس بحث کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا کہ مولانا کے جتنے بھی کام ہیں ان سب میں کچھ نہ کچھ تو بے سروپا معلومات اور تعلي آمیز ادعاءات ہوتے ہی ہیں، اس لئے مولانا کی تحریریں اس امر کو سامنے رکھ کر ہی مطالعہ کرنی چاہئیں، ہمیں جب بھی موقع ملے گا تو ان شاء اللہ وقتا فوقتا اہل علم کو مولانا محترم کی تلبیسات اور تدلیسات کی جانب متوجہ کرتے رہیں گے۔

مولانا محترم پر اہل تشیع کا جب بھوت سوار ہوا تو ظاہر ہے کہ ان کے شیعی جنون کی تسکین کا

سامان حضرت معاویہؓ حضرت عمرو بن العاصؓ ومغیرہ بن شعبہؓ وغیرہ کوتنقید وتبصروں کا نشانہ بنائے بغیر نہیں ہوسکتا تھا، اس لئے انہوں نے بڑی ہوشیاری اور کمالِ عیاری سے ایک فرضی مقدمہ قائم کیا اور صحابہ ومنافقین کے مابین فرق وامتیاز کو یکسر مٹا کر رکھ دیا، اور برملا یہ کہا کہ صحابہ اور منافقین میں کوئی فرق نہیں، بلکہ صحابہ میں ہر طرح کے لوگ تھے، رعل وذکوان اور عکل وعرینہ کے غادر وعہد شکن صحابہ تھے، احد کے میدان سے بھاگ جانے والے بھی صحابہ تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا استہزاء وتمسخر کرنے والے بھی صحابہ تھے، اس سے یہ تأثر دینا ان کا مقصود تھا کہ اگر کسی صحابی (اور خاص طور پر جو ان کا ٹارگٹ ہیں یعنی حضرت معاویہؓ اور ان کے رفقاء) کے بارے میں کوئی ناروا تبصرہ کیا جائے تو زیادہ چراغ پا ہونے کی ضرورت نہیں، بلکہ صفتِ صحابیت سے متصف ہونے کے باوجود ان کو ظالم وجابر ومنافق وغیرہ الفاظ سے خطاب کیا جاسکتا ہے۔ (العیاذ باللہ)۔

دوسرا مفروضہ ان کا یہ تھا کہ صحابی کی تعریف بھی بعد کے دور کی اصطلاح ہے، لہذا شرف صحابیت کوئی شرعی اور قابلِ قدر صفت نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے کسی کو وہ مقام دیا جائے کہ وہ تنقید وتبصرہ سے بالاتر ہو جائے، اور پھر شاذ اقوال اور علماء کے باہم مختلف فیہ آراء کا سہارا لے کر خود اس صفت اور اس اصطلاح، اور اس کے تقدس وعظمت کو پامال کرنے کی کوشش کی ہے، مولانا محترم کی اس تگ ودو کا مقصد بھی خاندان بنوامیہ کی شبیہ کو داغدار کرنا اور مذکورہ جلیل القدر صحابۂ رسول کی عظمت وتقدس کو نشانہ بنانا ہے، (حوالہ کے لئے مولانا محترم کے رسائل وکتب مثلا: صحابہ، مفتی عتیق بستوی کے ازالہ کا ازالہ، اللہ جل جلالہ کے بے لاگ قوانین اور فیصلے، ملک عضوض وغیرہ کا مطالعہ کافی ہوگا) اس قسط میں ہم نے مولانا محترم کے ان ہی شبہات کو موضوع بنایا ہے، اور ان کا جواب دیا گیا ہے۔

صحابی کی تعریف میں علما کے اقوال اور جمہور کے نزدیک معتبر تعریف اور وجوہِ ترجیحات

محدثین کے یہاں کے صحابہ کی تعریف میں چھ اقوال ملتے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) صحابی: وہ شخص ہے جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کی حالت میں ملاقات کی اور اسلام ہی کی حالت میں انتقال ہوا ہو اگر چہ درمیان میں وہ مرتد ہی کیوں نہ ہو گیا ہو۔ یہ جمہور محدثین اور ائمہ مجتہدین کا قول ہے۔ "من لقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم

مؤمنا به ومات علی الاسلام ولو تخللت الردة فی الاصح" (نزهة النظر)۔

(۲) انه من طالت صحبته له و کثرت مجالسته علی طریق التبع والأخذعنه۔
یعنی جس نے آپ سے طویل صحبت اٹھائی ہواور آپ سے اخذ واستفادہ کیا ہو۔ اس قول کو ابوظفر سمعانی نے اصولیین کی طرف منسوب کیا ہے۔

(۳) صحابی وہ ہے جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سال دوسال گزارا ہو یا ایک دوغزوہ میں شرکت کی ہو۔ یہ قول سعید بن المسیب کی طرف منسوب ہے۔

(۴) طویل صحبت کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ اس نے آپ سے اخذ بھی کیا ہو۔ یہ عمرو بن یحیٰ کی طرف منسوب ہے۔

(۵) انه من رآه مسلماً بالغا عاقلاً اس میں بالغ عاقل ہونے کی بھی شرط ہے۔ یہ قول واقدی نے اہل علم کی طرف منسوب کیا ہے۔

(۶) جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا وہ مسلمان ہے اگر چہ رؤیت سے محروم ہو۔ یہ قول یحییٰ بن عثمان جامع المصری کا ہے۔

(تفصیل کیلئے حافظ عراقی کی شرح تبصرہ وتذکرہ، حافظ سخاوی کی فتح المغیث اور علامہ سیوطی کی تدریب الراوی کے متعلقہ مباحث ملاحظہ کریں)

محدثین کی تعریف کے دلائل

(۱) لفظ ''صحابیؔ'' کی لغوی حقیقت تو یہی ہے کہ ایک لمحہ دیکھنے اور چند قدم ساتھ چلنے والے پر بھی ''صاحب'' اور ''صحابیؔ'' کا اطلاق درست ہو''علامہ خطیب فرماتے ہیں کہ: لاخلاف بین أهل اللغة أن قول الصحابی مشتق من الصحبة وأنه لیس بمشتق من قدر منها مخصوص بل هو جار علی کل من صحب غیره قلیلاً کان او کثیراً۔

(الکفایة ص:۱۰۰ للخطیب)

(اہلِ لغت کے درمیان اس امر میں کوئی اختلاف نہیں کہ کہ لفظ صحابی صحبت سے مشتق ہے، صحبت کی کسی مخصوص مقدار سے مشتق نہیں ہے، بلکہ وہ ہر صحبت کے لئے مستعمل ہے، صحبت خواہ

طویل ہو یا نہ ہو)۔

اوراصول یہ ہے کہ جب تک کوئی شرعی مانع نہ ہو کسی بھی لفظ کی حقیقت شرعیہ اس کی حقیقت لغویہ سے جدا نہیں ہوسکتی۔اور یہاں ایسا کوئی صارف بھی موجود نہیں ہے، اگر اس بابت محض عرف کی وجہ سے اصطلاحات قائم کرلی جائیں تو پھر صحابی کی کوئی ایک تعریف قائم ودائم نہیں رہ سکتی، کیونکہ عرف ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔

(۲) حضرت صبیح عنزی روایت کرتے ہیں کہ ہم لوگ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر تھے اور آپ ٹیک لگائے بیٹھے تھے، ہم لوگ مجلس میں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کا تذکرہ کررہے تھے کہ ایک آدمی نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو آڑے ہاتھوں لیا اور تنقید کے تیر برسائے۔ یہ سن کر حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سیدھے بیٹھ گئے اور فرمانے لگے: ہم لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آغوشِ صحبت میں ساتھ رہتے تھے اور انوار رسالت براہ راست ہمارے سینوں پر پڑتے تھے، ایک دفعہ ہم لوگ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی معیت میں تھے کہ ایک بستی میں ہمارا قیام ہوا جہاں ایک حاملہ عورت تھی، ہمارے ساتھ ایک بدو تھا، جس نے حاملہ عورت سے کہا: کیا تو بیٹا جننا پسند کرتی ہے؟ اس کا جواب اثبات میں تھا، چنانچہ اس عورت نے بکری عطا کردی، ہدیہ پاکر بدو نے عورت کی ستائش میں چند قافیہ بند اشعار کہے، پھر بدو نے بکری ذبح کرکھانا تیار کیا، ہم لوگ بشمول ابوبکر رضی اللہ عنہ بیٹھے کھانا کھارہے تھے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو واقعے کا علم ہوا، آپ نے فوراً کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور جاکر پورے نوش کردہ کھانے کی قے کردی،۔۔۔۔انصار صحابہ کرام راضی اللہ عنہم کی بدگوئی کے جرم میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کیا گیا، حضرت عمر بن خطابؓ نے لوگوں سے فرمایا: اگر اس بدو کو بستانِ نبوت کے مہکتے پھول کی خوشبو اور آفتابِ رسالت کی چمکیلی شعاع میسر نہ ہوتی تو میں صحابہ کرام کی شان میں گستاخی کی پاداش میں اسے کڑی سزا دیتا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس حدیث کے سلسلۂ رواۃ کو ثقہ قرار دیا ہے۔

(مقدمہ اصابہ للحافظ ابن حجر)

فائدہ: حضرت نے عمرؓ نے ایک بدوی کی چند منٹ کے ملاقات پر صحبت کا اطلاق کیا ہے

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين المهديين۔ (ابوداؤد۔ ۴۶۰۷۔والترمذی ۲۶۷۶)

(۳) عن ابي سعيد الخدري عن النبي صلى الله عليه وسلم قال: "يأتي على الناس زمان يغزو فئام من الناس، فيقال: هل فيكم من رأى رسول الله فيقولون: نعم، فيفتح لهم، ثم يغزو فئام من الناس،فيقال: هل فيكم، من رأى من صحب النبي صلى الله عليه وسلم؟ فيقولون: نعم، فيفتح لهم، ثم يغزو فئام من الناس فيقال: هل فيكم من رائ من صحب من صحب رسول الله؟ فيقولون: نعم فيفتح لهم۔ وهذا لفظ مسلم، وله في رواية أخرى: يأتي على الناس زمان يبعث منهم البعث فيقولون: انظروا هل تجدون فيكم أحداً من أصحاب رسول الله؟ فيوجد الرجل، فيفتح لهم به، ثم يبعث البعث الثاني، فيقولون هل فيكم من رأى أصحاب رسول الله؟ فيقولون: نعم، فيفتح لهم به، ثم يبعث البعث الثالث، فيقال: انظروا هل ترون فيكم من رأى من رأى أصحاب رسول الله؟ فيقولون نعم، ثم يكون البعث الرابع، فيقال: هل ترون فيكم أحداً رأى من رأى أحداً رأى أصحاب رسول الله، فيوجد الرجل، فيفتح لهم به، ولفظ البخاري ثلاث مرات كالرواية الأولىٰ، لكن لفظ: "يأتي على الناس زمان يغزو فئام من الناس" وكذلك قال في الثانية والثالثة، وقال فيها "كلها صحب" واتفقت الروايات على ذكر الصحابة والتابعين وتابعهم وهم القرون الثلاثة، وأما القرن الرابع فهو في بعضها، وذكر القرن الثالث، ثابت في المتفق عليه من غير وجه۔ (بخاری ۲۸۹۷ ومسلم ۲۵۳۲)

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے نقل ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: ایک زمانہ ایسا آئے گا جب لوگوں کی ایک جماعت جہاد کرے گی، ان سے کہا جائے گا: کیا تمہارے درمیان ایسا کوئی شخص موجود ہے جس نے دیدارِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہو؟ وہ لوگ کہیں گے: جی ہاں۔ پھران کو فتح حاصل ہوگی۔ پھرایک گروہ جہاد کرے گا، اس سے کہا جائے گا: کیا آپ لوگوں کے مابین ایسا کوئی موجود ہے جسے صحابۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار حاصل ہو، لوگ کہیں گے:

جی ہاں، ان کے ہاتھوں بھی فتح نصیب ہوگی، پھر کہا جائے گا: کیا تمہارے درمیان ایسا کوئی شخص ہے جس نے صحابۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کو دیدار کیا ہو۔ لوگ کہیں گے: جی ہاں! ان کو بھی فتح نصیب ہوگی۔

یہ حدیث اس باب میں فیصل ہے اور صحابہ کی تعریف کے لئے نص صریح کے درجہ میں ہے۔

قال ابن تیمیه: ولفظ البخاری قال فیها کلها صحب وهذه الألفاظ إن كانت كلها من الفاظ رسول الله فهی نص فی المسئلة وان كان قد قال بعضها والراوی یروی مثل أبی سعید یروی اللفظ بالمعنیٰ فقد دل علی أن أحد اللفظین عندهم هو معنیٰ الآخر وهم أعلم بمعانی ما سمعوه من كلام رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ (المنهاج ج ٨/٢٠٨)

دوسرے قول کے قائلین کے دلائل اور ان کا جواب:

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ قول تمام اصولیین کا نہیں ہے چنانچہ علامہ عراقیؒ شرح التبصرہ میں فرماتے ہیں:

وھوقول بعضھم یعنی بعض لوگوں کی یہ رائے ہے۔ کیوں کہ ابن حاجب نے شرح مختصر المنتھی ٢/٦٧ میں پہلے قول کو راجح قرار دیا ہے اور اسی کو اختیار کیا ہے، اور آمدی نے احکام الاحکام ٢/٢٩٢ میں اسی کو اختیار کیا ہے، موسیٰ سیلانی کہتے کہ میں نے حضرت انسؓ سے دریافت کیا کہ هل بغی من أصحاب رسول الله صلی الله علیه وسلم أحد غیرك، قال بقی ناس من الأعراب قد رأوه فاما من صحبه فلا۔

ابن صلاح اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اسناده جید، حدث به مسلم بحضرة أبی زرعة۔ (مقدمة ابن الصلاح: النوع التاسع الثلاثون)

جمہور کا جواب: اس میں حضرت انس نے خاص صحبت کا انکار کیا ہے، رائج تعریف کی نفی یا تردید نہیں فرمائی۔ (الباعث الحثیث ابن کثیر ص:١٥٣)

یہی جواب حافظ عراقی اور حافظ سخاوی وغیرہم نے بھی دیا ہے۔

(۲) امام ابوزرعہ رازی اور ابوداؤد نے طارق بن شہاب کے بارے میں فرمایا "له رؤية وليست له صحبة۔ اور اسی طرح عاصم الاحول نے عبداللہ بن سرجس کے بارے میں فرمایا قد رأى عبدالله بن سرجس النبي صلى الله عليه وسلم غير أنه لم تكن له صحبة"۔

جمہور کا جواب: حافظ عراقی شرح التبصرۃ والتذکرۃ میں فرماتے ہیں:

كذا أراد أبوزرعة وأبوداؤد نفي الصحبة الخاصة دون العامة"۔

حافظ عراقی کا یہ جواب کوئی بے جا تاویل نہیں۔

حافظ ابوزرعہ سے صحابہ کی تعداد کے بارے میں منقول ہے: قبض رسول الله صلى الله عليه وسلم عن مائة الف واربع عشر ألفا من الصحابة ممن روى عنه وسمع عنه وفي رواية ممن رآه وسمع منه (مقدمه ابن الصلاح النوع الثامن والثلاثون)۔

یہاں حضرت ابوزرعہ نے خود رؤیت پر صحبت کا اطلاق کیا ہے۔ جہاں تک ابوداؤد کا تعلق ہے تو ان کے الفاظ عون المعبود کے نسخے میں یہ ہیں قال ابوداؤد طارق بن شهاب قد رأى النبي صلى الله عليه وسلم ولم يسمع منه شيئاً۔ (عون المعبود حديث: ۱۰۶۷)

تو یہاں صحبت کی نفی امام ابوداؤد نے نہیں کی ہے بلکہ سماع کی نفی کی ہے، اس کے باوجود انھوں عن طارق بن شہاب عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث نقل کی ہے، یعنی یہ روایت مرسل صحابی ہے جو جمہور کے نزدیک حجت ہے، واضح رہے کہ صاحب عون المعبود نے جو ابوداؤد کا محقق نسخہ تیار کیا ہے وہ بہت معتبر سمجھا جاتا ہے، شاید حافظ عراقی کے نسخے میں "ليست له صحبه" کے الفاظ ہوں۔ واللہ اعلم

اس قول کے قائلین کے پاس کوئی خاص دلیل نہیں ہے، کچھ اقوال ہیں جن کا صحیح مفہوم متعین کیا جاسکتا ہے، پھر ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اصولیین یہ بتانے سے بھی قاصر ہیں کہ آخر کتنی مدت کی صحبت پر ان کے یہاں صحابی کا اطلاق ہوگا؟

اسی لئے اصولیین میں سے ابن الحاجب اور آمدی نے تو یہ فرمادیا کہ محدثین اور بعض اصولیین کے درمیان جو نزاع ہے حقیقی نہیں لفظی ہے لیکن امام مجتہد حافظ العلائی المتوفی ۷۶۱ھ ان کی تردید کرتے ہیں۔ (دیکھیں تحقیق منیف الرتبہ لمن ثبت لہ شریف الصحبۃ، مبحث صحابی کی تعریف)

(۳) تیسرا قول سعید بن المسیب سے ثابت ہی نہیں ہے، ابن صلاح فرماتے ہیں: ''إن صح،،۔ اور حافظ عراقی فرماتے ہیں لا یصح هذا عن ابن المسیب ففی الاسناد إلیه محمد بن عمر الواقدی وهو ضعیف فی الحدیث (التقیید والإیضاح ص: ۲۵۷)

(۴) چوتھا قول دراصل معتزلہ کے امام عمرو بن بحر ابوعثمان جاحظ کا ہے۔ جس کے بارے میں ثعلب فرماتے ہیں۔ أنه غیر ثقة ولا مأمون ولم یصح هذا القول لغیر عمرو۔ (شرح التبصرہ والتذکرہ للعراقی)

(۵ پانچواں قول واقدی نے اہل علم سے نقل کیا ہے، حافظ عراقی فرماتے ہیں "والتقیید بالبلوغ شاذ"۔ یہ قول شاذ ہے۔ (شرح التبصرۃ)

(٦) چھٹا قول، اس قول میں بہت توسع ہے یہ قول قرافی نے شرح التنقیح میں بعض اصولیین سے نقل کیا ہے۔ اور ابن مندہ نے ''صحابہ'' اور ابن عبدالبر نے استیعاب میں اسی تعریف پر عمل کیا ہے کہ صحابہ کی وہ اولادیں جو چھوٹی تھیں اور ان کے شرف رؤیت کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے، ان کو بھی ان کے والدین کی اتباع میں صحابہ میں شمار کر دیا ہے۔ (فتح المغیث)

اہلِ علم کے مابین صحابی کی تعریف میں یہ اقوال ملتے ہیں، البتہ ان تمام اقوال اور دلائل کی روشنی میں جمہور اہلِ علم کے یہاں قولِ اول کو ترجیح حاصل ہے، اور اس کے مندرجہ ذیل وجوہات واسباب ہیں:

(۱) حدیث صحیح صریح سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

(۲) خلفائے راشدین میں سے حضرت عمرؓ کا عمل بھی اس کا مؤید ہے۔

(۳) کلام عرب سے بھی اس قول کی تائید ہوتی ہے۔

(۴) کبار ائمہ حدیث مثلا امام احمد علی بن المدینی اور امام بخاری وغیرہ سے صراحت کے ساتھ یہ تعریف منقول ہے۔

(۵) باقی جو اقوال ہیں وہ مرجوح اور شاذ ہیں معمول بہ نہیں ہے۔ (الفیہ عراقی میں ہے کہ " رأی النبی مسلما ذو صحبة وقیل إن طالت ولم یثبت۔ یعنی پہلے قول کے علاوہ کوئی دوسرا قول معمول بہ نہیں۔ (شعر نمبر: ۷۸٦)

صرف ملاقات پر صحبت کا اطلاق کرنا درحقیقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کا اثبات ہے

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے تعالیٰ سید المرسلین وخاتم النبیین بنا کر بھیجا تھا آپ کی کیمیا اثر صحبت ونظر کو اللہ تعالیٰ نے یہ کمال عطا کیا تھا جس نے آپ کو ایمان ومحبت کی حالت میں دیکھ لیا یا جس کو آپ ﷺ نے دیکھ لیا اس کی زندگی روشن وتابندہ اور منور ہو گئی، اور اس کو وہ انوارات وتجلیات حاصل ہو گئے جو بعد والوں کو ریاضت ومجاہدہ کے بعد بھی حاصل نہیں ہو سکتے، یہ عطیہ ربانی ہے جو اللہ کے رسول کو حاصل تھا اور آپ کے ذریعہ صحابہ کو حاصل ہوا، إنما أنا قاسم واللہ یعطی۔ حافظ سخاوی نے فتح المغیث میں صحابی کے تعریف کی ضمن میں لکھا ہے "فإنه كما صرح به بعضهم إذا رآه مسلم أو رأى مسلما الصحابي لحظة طبع قلبه على الاستقامة، لأنه بإسلامه متهيء للقبول فاذا قابل ذلك النور العظيم أشرف عليه فظهر أثره على قلبه وعلى جوارحه"۔

مولانا سلمان صاحب کا ارشاد ہے" دوسری طرف اہل سنت نے غلو میں یہ نقطہ نظر وضع کر لیا کہ جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مرتبہ ایک سیکنڈ کے لئے بھی دیدار کر لیا اور مسلمان ہونے کی حالت میں اس کی موت ہوئی اور وہ کافر ومرتد ہو کر نہیں مرا وہ صحابی ہے یہ تعریف نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے نہ خلفائے راشدین سے نہ کسی صحابی سے، بعد کے دور میں یہ تعریف وضع کر لی گئی،،۔

جبکہ ہم جمہور کے قول کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین سے ثابت کر چکے ہیں بغیر کسی علمی دلائل کے پوری امت کی تحمیل وتحمیق اور غلو میں مبتلا وہی شخص قرار دے سکتا ہے جو خود مالیخولیائی مرض میں مبتلا ہو، مولانا محترم نے جو شاذ آراء نقل کی ہیں وہ ان کی پریشان خاطری کا مظہر ہیں ان کی خواہش ہے کہ وہ حضرت معاویہؓ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی زمرۂ صحابہ سے خارج کر سکیں، لیکن ان کی مجبوری وبے بسی کو ہم سمجھ سکتے ہیں، ہماری پوری ہمدردی ان کے ساتھ ہے، سب سے تنگ دائرہ والی تعریف وہ ہے جو سعید بن المسیب سے منسوب ہے، اس تعریف کو بھی اختیار کیا جائے تو چونکہ یہ دونوں بزرگ ۸ ہجری میں ایمان لائے ہیں اس تعریف کے اعتبار سے بھی یہ حضرات صحابی ثابت ہوں گے، مولانا محترم کو خود اس بات کا علم ہے، اس لئے مولانا

محترم نے اقوال نقل کر کے مسلمات کے خلاف صرف شبہات پیدا کئے ہیں، اور دجل سے کام لیتے ہوئے کسی تعریف کو اختیار نہیں کیا۔ الحق یعلو ولا یعلیٰ علیہ۔

دوسری کوشش حضرت نے یہ فرمائی کہ ان کو منافقین میں شمار کرانا چاہا لیکن ناکامی کے علاوہ کچھ ہاتھ نہ لگا۔ قال احمد بن حنبل وغیرہ من العلماء انہ لم یکن من المھاجرین من نافق وانما کان النافق فی قبائل الأنصار۔ (منہاج السنۃ ۲۵۵/۱)

خلاصہ یہ کہ مولانا سلمان صاحب اوران کے شیعہ متحد ہوکر بھی ان بزرگوں کوشرفِ صحبت سے محروم نہیں کر سکتے ،ولو کان بعضھم لبعضھم ظھیرا

مولانا سلمان صاحب مفتی عتیق صاحب سے فرماتے ہیں:’’جو حوالے بڑے جدوجہد سے آپ نے جمع کئے۔ میں ان کو تیس پینتیس سال سے پڑھا ہوں،علوم حدیث اور جرح وتعدیل میرا موضوع ہے۔آپ کا نہیں آپ اس موضوع میں نووارد ہیں اس لئے آپ کے کتابچہ سے آپ کی ناپختگی اورفلاں فلاں کے اقوال سے عوام کو بیوقوف بنانے کی کوشش صاف نظر آرہی ہے۔ دیکھئے ان اقوال کے لئے فتح المغیث للعلامۃ العراقی ۳۳۸۔۳۳۷)‘‘۔(بحوالہ صحابہ ص:۱۲)

قارئین کے علم میں ہے کہ اصول حدیث میں حافظ عراقی کا ایک منظوم متن ’’التبصرہ والتذکرہ‘‘ کے نام سے ہے، جو الفیۃ الحدیث کے نام سے مشہور ہےاوراس کی شرح حافظ سخاوی نے عمدۃ المغیث بشرح الفیۃ الحدیث کے نام سے لکھی ہے،حضرت نے عمدۃ المغیث کو ہی حافظ عراقی کی کتاب بنادیا،علوم حدیث اور جرح وتعدیل کے موضوع پراتنی مہارت اور کمال ہی کا مظہر کہا جا سکتا ہے کہ کسی کی کتاب کو دوسرے کی جانب منسوب کیا جائے، اور دعوی ہمہ دانی تو آپ نے ملاحظہ کرہی لیا ہے۔

مولانا محترم فرماتے ہیں علامہ ابوالمظفر السمعانی فقہاء اصولیین کا قول نقل کرتے "الصحابی من طالت صحبتہ للنبی و کثرت مجالستہ علی طریق التبع لہ والأخذ عنہ" صحابی وہ ہے جس کو حضور کی طویل رفاقت اور ہم نشینی کا موقع ملا ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرتا رہا ہو اور آپ سے کسبِ فیض کرتا رہا ہو۔

یہی قول علامہ آمدی اور ابن الحاجب کا ہے۔(صحابہ ص:۱۱)

واضح رہے علامہ آمدی اور ابن الحاجب نے دوسرے اقوال ذکر کئے ہیں لیکن ان کا مختار قول جمہور کے مطابق ہی ہے کما مر۔ اس لئے مولانا کا یہ فرمانا کہ یہی قول علامہ آمدی اور ابن الحاجب کا ہے صریح کذب اور بہتان ہے۔

مولانا کو چاہئے کہ ائمہ کی کتاب کو صحیح سے سمجھ کر امانت کے ساتھ بغیر کسی دجل والحاق کے طلبہ تک پہنچادیں، بلاوجہ ائمہ حدیث امام احمد وامام بخاری وغیرھم کے منھ لگنے کی کوشش نہ کریں کہ یہ آپ کا مقام نہیں ہے

تنبیہ: کوئی بھی شاذ تعریف اختیار کی جائے حضرت امیر معاویہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنھا شرف صحبت سے محروم نہیں ہوسکتے۔

لیکن اگر پانچواں قول اختیار کیا جائے تو حضرات حسنین اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنھما ضرور شرفِ صحبت سے محروم ہوجائیں گے۔

وقال فی النکت ظاهر کلام الائمة ابن معین وابی زرعه وأبي حاتم وأبي داؤد وغیرهم اشتراطه، فانهم لم یثبتوا الصحبة للأطفال، حنكهم النبی صلی الله علیه وسلم أو مسح وجوههم أو تفل فی أفواههم كمحمد بن حاطب وعبدالرحمن بن عثمان التیمی وعبدالله بن معمر ونحوهم۔ قال ولا یشترط البلوغ علی الصحیح، وإلا بحرج من أجمع علی عده فی الصحابة كالحسن والحسين وابن لزبير ونحوهم۔ (تدریب الراوی ص:۴۹۶)

اس لئے جمہور کا قول دلائل کے اعتبار سے قوی اور اعتدال پر مبنی ہے۔ "و كذلك جعلنا كم أمة وسطاً"۔

تنبیہ: صحابہ پر نقد وتبصرہ اور ان پر جرح وقدح درحقیقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جرح کے مرادف ہے، امام مالک فرماتے ہیں "إنما هؤلاء أقوام أرادوا القدح فی النبی ﷺ یمكنهم ذلك فقدحوا فی أصحابه حتی یقال رجل سوء ولو كان رجلاً صالحاً لكان أصحابه صالحین۔ (الصارم المسلول، ص:۵۸)

{ولا عدوان إلا علی الظالمین}

’’مفتی‘‘ عتیق بستوی کے ’’ازالہ‘‘

کا

ازالہ

از
سلمان حسینی ندوی

ناشر
جمعیت شباب الإسلام
ٹیگور مارگ ندوہ روڈ لکھنؤ

تفصیلات کتاب

نام کتاب	:	’’مفتی‘‘ عتیق بستوی کے ازالہ کا ازالہ
زیر اہتمام	:	محمد عبدالرشید ندوی
کمپوزنگ وطباعت	:	ندوی کمپوٹر سینٹر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
صفحات	:	۱۶
تعداد	:	۱۰۰۰
اشاعت	:	اکتوبر ۲۰۱۸ء
قیمت	:	۲۰/روپئے

ملنے کے پتے

۱-مکتب الشباب العلیمۃ برولیا ٹیگور مارگ لکھنؤ

۲-مجلس تحقیقات ونشریات، پوسٹ بکس ۱۱۹، ندوۃ العلماء لکھنؤ

۳-مکتبۂ اسلام گوئن روڈ، لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

''شرم تم کو مگر نہیں آتی''

مولوی عتیق بستوی سے بات شروع کرنے سے پہلے میں ان مولویوں سے کہتا ہوں جو پانچ سال سے قاتل ومجرم سعودی حکومت کے جرائم سے روز بروز واقف ہو رہے ہیں، لیکن نہ ان کی زبان کھلتی ہے نہ قلم چلتا ہے، انہیں معلوم ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑی تاکید سے فرمایا تھا کہ مشرکین ویہود ونصاری کو جزیرۃ العرب سے نکال دینا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے دور میں ان کو جزیرۃ العرب سے نکال دیا تھا، چودہ سو سال پر پھیلی ہوئی پہلی مجرم حکومت سعودی حکومت ہے جس ں ے امریکی صہیونیوں کے اڈے جزیرۃ العرب میں جا بجا قائم کئے اور ملک اور اس کے خزانوں کو ان کے حوالہ کر دیا، اور پھر ان فوجیوں کا تعاون کر کے اپنی سرزمیں سے افغانستان اور عراق کی اینٹ سے اینٹ بجادی، اور ابھی سات سال میں عراق اور شام سے سنیوں کا خاتمہ کر کے دوبارہ شام میں بشار اور عراق میں عبادی کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور تھما دی۔

کیا اتنے خطرناک اور فیصلہ کن جرائم پر یہ مولوی بولے؟ کچھ لکھنا تو دور ان کی زبان کھل سکی؟!

سعودی حکومت نے ال اخوان المسلمون، حماس، اتحاد العلماء المسلمین کو دہشت گرد قرار دیا، کیا ان مولویوں کے ایمان میں کوئی حرکت پیدا ہوئی؟۔

سعودی ولی عہد محمد بن سلمان سے اعلان کیا کہ ہم ۱۹۷۹ء سے پیدا ہونے والی اسلامی بیداری کا خاتمہ کر کے رہیں گے اور سیکڑوں علماء وطلبا اور دیندار نوجوانوں کو پسِ زنداں ڈال دیا گیا، کیا ان مولویوں نے تنقید کے دو بول بولے؟۔

ابھی قریب میں حرم کے منبر سے امام حرم عبد الرحمن السدیس نے حضرت عمرؓ کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے محمد بن سلمان جیسے فاسق وفاجر اور قاتل کو محدث وملہم گردانا، کیا صحابہ کی محبت

کا دم بھرنے والوں نے کوئی مضمون لکھا، کوئی بول بولا؟۔

سعودی کے بڑے سرکاری عالم صالح مغامیسی نے ابھی چند دن پہلے استانبول کے سعودی کونسلیٹ میں جمال خاشقجی کو قتل کرنے والوں کو حضرت بن الولیدؓ سے تشبیہ دی اور محمد بن سلمان کو حضرت ابوبکر سے، کیا کوئی مولوی پھڑکا، تڑپا؟۔

محمد بن سلمان نے پورے ملک میں سنیماؤں کا جال بچھانے، تھیٹروں کو قائم کرنے، عریانیت کو آزادی کے ساتھ۔۔۔۔ پکنگ اسپارٹ، اور سیاحتی علاقے بنانے کا اعلان کیا، اور اس پر زور وشور سے عمل شروع کیا، کیا ان جھوٹے اور نام نہاد مولویوں کی رگ حمیت پھڑکی؟ سرزمین حرم کی عزت تارتار کرنے والوں پر ان کا غصہ بھڑکا، کوئی کتابچہ نہ صحیح، کوئی مضمون ان کے قلم جوہر رقم سیپ نکلا؟؟۔

پرسنل بورڈ کے جرنل سکریٹری کے اس اعلان کے بعد کہ حرمین شریفین میں حاجیوں کی نگرانی کے لئے سعودی حکومت نے اسرائیلی کمپنی کی خدمات لی ہیں، تین طلاق پر چیخوں سے آسمان سر پر اٹھانے والا کوئی مولوی کم ازکم ان کی تائید میں کھڑا ہوا؟؟؟۔

بس کیا کہوں،

''شرم تم کو مگر نہیں آتی''

رہ گئے مولانا عتیق بستوی جن کو دارالقضاء میں ہم نے رکھا تو وہ مفتی عتیق کے نام سے مشہور ہو گئے۔ میں ان کی تلبیسات، تدلیسات، دروغ بیانی، الزام تراشی، اور بگڑے ہوئے مفتیوں کی تاویلات دیکھ کر حیران رہ گیا۔

مشاجرات صحابہ نہ چھیڑنے کا وہ سبق پڑھاتے ہیں، تمام جلیل القدر محدثین، مؤرخین، مفسرین نے مشاجرات صحابہ پر تفصیل کلام کیا ہے، محدث وفقیہ ابن سعد، محدث جلیل علامہ ابوعمر ابن عبد البر نے، مفسر بے مثال، مؤرخ بے نظیر، محدث جلیل علامہ ابن جریر طبری نے، مفسر ومحدث، وفقیہ واصولی علامہ ابن کثیر نے، جرح وتعدیل کے امام محدث کبیر امام ذہبی نے اپنی کتابوں کو مشاجرات صحابہ کے تذکروں سے بھر رکھا ہے، یہ غیر محتاط، ضعیف اور کمزور مؤرخ ہیں، نہ راوی۔

یہ موضوع صحابہ کے دور سے آج تک چلا آ رہا ہے، اور تا قیامت چلتا رہیگا۔ پورا قرآن حق اور ناحق کے فیصلے کرنے آیا ہے، فتن وملاحم کی حدیثوں میں ان کے بارے میں بیانات ارشاد فرمائے گئے ہیں، اور امت کو ان کے بارے میں کیا موقف اختیار کرنا ہے، اسے واضح فرمایا گیا ہے۔

حجت قرآن وحدیث ہیں، فلاں اور فلاں کا قول نہیں۔

مفتی صاحب! جمہور جمہور کی دہائی آپ کے منہ کو زیب نہیں دیتی، جس جمہور کی آپ دہائی دے رہے ہیں وہ تو سب آپ کے امام ابوحنیفہ کی فقہ کے خلاف رہے ہیں، امام ابوحنیفہ، مالکیہ، شافعیہ، اور حنابلہ کے خلاف جہاں کھڑے ہیں، وہاں جمہور دوسری طرف ہیں، بالخصوص آپ کے وہ جمہور جن کا آپ سہارا لے رہے ہیں۔

جمہور محدثین (جن کی آپ دہائی دے رہے ہیں) امام ابوحنیفہ کو "مرجئی" اور "أهل الرأي المذموم" قرار دیتے ہیں، بخاری سے لے کر ابن ماجہ اور دارمی تک، کوئی امام ابوحنیفہ کا نام لینے کا روادار نہیں ہے، آپ کا نہ وضو "جمہور" کے مطابق ہے نہ نماز، نہ اوقات صلاۃ، نہ وتر نہ عیدین۔۔۔۔۔۔۔

ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈالئے، اور جمہور کا شور مچانا بند کیجئے۔

ہاں میں مانتا ہوں کہ امام ابوحنیفہ کے مقابلہ میں جمہور غلط ہیں، ابوحنیفہ امام اعظم ہیں، وہ شاذ ہیں تو میں شاذ کے ساتھ ہوں!۔

آپ کے "جمہور" کہتے ہیں کہ حاکم وقت کتنا ہی ظلم کرے، اس کے خلاف جب تک کھلم کھلا کفر ظاہر نہ ہو، خروج ناجائز ہے، آپ حضرت حسینؓ کے خروج کو جائز سمجھتے ہیں؟ حضرت زید کے خروج کو جائز سمجھتے ہیں؟ حضرت یحیٰ اور ذو النفس الزکیہ کے خروج کو جائز سمجھتے ہیں؟۔

ہمیں معلوم ہے آپ جائز نہیں سمجھتے، کیونکہ آپ کے "جمہور" جائز نہیں سمجھتے، آپ کی ناصبیت آپ کے مضمون سے خوب جھلک رہی ہے، حدیث غدیر کے بارے میں آپ کا اینچ پینچ، یزید کی صفائی کے بارے میں آپکی جھلکتی کوشش، آپ کو ناصبی ثابت کر رہی ہے، آپ کی طرح آپ کے جمہور میں بہت سے چھپے ناصبی ہیں!۔

امام ابو حنیفہ ظالموں کو خلاف خروج کو جائز نہیں سمجھتے، بلکہ ان کے خروج کو بدر کے خروج نبوی سے تشبیہ دیتے ہیں، امام مالک ظالموں کے خلاف خروج کی تائید کرتے ہیں، دونوں حضرت زید کے خروج اور ذو النفس الزکیہ کے خروج کی مدد کرتے رہے، اسی وجہ بنو امیہ کے مجرموں نے ان پر کوڑے لگوائے۔

حنفیت کا ت لبادہ اوڑھ کر ''ناصبیت'' کا سکہ نہیں چلتا، امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد سب "کتاب اللہ وعترتی" "أھل بیتی" کے نہ صرف حدیث کے قائل تھے، بلکہ اس کے تقاضوں پر عامل تھے، اس لئے انہوں نے اہل بیت کے لیے کوڑے کھائے، امام ابو حنیفہ کی اسی جرم میں جیل میں شہادت ہوئی۔

جو حوالے بڑی محنت سے آپ نے جمع کئے، میں ان کو تیس پینتس سالوں سے پڑھا رہا ہوں، علوم حدیث اور جرح وتعدیل میرا موضوع ہے۔ آب کا نہیں۔ آپ اس موضوع میں نو وارد ہیں۔ اس لئے آپ کے کتابچہ سے آپکی ناپختگی اور فلاں فلاں کے اقوال سے عوام کو بیوقوف بنانے کی کوشش صاف نظر آ رہی ہے۔

صحابہ کون ہیں، یہ علوم حدیث کا ایک موضوع ہے، جس کو میں ۱۹۷۵ء سے پڑھ رہا ہوں، اور ۱۹۸۰ء سے پڑھا رہا ہوں علوم الحدیث کی کتاب "علوم الحدیث لابن الصلاح" ندوہ میں پڑھا رہا ہوں، شیخ عبد الحق دہلوی کے مقدمہ میں ''اصول حدیث'' حافظ ابن حجر کی ''شرح نخبۃ الفکر'' علامہ ابن الصلاح کی ''مقدمہ ابن الحدیث'' میں نے پڑھائی بھی ہیں اور ان سب پر میری تعلیقات ہیں، مولانا عبد الحی فرنگی محلی، اور شیخ عبد الفتاح ابو غدہ کی تعلیقات میرے سامنے ہیں، انہوں نے اکثر جمہور سے اختلاف کیا ہے، اور میں نے بھی جا بجا کیا ہے۔

حضرت خالد بن الولیدؓ صحابی جلیل ہیں، ان کے بارے میں بخاری کی صحیح احادیث کے حوالہ سے، میں نے وضاحتیں کی ہیں، اگر ان روایتوں میں ان کے ساتھ بے ادبی ہے، تو اس کے مجرم آپ کے نزدیک امام ابو بخاری ہیں، آپ ان کے بارے میں مجھ پر جو الزام تراشی کی ہے، یہ شرعی اصطلاح میں ''قذف کا جرم ہے، اسلامی عدالت ہوتی تو آپ پر ۸۰ کوڑے لگتے۔

اب میں آپ سے مندرجہ ذیل سوالات کرتا ہوں:

۱- حجۃ الوداع سے واپسی پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ۸؍ذی الحجہ بروز اتوار غدیر خم کے میدان میں جو اجلاس فرمایا، وہ ہزار ہا ہزار کے مجمع میں تھا، ویسے ہی جیسے حجۃ الوداع کے خطابات تھے تقریبا ۲۵؍صحابہ کی روایتوں کا حافظ ابن حجر نے اس سلسلہ میں تذکرہ کیا ہے، اور انہوں نے، امام ذہبی نے، سیوطی نے، عجلونی نے، البانی نے اور دیگر محدثین ں ے حدیث کو متواتر قرار دیا ہے، اس پر طبری ابن عقدہ اور ذہبی کی کتابیں ہیں، میرے رسالہ "مختصر سیرۃ سیدنا علی رضی اللہ عنہ" میں اس کی تخریج موجود ہے، اس میں قرآن کی طرح قطعی اور متواتر حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا، "إنه قد دنا أجلي، وإنه أوصيكم" پھر فرمایا تھا "تركت فيكم ثقلين لن تضلوا ما تسكتم بهما كتاب الله وعترتي" (میں تمھارے درمیان دو امانتیں چھوڑ رہا ہوں ایک قرآن اور دوسرے میرے اہلِ بیت)۔ اس قطعی ہدایت پر عمل کیوں نہیں ہوا؟۔

۲- عترتی سے کیا مراد ہے، اور قرآن اور عترت رسول کو مضبوطی سے تھامنے کے کیا معنی ہیں؟۔

۳- اسی موقع پر تمام موجود مسلمانوں کے سامنے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "من كنت مولاه فعلي مولاه" کہیں یہ ہے کہ "علي ولي المؤمنين من بعدي" بتائیں "ولی" کے قرآن وحدیث میں کیا معنی ہوتے ہیں، حضور جن کے ولی ہیں علیؓ ان کے ولی ہیں، کیا ابوبکر صدیقؓ نے نہیں کہا تھا "لقد وليت عليكم" کیا عمرؓ نے نہیں کہا تھا: "أنا ولي الرسول صلی اللہ علیہ وسلم؟ براہ کرم ولی کے تفصیلی معنی بیان کریں۔

۴- کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاں ابوبکر وعمر وعثمان وعلی رضی اللہ عنہم کی خلافت کا تذکرہ کیا وہاں یوں نہیں فرمایا تھا "إن تولوا أبابكر، وإن تولوا عمر، وإن تولوا عثمان" تو ان تینوں کی انفرادی خصوصیات ذکر فرمائی تھیں، اور جب "إن تولوا عليا" فرمایا تھا "تجدوه هاديا مهديا، يهديكم إلى الصراط المستقيم"؟۔ (دیکھئے ازالۃ الخفا اور مراجع حدیث مسند أحمد حدیث نمبر ۸۵۹)

۵- کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مرض الوفات میں جمعرات کے دن ۸؍ربیع الأول کو ظہر کی نماز سے پہلے نہیں فرمایا تھا "کاغذ قلم لاؤ، میں وصیت لکھوادوں" تو ایسا کیا ہوا کہ گھر میں جھگڑا

ہونے لگا، اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ناراضگی میں فرمایا: قوموا عنی فإنہ لا ینبغی عند النبی التنازع (میرے پاس سے جاؤ، نبی کے پاس جھگڑا نہیں ہونا چاہئے) کیا نہیں کہا گیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سخت بیمار ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تو ہر بات ہر وقت حجت ہوتی ہے، بیماری میں تو اور زیادہ حجت ہوتی، پھر رکاوٹ کیوں ہوئی؟ اور کبار صحابہ میں جھگڑا کیوں ہوا؟ کیا حضرت عبداللہ بن عباس، حسب روایت بخاری، جمعرات کے اس دن کو یاد کر کے روتے نہیں تھے؟۔ (یہ بخاری کے طلبہ کے سوالات ہیں، براہ کرم جواب دیں)۔

۶- کیا پھر اسی دن یہ ثابت کرنے کے لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسے بیمار نہیں ہیں، ظہر کی نماز میں حضور مسجد تشریف نہیں لائے، یعنی اس واقعہ کے تھوڑی دیر بعد، اور نہ صرف یہ کہ آپ نے نماز پڑھی، بلکہ ظہر کی نماز کے بعد تقریر بھی کی، اور اسامہ بن زید کی قیادت پر تنقید کرنے والوں پر سخت نکیر فرمائی، (دیکھئے روایت صحیح بخاری) اور حضرت اسامہ کی قیادت میں لشکر کو رومیوں سے جنگ کرنے کے لیے جانے کا بتاکید حکم فرمایا، اور اس میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر، اور حضرت ابوعبیدہ وغیرہ حضرات کو بتاکید ساتھ جانے کا حکم فرمایا، اس کے چند گھنٹوں کی تاخیر بھی آپ کو گوارہ نہیں تھی۔ (حدیث وتاریخ کی کتابوں کی ورق گردانی کیجئے، اور جواب دیجئے)۔

آپ کو معلوم تھا یہ میرا آخری وقت ہے، جبرئیل نے آپ کو مطلع کر دیا تھا، اس موقع پر آپ کو ابوبکر وعمر کو شام روانہ کر رہے ہیں، جہاں جانے اور وہاں سے آنے میں ڈیڑھ ماہ یا دو ماہ لگتے، ایسا آپ کیوں کر رہے ہیں؟

۷- حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بار بار کی تاکید کے بعد یہ حضرات کیوں نہیں روانہ ہوئے؟۔

۸- دوشنبہ ۱۲/ربیع الاول ۱۱ھ میں آب کا انتقال ہوا، تو حضرت عمر انتقال کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، ان کا دماغ حاضر نہیں رہا، اور جب حضرت ابوبکر صدیق کی تقریر سے حقیقت واضح ہوگئی، تو ان کا بیان ہے کہ ان کے پیروں نے جواب دے دیا اور بے طاقتی کے عالم میں بیٹھنے پر مجبور ہو گئے۔

پھر سقیفہ بنی ساعدہ کی میٹنگ کی اطلاع پر انہوں نے وہاں جانے کا فیصلہ کیا، تو صرف

حضرت ابوبکر وحضرت ابوعبیدہ کو ساتھ لیا، حضرت علی اور حضرت عباس کو جو گھر ہی میں موجود تھے ساتھ کیوں نہیں لیا،؟؟ (سیرت وتاریخ کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص یہ سوال کرتا ہے)۔

اس سوال پر جناب مفتی صاحب! یہ الزام نہ لگا دینا کہ لیجئے شیخین کی بے حرمتی ہوگئی؟ ان باتوں کا صرف علمی جواب دیں، ادھرادھر کی باتیں نہ کریں۔

۹- بہرحال حضرت ابوبکرصدیق اور حضرت عمر فاروق کی خلافت ایک واقعہ بنی، اور حضرت علی نے ان کا تعاون کیا، اور پھر حضرت عثمان کا پورے دور خلافت میں ساتھ دیا، اور جب ان کے گھر کا محاصرہ ہوا تو محافظ دستہ کے طور پر حضرت حسن اور حضرت حسین کو ساتھ ان گے دروازے پر تعینات کیا، لیکن مصر سے بلوائی آگئے، شام سے معاویہ ان کے تحفظ کے لئے کیوں نہیں آئے؟ اچھا وہ نہ آتے اپنے عزیز بیٹے ''یزید'' کو ان کی حفاظت اور حمایت کے لئے بھیج دیتے، ایسا کیوں نہیں ہوا؟۔

۱۰- حضرت عثمان شہید ہوگئے، اور حضرت علی کو کبار انصار ومہاجرین نے خلیفہ طے کردیا، تو انہوں نے حضرت نائلہ سے پوچھا، کہ قاتل کا نام بتائیں، تاکہ قصاص کی کاروائی ہو، تو نام ہ بتاسکیں، اس لئے تحقیق اور مقدمہ اور بیانات سے پہلے، قصاص نہیں لیا جاسکا، کیا آپ اسے مانتے ہیں؟۔

۱۱- حضرت عائشہ، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر کے اصرار پر بشرہ روانہ ہوئیں، اور حضرت حضرت علی کو مجبوراً بصرہ جانا پڑا، مسئلہ اصلاح کا تھا، جنگ چھیڑ دی گئی، حضرت علی نے حضرت زبیر کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث یاد دلائی کہ تم علی سے اس حال میں جنگ کروگے کہ تم ظالم ہوگے، وہ فوراً محاذ جنگ سے روانہ ہوگئے، پھر ایک خارجی نے ان کو مار دیا۔ حضرت طلحہ بھی واپس جانا چاہتے تھے، ان کو مروان نے مارا، حضرت علی نے فرمایا کہ طلحہ کے قاتل کو جہنم کی وعید سنا دو!۔

حضرت عائشہ سے حضرت علی ملے، تو انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا، اور پھر اپنی اس غلطی پر عمر روتی تھیں، اور خاص طور پر جب بھی ''وقرن فی بیوتکن'' والی آیات پڑھتی تھیں،

تو اتنا روتی تھیں کہ دوپٹہ تر ہو جاتا تھا۔ اسے پڑھنے کی آپ کو توفیق ہوئی ہے یا نہیں؟۔

۱۲- یہ سب حالات معاویہ کو معلوم تھے اور علی کا خلیفہ راشد ہونا معلوم تھا، اور وہ حضرت عثمان کے ولی نہیں تھے، حضرت عبدالرحمن بن عثمان کو جب معلوم ہوا کہ معاویہ عثمان کے خون کا دعوی کر رہے ہیں، تو انہوں نے فرمایا: کہ ولی میں ہوں، وہ کون ہوتے ہیں دعوی کرنے والے! چلئے مان لیجئے کہ ولی وہ تھے، تو کسی بھی کیس میں قرآن کا، حدیث کا، فقہ اسلامی، شریعت حقہ کا دیا ہوا حکم کیا ہے؟۔

جناب قاضی صاحب! اسلامی عدالت میں مقدمہ دائر کیا جاتا ہے، حاکم یا محکوم، دونوں کی ذمہ داری ہے کہ عدالت اسلامی کے قاضی کے سامنے مقدمہ دائر کرے، مدعی بینہ پیش کرے، پھر قاضی جس کو مجرم گردانے، اس پر حد یا تعزیر جاری کی جائے۔

یہاں کون مقدمہ کا ولی ہے؟ کون سی عدالت ہے؟ بینات کیا ہیں؟ کیس کیسے ثابت ہوا؟ بغیر مجرم کے تعین کے اندھا دھند کاروائی، کسی پر الزام تراشی کر کے کے پوری انارکی کے ساتھ قبیلہ کے قبیلہ اور خاندان کو تاراج کر دینا، اور بے گناہوں اور وہ بھی کبار صحابہ پر پے بہ پے وار کر کے قتل کرنا، اور لاشوں کے ڈھیر لگا دینا یہ ''قاتلین عثمان'' کو سزا کس شریعت کے مطابق دی جا رہی ہے؟؟۔

عمار جیسے معیار حق کو جن کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، عمار جہاں رہیں گے، وہ حق پر ہوں گے، ان کو شہید کرنے کے بعد جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صراحت کے مطابق باغیوں کے سردار معاویہ کو عمرو بن العاص حدیث "إن عماراً تقتله الفئة الباغية" یاد دلاتے ہیں تو وہ ان کو جھڑک دیتے ہیں،!! اور لڑائی اسی طرح جاری رکھی جاتی ہے، اور صحابہ کے خون سے زمین رنگ دی جاتی ہے،

کیا یہ اسلام کا عدالتی نظام ہے؟؟ کیا اصول فقہ میں اسے ''اجتہاد'' کہتے ہیں، کیا نصوص صریحہ اور صحیحہ کی موجودگی ''اجتہاد'' جائز ہوتا ہے؟؟۔

کیا خلیفہ راشد جب یہ کہتے تھے کہ "لعنة الله على قتلة عثمان" اور معاویہ سے مطالبہ کرتے تھے کہ عدالت میں ان کے نام پیش کرو، اور ان کا جرم ثابت کرو، تو عادلانہ،

منصفانہ اور جائز مطالبہ کیوں نہیں پورا کیا جاتا تھا؟؟۔

جریر بن عبداللہ بجلی کو جب حضرت علی نے معاویہ کے پاس بطور سفیر بھیجا، ان کے علاوہ اور بار بار کبار صحابہ کو سمجھانے کے لئے بھیجا، تو ان کا کہنا تھا کہ شام کی حکومت میرے حوالے کردیں۔ تو میں جنگ بند کردوں گا، یہ سب بیانات مفتی صاحب! آپ کے جمہور کے سر نام علماء طبری، ابن کثیر، اور ذہبی جیسے حضرات محدثین کے یہاں ہیں؟؟۔

۱۳- جنگ جمل جیتنے کے بعد جب خلیفہ راشد نے جنگ صفین بھی جیت لی، اور آپ کی فوجیں شام میں داخل ہونے لگیں، تو نیزوں پر قرآن کس نے بلند کیا؟ اور کیوں کیا تھا؟۔

خلیفہ راشد جب تحکیم کے لیے تیار ہو گئے، اور ابوموسی اشعری کو اپنا نمائندہ بنایا، اور معاویہ نے عمرو بن العاص کو تو طے شدہ بات سے کون مکر گیا تھا، کس کو حضرت ابوموسی نے جھوٹا اور دھوکہ باز کہا تھا۔ اور بے انتہا شرمندگی سے پھر ابوموسی حضرت علی کے سامنے نہیں آسکے تھے، اور مکہ مکرمہ چلے گئے تھے؟؟

یہ تحقیقات اہلِ سنت علما کی ہیں یا نہیں؟؟۔

۱۴- خلیفہ راشد حضرت علی پر تبرا بازی کا حکم کس نے دیا تھا؟۔

۱۵- حضرت علی پر تبرا بازی کی روایتوں سے کون سی تاریخ کی کتاب خالی ہے؟۔

۱۶- سب سے پہلے اس تبرا بازی کو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بند نہیں کرایا تھا؟ پھر ان کو بنو امیہ کے مجرموں نے زہر دے کر مار دیا، اور تبرا بازی شروع ہوگئی؟۔

۱۷- کیا حضرت حسن نے مصالحت میں یہ شرط نہیں رکھی تھی کہ حضرت علی پر تبرا بند کیا جائے، اور حضرت معاویہ کے بعد خلافت ان کے حوالہ کی جائے؟۔

۱۸- کیا حضرت حسن کو یزید کی سازش کے نتیجہ میں ان کی بیوی جعدہ نے زہر نہیں دیا تھا؟ (اہلِ سنت مؤرخین ومحدثین کی کتابوں میں یہ حقائق درج نہیں ہیں؟)۔

۱۹- کیا مروان مسجد نبوی میں جمعہ کے خطبہ میں حضرت علی پر لعن وطعن نہیں کرتا تھا؟۔

۲۰- کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جب مروان کا باپ حکم آیا تھا۔ اور مسلمان ہوا اور صحابہ میں داخل ہوا تھا، پھر وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نقل نقل اتارنے لگا، مذاق کرنے لگا، تو آپ نے اس کو

مدینہ منورہ سے نکال دیا تھا، اور پھر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے اس طائف سے مدینہ منورہ آنے نہیں دیا؟۔

۲۱- کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں فرمایا تھا کہ میں نے حکم کی اولاد کو منبر پر اس طرح کودتی دیکھا جیسے بندر کودتے ہیں؟ (دیکھئے۔۔۔۔)۔

۲۲- کیا ابوبکر صدیق کے بیٹے حضرت محمد بن ابی بکرؓ کو۔ جن کو حضرت عثمانؓ نے مصر کا گورنر بنایا تھا، اور مروان نے حضرت عثمانؓ کی مہر استعمال مرے ان کے قتل کرنے کا آرڈر بھیجا تھا۔ معاویہ اور عمرو بن العاص نے اپنے دور حکومت میں شہید کر کے اور ایک گدھے کی کھال میں ڈال کر جلایا نہیں تھا؟ اور اس کے علم کے بعد ان کی بہن حضرت عائشہ صدیقہؓ نے معاویہ اور عمرو بن العاص کے خلاف ہر نماز کے بعد بد دعا نہیں کی تھی؟؟۔ (دیکھئے اپنے محدثین ومؤرخین کی کتابیں، اور ابن کثیر اور ذہبی کی نگارشات)۔

۲۴- حجر بن عدی جیسے صحابی جلیل کو اپنے دور حکومت میں معاویہ نے اس لئے قتل کرادیا تھا، کہ وہ حضرت علی کے ساتھ تھے، اور ان پر لعن طعن کے لئے تیار نہیں تھے، کیا اہلِ سنت علماء نے نہیں لکھا ہے حضرت عائشہ نے ان کے حق میں سفارش بھیجی تھی، معاویہ نے اس کو بھی نہیں سنا۔ اور ان کے خون ناحق سے زمین لالہ زار کردی ''حب صحابہ'' کا حوالہ دے کر چیخنے والوں قتل صحابہ جائز ہے؟۔

۲۵- کیا معاویہ کے ایک گورنر بسر بن ارطاۃ نے حضرت عبید اللہ بن عباس کے دو ننھے بچوں کو ماں کی گود سے چھین کر نہیں مار دیا تھا، اور کیا ذہبی نے ان کے بارے میں سخت تبصرہ نہیں کیا؟۔

۲۶- کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں فرمایا تھا کہ ''ھلاک اُمتی علی أیدی اُغیلمۃ من قریش'' اور حضرت ابوہریرہؓ ''أعوذ بالله من إمارة الصبيان'' اور پھر ''أعوذ بالله من إمارة الستين'' کی روایتیں نہیں نقل کرتے تھے؟ کیا روایتیں، مفتی صاحب! بخاری میں نہیں پڑھیں؟ یہ کون سے لونڈے تھے جن سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پناہ مانگتے تھے، کیا آپ بخاری کی ان حدیثوں کو مانتے ہیں؟ یا بنی امیہ کی محبت ماننے سے مانع ہے؟۔

۲۷- کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نہیں فرمایا تھا:

"ستكون الخلافة بعدى ثلاثين سنة، ثم ملك عضوض، ثم جبرية وعتو"

کیا زبان نبوت نے جس حکومت کو "ملک عضوض" کہا، آپ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بات نہ مان کر اس کے حق میں تاویلیں کریں گے؟؟۔

۲۸- کیا جن جمہور کے اقوال کی دھونس آپ جمانا چاہتے ہیں، وہ آپ کے عقیدہ وفکر وفقہ سے متفق ہیں؟ ابن تیمیہ، ابن کثیر، ذہبی آپ کی اشعریت اور ماتریدیت کو نہیں مانتے! اللہ تعالی کی ذات کے بارے میں آپ کے عقیدہ کو گمراہی سمجھتے ہیں! کیا بخاری "ایمان کی جو تشریح فرماتے وہ امام ابوحنیفہ کی تشریح کے خلاف نہیں ہے؟۔اور کیا اسی وجہ سے ان پر محدثین یہ کا فتوی نہیں ہے کہ وہ "مرجئ" تھے۔

مفتی صاحب! جس شاخ جمہور پر آپ اپنا آشیانہ بنا رہے ہیں وہ تو آپ گے عقیدہ کو بھی نہیں قبول کرتے۔ فأين المفر؟ كلا لا وزر۔

۲۹- کیا معاویہ کو اپنے ہی بیٹے یزید کے حالات نہیں معلوم تھے؟ کیا مغیرہ بن شعبہ کو جب کوفہ کی گورنرشپ سے انہوں نے ہٹایا تھا، تو انہوں نے یہ کہا تھا کہ اب میں ان سے یزید کی ولی عہدی کی بات کروں گا، اور جب انہوں نے ان کو یہ مشورہ دیا تو تو انہیں کوفہ کی گورنر شپ پھر واپس مل گئی، اور پھر مغیرہ نے کہا تھا کہ میں نے معاویہ کو ایسی دلدل میں پھنسایا ہے جس سے وہ کبھی نکل نہ سکیں گے(۔۔۔۔۔۔۔)۔

آپ تلبیس وتدلیس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ صحابہ کے یہ حالات اور ان گے مشاجرات نہیں ذکر کرنے چاہئیں۔

ناصحا! کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بھی آپ مشورہ دیں گے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ سب حالات اپنی حدیثوں میں بیان فرمادئے تھے، بخاری ومسلم کی کتاب الفتن والملاحم سے سنن، مصنفات وغیرہ، معاجم کی کتب المناقب پڑھئے، پھر کتاب الفتن والملاحم بھی پڑھئے پھر بتائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی حدیثوں ان پیش آنے والے واقعات کی نشاندہی نہیں فرمادی تھی؟ اور امت کو یہ ہدایت نہیں دی تھی؟ کہ اسے کیا موقف اختیار کرنا ہے؟ آپ

کتب الفتن والملاحم کو احادیث کے ذخیرہ سے نکال کر دریا برد کردیجئے، تاکہ آپ کی ناصبیت محفوظ رہے۔

۳۰- کیا معاویہ کے مقابلہ میں علیؓ اور عمار دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ رہنے کی ہدایت، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واضح الفاظ میں نہیں دی تھی؟۔

۳۱- کیا حضرات حسنین کو "سیدا شباب أهل الجنة" نہیں قرار دیا تھا؟۔

۳۲- کیا حضرت علی کے بعد حضرت حسن خلیفہء راشد نہیں تھے؟ تو ان کے خلاف معاویہ کی بیس ہزار نفری فوج میدان میں کیوں اتری تھی؟ اب کون سا اجتہاد کام کر رہا تھا؟۔

۳۳- کیا عمرو بن العاص نے جب اپنے بیٹے عبداللہ بن عمرو سے مشورہ کیا تھا تو انہوں نے حضرت علی کے ساتھ شامل ہونے کا مشورہ نہیں دیا تھا؟ اور ان کا جواب یہ تھا کہ علی ہمیں کیا دیں گے؟ معاویہ ہمیں حکومت دیں گے۔ یہ اقوال مفتی صاحب! آپ کے ''جمہور'' محدثین اور علماء کرام کے ہیں، ذرا ناصبیت کی عینک اتارئے اور پھر مطالعہ کیجئے۔

۳۴- آپ نے معاویہ کے بارے میں جتنی حدیثیں نقل کی ہیں، کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ سب ضعیف اور منکر حدیثیں ہیں، تمام محقق محدثین کا فیصلہ ہے کہ معاویہ اور عمرو بن العاص کی فضیلت کے بارے میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہے، بخاری مسلم اور صحاح میں تلاش کیجئے کوئی حدیث نہیں ملے گی، سنن میں جو حدیث ذکر کی گئی ہے وہ بھی ہدایت کی دعا کی ہے، اس کو بھی محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ امام ذہبی نے محدث ابن عساکر کی شکایت کی ہے کہ انہوں نے معاویہ کے ذکر میں منکر اور موضوعات کی بھر مار کر دی ہے۔ جب حدیث آپ کا موضوع نہیں تو کیا شوق ہوا ''ازالہ'' کا۔

ہمارے اور آپ کے امام نسائی کو اسی حقیقت کے اظہار میں شام کے ناصبی غنڈوں نے مار مار کر شہید کر دیا، امام اسحق بن راہویہ نے بصراحت یہ ارشاد فرمایا ہے کہ معاویہ کے بارے میں کوئی حدیث ثابت نہیں۔ (دیکھئے زوائد السنن ترتیب صالح احمد شامی، کتاب المناقب)۔

کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خلافت کے فوراً بعد، ملک عضوض کا تذکرہ نہیں فرمایا ہے، یعنی معاویہ

کی حکومت سے ''ملک عضوض'' کا دور شروع ہو جائے گا، معلوم ہونا چاہئے کہ یہ محدثین کے نزدیک بالاتفاق صحیح حدیث ہے۔

بھائی مفتی صاحب! جمہور کے چکر میں کمزور دھاگوں کو پکڑ کر چڑھنے کی کوشش نہ کریں، ورنہ سوائے گرنے اور چوٹ کھانے کے کچھ نہ ملے گا، آپ نے صحابہ کرام کے مقامات کو ثابت کرنے کے لیے جو زور لگایا ہے اس کی کوئی ضرورت نہیں، خود قرآن بتا رہا ہے کہ کون اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہیں اور کون ناپسندیدہ ہیں؟ جن حدیثوں کا تذکرہ آپ نے کیا ہے مثلاً ''اللہ اللہ فی اُصحابی'' جس کو خطبہ ٔجمعہ میں منبر کے خطیب پڑھتے ہیں، ضعیف حدیث ہے، اس کا کوئی ثبوت نہیں، اور یہ حدیث ''اُصحابی کالنجوم'' محدثین کے نزدیک قابلِ اعتبار نہیں، لہذا کمزور کھپچیوں پر مفتی صاحب! چلنے کی کوشش نا کریں۔

بس اس صحبت میں اتنے سوالات کافی ہیں، جوابات سیدھے اور راست مطلوب ہیں، اور کوئی سوال مستثنی نہیں ہیں۔

براہ کرم ان کے جوابات دے دیں، تاکہ پھر میں دوسری قسط جاری کروں، اور دوسرا سوالنامہ ارسال کروں۔

آپ کا صحابہ کرام کے دفاع کا جذبہ قابلِ قدر ہے لیکن آپ یہ مانتے ہیں جو صحابہ مرتد ہو گئے وہ صحابی نہیں رہے، ظاہر ہے کہ وہ تو کافر ہو گئے، لیکن یہ آپ نے مان لیا کہ صحابہ مرتد ہو گئے، اور یہ آخری درجہ کا جرم ہے، تو اس سے ادنی کے جرائم پھر کیوں نہیں ہو سکتے، فاسق کیوں نہیں ہو سکتے؟ ظالم کیوں نہیں ہو سکتے؟ جو آخری درجہ کا جرم کر سکتا ہے، وہ اس سے کم درجہ کا جرم کیوں نہیں کر سکتا؟ کیا عادل قاذف ہو سکتا ہے؟ کیا حضرت۔۔۔حضرت۔۔۔حضرت حسان کے جرم قذف میں کوڑے نہیں لگائے گئے؟ کیا دیگر صحابہ سے کبائر نہیں ہوئے؟ نہ قرآن انہیں معصوم کہتا ہے، نہ نبی، تو آپ کے جمہور ان کی فضیلت میں ایڑی چوٹی کا زور کیوں لگاتے ہیں۔

آپ کا کہنا ہے کہ جو منافق تھے، وہ صحابہ نہیں تھے؟ آپ منافقوں کی کوئی لسٹ بنا سکتے ہیں؟ احد کے موقعہ پر تین سو بھگوڑے کون تھے؟ آب کے پاس کوئی فہرست ہے؟ وہ مسلمان تھے۔ مسلمان مرے۔ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ تو صحابہ کی تعریف ان پر منطبق

ہورہی ہے یا نہیں؟ کیا آپ کے پاس ان کے بارے میں علم غیب ہے؟۔

تبوک کے بارے سفر میں کن صحابہ کو منافق کہا گیا، اور وہ سفر جہاد میں م شرارتیں کرتے رہے، قرآنی آیات میں ان کا بیان ہے، احادیث میں بغیر نام کے ان کے تذکرے ہیں، کسی کسی کا نام بھی آ گیا ہے، ان کو ''صحابہ'' سے الگ کس کالونی میں بسایا گیا تھا، یا وہ عام صحابہ کے ساتھ رہتے تھے، نمازوں میں آتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی تقریروں میں ان پر سخت نکیر فرماتے تھے، کیا وہ صحابہ نہیں تھے؟ کیا وہ مسلمان نہیں شمار ہوتے تھے؟ کیا حضور ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھ رہے تھے؟ کیا سردار منافقین مسلمانوں میں شمار نہیں ہوتا تھا؟ کیا اس کی نماز جنازہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں پڑھائی تھی؟۔

آپنے کتاب میں عبداللہ بن اُبی کے بارے میں نشاندہی فرماتے ہوئے بڑی غلطی پکڑی کہ ابی (بالفتح) لکھا ہوا ہے، کیسی بچکانہ حرکت ہے، ہمارے شاگردوں کے شاگردوں اور چھوٹے بچوں کو بھی معلوم ہے کہ وہ عبداللہ بن اُبی (بالضم) تھا، اس کی ایسی نشاندہی فرمار ہے ہیں کہ جیسے ''فاضل محقق'' کو یہ بھی نہیں معلوم!!۔

کیا ندوہ کے ذمہ داروں کو یہ معلوم نہیں کہ جب مولانا عتیق صاحب کی کتاب آئی تھی اور نعمانی خاندان کے بعض افراد نے ندوہ پر حملہ کیا تھا اور مولانا علی میاں کو مطعون کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، اس وقت یہ مفتی عتیق یزیدی صف میں کھڑے تھے، اور میں نے تنہا اس وقت اس حملہ کا مقابلہ کیا تھا، اس وقت میرا مضمون ''شیعیت، سنیت، ناصبیت'' چھپا تھا، جس کی ٹیس آج بھی مفتی صاحب کو محسوس ہورہی ہے، اور اپنی ناصبیت اور یزیدیت کو چھپانا - باوجود دکھاوے کی تاویلات کے - ان کے لئے مشکل ہورہا ہے۔ اخیر میں جن مولویوں سے بات شروع کی تھی، ان سے یہ کہتے ہوئے بات ختم کرتا ہوں:

دع المكارم لا ترحل لبغيتها
واقعد فإنك الطاعم الكاسي

دین کے کاموں میں حکمت ومصلحت

از
مفتی محمد عبید اللہ اسعدی
شیخ الحدیث جامعہ عربیہ ہتھورا، باندہ، یوپی

دین کے کاموں میں حکمت و مصلحت اور ہر حکم شریعت نیز ہر واقعہ و حقیقت قابل ذکر نہیں

حق تو حق ہی ہے جس کا حق اظہار و بیان ہے لیکن حق کے اظہار و بیان کے لئے بھی کچھ حقوق و حدود متعین ہیں ان کا لحاظ رکھتے ہوئے اگر حق کا بیان ہو اور اس کی حقانیت و حلاوت نمایاں طور پر سامنے آتی ہے اور مفید ہوتی ہے اور نہ اس کی حقانیت کڑواہٹ سے بدل کر نقصان و فساد کا باعث بنا کرتی ہے۔

حق کے اظہار و بیان کے لئے ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ جذبہ حق ہو، موقع حق ہو، لفظ بھی حق ہو اور انداز بھی حق ہو۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر ایک فریضہ ہے اور اہم فریضہ ہے مگر اس فریضہ کے لئے بھی کچھ حدود متعین ہیں جیسے شریعت کے دیگر فرائض کے لئے حدود متعین ہیں، کسی بھی فریضہ کی ادائیگی کے لئے اس کے حق میں مقرر کردہ حدود کا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے، ورنہ نماز و روزہ وغیرہ ارکان اسلام بھی رد و غیر معتبر ہو جاتے ہیں اور امر و نہی بھی اپنا کام کرنے کے بجائے کچھ اور کرتا ہے، ہر جگہ، ہر حال میں، ہر ایک کے لئے یہ کام مناسب کیا جائز و درست بھی نہیں ہوتا۔

ہر حق بات کہنے کی نہیں ہوتی اور بسا اوقات ایک سے دوسرے یا تیسرے تک بھی پہنچانے کی نہیں ہوتی، کبھی مطلقاً، ہر حال میں اور کبھی کم از کم ایک زمانہ اور ایک وقت تک۔

ہر سوال قابل جواب نہیں ہوتا اور نہ ہر اعتراض لائق دفاع ہوتا ہے، ایک سوال کا جواب دیا جاتا ہے اور دوسرا اذا مروا باللغو مروا کراما (لغو باتوں کے پاس سے جب وہ لوگ گذرتے ہیں تو شرافت سے (خاموش و صرف نظر کر کے) گذر جاتے ہیں اور "وإذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاما" (اور جاہل لوگ جب ان سے تعرض کرتے ہیں تو وہ سلام کر کے نکل جاتے ہیں) کے تحت چلا جاتا ہے۔

ایک اعتراض و اشکال کے ازالہ کے لئے اتنا اہتمام کیا جاتا ہے کہ متعلقہ لوگوں کو جمع کیا

جاتا ہے اور بات کو ان سے سمجھا جاتا ہے اور پھر ان کی تسلی کا سامان ایسا کیا جاتا ہے کہ وہ پہلے سے زیادہ خوش و منشرح ہوجاتے ہیں اور دوسرے اشکال کو سن کر صرف نظر کیا جاتا ہے اور بسا اوقات ایک لفظ زبان سے نہیں نکلتا یا نکلتا ہے تو صرف نظر کا۔

غزوۂ حنین کے موقع سے جو مال غنیمت حاصل ہوا تھا جس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طور پر تقسیم فرمایا تھا کہ اب تک کے معمول کے خلاف حضرات انصار میں سے کسی کو کچھ نہیں دیا تھا اور مہاجرین میں بھی بظاہر سب کو نہیں دیا تھا، بلکہ فتح مکہ کے بعد اسلام لانے والے متعدد خواص کو، اور کافی سے زیادہ عطا فرمایا تھا۔

اس چیز نے ایک الجھن پیدا کی جو بعض کی طرف ان لفظوں میں سامنے آئی ''یہ تقسیم صحیح نہیں ہے'' جس کو سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف نظر فرمایا جو دل ایک ناگواری کا اثر ہو تو اس کو یہ فرما کر دور کرلیا:

رحم اللہ موسی فقد أوذی بأکثر من ھذا فصبر (اللہ موسی علیہ السلام پر رحم فرمائے کہ ان کو اس سے زیادہ تکلیف دی گئی مگر صبر فرمایا) اور حضرات انصار کے بعض نوعمروں کی طرف سے تاثر ان لفظوں میں سامنے آیا۔

''حق تعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو معاف فرمائے کہ قریش کو مال دے رہے ہیں اور ہم کو چھوڑ دیا جب کہ ہماری تلواریں ابھی بھی ان کے خون سے رنگیں ہیں''

یہ بات آپ تک پہنچی تو آپ نے اس تاثر کے ازالہ کے لئے بڑا اہتمام فرمایا، حکم فرمایا کہ سارے حضرات انصار کو ایک جگہ اس طرح جمع کیا جائے کہ کوئی دوسرا نہ ہو، آپ تشریف لائے تو دریافت فرمایا کہ کوئی دوسرا تو نہیں؟ عرض کیا گیا بس ایک آدمی جو حضرات انصار میں سے کسی ایسی خاتون کا بچہ ہے جن کی شادی انصاری سے باہر کسی خاندان میں ہوئی ہے، آپ نے فرمایا کہ کوئی حرج نہیں گھر کا نواسہ بھی گھر کا ہی ایک فرد ہوتا ہے۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان حضرات سے گفتگو فرمائی جو اس پر ختم ہوئی کہ میں تو تمہارا ہی تھا اور تمہارا ہوں، یہ بتاؤ کہ تم کو دنیا کی مال و دولت چاہئے یا میری ذات جو اس سب مال و متاع سے کہیں بہتر ہے تو حضرات انصار نے عرض کیا اے اللہ کے رسول اب ہم سب راضی و

خوش ہیں۔(ملاحظہ ہو صحیح بخاری۔مغازی۔باب غزوۃ الطائف)

ان حضرات کے دلوں میں جو کچھ تھا اور جو زبان پر آیا وہ سراسر اخلاص پر مبنی تھا جو ایک وقتی تاثر تھا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبانہ وضاحتی گفتگو کے بعد ایسا دور ہوا کہ آپ نے ان کے لئے اس پس منظر میں جو یہ فرمایا کہ تم لوگ پسند کرو تو بحرین کا سارا جزیہ تمہارے لئے لکھ دوں، تو حضرات انصار نے کہا اس شرط پر کہ ہمارے ساتھ ہمارے مہاجرین بھائیوں کو بھی شامل کیا جائے۔آپ نے اس سے انکار فرمایا تو بات رہ گئی۔

(بخاری کتاب الجزیۃ باب ما اقطع النبی صلی اللہ علیہ وسلم من البحرین)

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول حضرت سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جو علم عطا فرمایا تھا وہ مخلوق میں کسی کا نہیں تھا، مگر آپ نے وہ سارا علم حضرات صحابہ کے سامنے نہیں رکھا اور نہ حضرات صحابہ نے آپ سے جو کچھ حاصل کیا وہ سب امت کے سامنے رکھا، بعض حضرات کو آپ نے کوئی بات بتائی تو انہوں نے اپنی ذات ہی تک رکھا کہ یہی ہدایت تھی یا ایسا ہی سمجھا، حضرت انس رضی اللہ عنہ سے کوئی بات فرمائی تو انہوں نے اپنی والدہ تک سے نہیں بتایا۔

(بخاری حدیث ۶۲۸۹ و مسلم حدیث ۲۴۸۲)

اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو ان لوگوں کے نام بتائے جن کی نماز جنازہ پڑھنے سے آپ کو عبداللہ بن ابی کے انتقال کے بعد اور اس کی نماز جنازہ کے بعد منع کر دیا گیا تھا، انہوں نے اس فہرست کا ایک نام بھی کسی کو نہیں بتایا، کیونکہ ان کو اس سے منع کیا گیا تھا(تفسیر ابن کثیر سورۂ توبہ آیت ۸۴ / فتح الباری کتاب التفسیر، توبہ، آیت مذکورہ)

بیت اللہ کی تعمیر کی نسبت سے ایک بات آپ نے صرف اور صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بتائی اور ان سے کہی اور ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک لمبا وقفہ ملا مگر انہوں نے بعض خواص کے ماسوا کسی سے ذکر نہیں کی، بظاہر صرف تین یا چار آدمیوں سے یہ بات نقل کی گئی ہے(جیسا کہ صحاح ستہ وغیرہ کی روایات سے واضح ہوتا ہے) (ملاحظہ ہو جامع الاصول حدیث ۶۹۰۷)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جن کا یہ امتیاز ہے کہ صحابہ میں سب سے زیادہ روایات ان سے ہی مروی ہیں، جن کی تعداد ساڑھے پانچ ہزار کے قریب ہوتی جب کہ ان کو بمشکل پانچ سال

کی صحبت ومصاحبت میسر ہوئی، وہ فرماتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علم کے دو ذخیرے حاصل کئے، ایک کو میں نے تمہارے درمیان لٹا دیا اور پھیلا دیا، اور دوسرا حصہ ایسا ہے کہ اگر اس کو کھولوں اور بیان کروں تو میری گردن کاٹ دی جائے۔ (صحیح بخاری۔حدیث ۱۲۰)

عجیب بات ہے کہ لوگ مختلف عناوین سے حضرات صحابہ کی ان باتوں کو نقل کرتے ہیں جو ان سے بشریت کے تحت کسی وقت صادر ہوگئیں اور کہتے ہیں کہ وہ ایسے تھے اور یہ کرتے تھے، جس میں یہ بھی شامل ہے کہ بعض عربی الفاظ کے ایک خاص مفہوم میں جو برا سمجھا جاتا ہے زیادہ استعمال ہونے کی وجہ سے اس کی نسبت ان کی طرف کرتے ہیں مثلاً بعض روایات میں صحابہ کی آپس کی گفتگو میں کذب اور کذبت کا لفظ آ گیا اور سمجھا گیا کہ اس کے معنی بس وہ ہیں جس کو ہم جھوٹ کہتے ہیں تو بے تکلف کہہ دیا کہ صحابہ بھی جھوٹ بولتے تھے یا ایک دوسرے کی تکذیب کرتے تھے، جب کہ اس لفظ کے معنی متعین پر جھوٹ بولنے کے نہیں یا وہ نہیں جس کو ہم جھوٹ کہتے ہیں۔

بلکہ اس کے معنی ہیں ''خلاف واقعہ بات کا زبان سے نکالنا'' جس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ آدمی کی زبان سے کوئی بات خلاف واقعہ زبان سے نکلے لیکن قصداً نہیں بلکہ کسی غلط فہمی وغیرہ کی بنا پر، ایسی صورت میں ''کذب'' کا ترجمہ ''غلط بولنا اور غلط کہنا'' وغیرہ سے کیا جاتا ہے۔

اور دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی قصداً جان بوجھ کر خلاف واقع کوئی بات اپنی زبان سے نکالتا ہے، اس کو جھوٹ کہتے ہیں جس کی شریعت میں بڑی مذمت آئی ہے۔

صحابہ کی نسبت سے تو اس کا تصور ہی نہیں کہ ان کی عدالت ایک مسلمہ ہے جس میں جھوٹ کی کوئی گنجائش نہیں اور صحابہ نے خود فرمایا ہے ''کوئی صحابی رسول۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں جھوٹ نہیں بول سکتا''۔ (ترمذی۔کتاب المناقب۔مناقب ابی ھریرۃ۔جامع الاصول الحدیث ۶۶۴۳)

اور جو چیز واقعۃً بری تھی اور ان سے صادر ہوئی اس کے بعد ان کا کیا حال ہوتا تھا جو روایتوں میں انہیں کے واقعات کے ساتھ محفوظ ومنقول ہے اس کی طرف یہ سب نقل کرنے والوں کی توجہ نہیں ہوتی۔

کتاب الحدود میں زنا کے بعد واقعات پڑھیے بالخصوص حضرت ماعز اسلمی نیز امرأۃ غامدیہ کے قصے کہ کس بے چینی و بے تابی سے حاضر خدمت ہو کر اور بار بار اقرار کر کے باصرار خود کو سزا

دلوائی۔اور زبان نبوی سے شہادت وسعادت حاصل کی۔(جامع الاصول/حدیث ۱۸۳۴)

(۱)اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے یہ آدمی جنت کی نہروں میں غوطے لگا رہا ہے۔(ابوداؤد۔حدود۔۴۴۲۸و۴۴۴۹)

(۲)اس نے تو ایسی توبہ کی ہے کہ اہل مدینہ ایسی توبہ کرتے تو سب کی طرف سے قبل ہوجاتی۔ (ابوداؤد۔حدود۔حدیث ۴۳۷۹وترمذی۔حدود/حدیث ۱۴۵۴)

(۳)اس نے تو ایسی توبہ کی ہے کہ ظالمانہ ٹیکس وصول کرنے والا بھی ایسی توبہ کرتا تو اس کو معاف کر دیا جاتا۔ (مسلم۔حدود۔حدیث ۱۶۹)

(۴)ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص کو رجم کئے جانے کے بعد کسی نے خبیث کہہ دیا تو فرمایا گیا" اس کو خبیث نہ کہو کہ وہ تو اس وقت جنت میں ہے اور وہ اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ اچھا ہے"۔(ابوداؤد،حدود،حدیث ۴۴۳۵و۴۴۳۶)

شراب پینے کے واقعات میں بعض حضرات صحابہ کے تاثرات پڑھئے کہ اس عمل کی شناعت کی وجہ سے ان کی زبان سے بعض جملے نکل گئے اور پھر زبان نبوی نے کیا فرمایا:

(۱)اس پر لعنت مت کرو کہ بخدا میں تو یہی جانتا ہوں کہ یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے(بخاری۔حدود۔حدیث ۶۷۸۰)

(۲)اس طرح کی باتیں مت کرو کہ اس کے حق میں تم شیطان کی مدد کرو۔

(بخاری۔حدود۔حدیث ۶۷۸۱،۶۷۷۷)

حد یہ ہے نہ زنا ہو اور نہ شراب کا پینا بس نفس نے مغلوب کر دیا تو ایک اجنبی عورت کا بوسہ لے لیا جو ظاہر ہے کہ درست نہ تھا مگر کیا ہوا پڑھئے ارشاد باری تعالیٰ اور تفسیر کی کتابوں میں تفصیل ملاحظہ کیجئے:

اقم الصلوٰة طرفی النهار وزلفا من الليل ان الحسنت يذهبن السيأت ذلك ذكرى للذاكرين

(دن کے دونوں حصوں اور رات کے کچھ حصوں میں نماز ادا کیا کیجئے بلاشبہ نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں، یہ نصیحت ہے نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے)

صحابہ کی شان تو یہ تھی کہ وہ اپنے ایمان واحوال کا اس طرح جائزہ لیتے تھے کہ ان کو اپنے حق میں اور اپنے ایمان خلوص واخلاص میں شبہ ہونے لگتا تھا بلکہ بے تکلف یہ کہہ اٹھتے کہ میں تو منافق ہو گیا، یہ حال ایک صحابی صرف حضرت حنظلہ کا نہیں تھا بلکہ ایک جماعت کا تھا، احادیث میں کئی واقعات آئے ہیں۔

حضرت حنظلہ کا قصہ ''نافق حنظلہ،، تو معروف ہی ہے اور جس میں آیا ہے کہ گھر سے اس خیال وآواز کے ساتھ نکلے تو اس تاثر میں ایک جماعت ساتھ ہو گئی۔ (صحیح مسلم حدیث ۲۷۵۰)

یہ بھی آیا ہے کہ ایک موقع پر ایک جماعت نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ہمارا تو عجیب حال ہے کہ آپ کی خدمت میں حاضر وموجود ہوتے ہیں تو یہ حال ہوتا ہے، دل انتہائی نرم ومتاثر ہوتے ہیں اور خدمت اقدس سے جدا ہو کر جب گھروں کو جاتے ہیں اور بیوی بچوں کے درمیان ہوتے ہیں تو یہ سارے تاثرات ختم ہو جاتے ہیں۔ (مسند احمد/ ۱۲۷۹۶۔صحیح۔شعیب الارناؤط)

اور ان روایات میں آپ کا جو جواب نقل کیا گیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ تو ہوتا ہے ہر وقت آدمی ایک حال میں نہیں رہ سکتا، اگر مذکورہ کیفیت تم لوگوں کی مستقل ہو تو فرشتے تم سے تمہارے بستروں پر مصافحہ کریں۔

جو لوگ حضرات صحابہ کے ایسے واقعات کو ایک علمی دیانت وامانت اور تاریخی وواقعی حقیقت بتا کر بیان کر درست سمجھتے ہیں ان پر لازم ہے کہ ان حضرات کے ان احوال وتاثرات کو بھی ساتھ ساتھ بیان کیا کریں تا کہ یہ بات واضح ہو سکے کہ ہماری طرح کی بشریت جو عصمت سے پاک نہیں اس کی وجہ سے اگر ان سے کچھ ہوتا تو ان کا امتیاز یہ بھی تھا کہ اس کے اظہار میں اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے وکرانے میں پہلو تہی نہیں کرتے تھے۔

ہم تو اپنے مربی ومصلح کے سامنے بھی اپنی ایسی کوتاہیوں کا لانا وذکر کرنا پسند نہیں کرتے جس کے نتیجے میں ممتاز اہل اللہ سے تعلق میں عمر یں گذر جاتی ہیں اور اصلاح نہیں ہوتی۔

صحابہ کے احوال کو کریدا جاتا ہے اور ذکر کرنا مناسب ومفید بلکہ ضروری سمجھا جاتا ہے لیکن کون ہے جو اپنے ماضی کو جو بسا اوقات حال بھی ہوتا ہے عوام کے سامنے نہیں ان خواص کے سامنے لاتا ہو کہ جن کے حق میں امید ہو کہ شاید اپنے اخلاص کی وجہ سے اس سے فائدہ اٹھالیں،

اسی طرح اپنے بڑوں و بزرگوں کے اس انداز کے احوال کو کہ جن سے کم لوگ خالی ہوتے ہیں اور بسا اوقات ان احوال میں متعلقین کے لئے سبق بھی ہوتا ہے۔

اللہ کے بندے، اللہ کی واقعی طلب رکھنے والے بسا اوقات خلوص اخلاص کے ایسے پیکر ہوتے ہیں کہ آنکھ سے دیکھ کر اور کان سے سن کر بھی جلدی بدگمان نہیں ہوتے خیر کو ہی سوچتے اور اس کی توقع رکھتے ہیں اور اس کی وجہ سے وہ فائدہ اٹھاتے اور نوازے جاتے ہیں۔

ایک واقعہ معروف ہے۔ اس کو فرضی نہیں سمجھنا چاہئے، واقع ایسے حقائق سے خالی نہیں کہ ایک ڈاکو۔ ولی بن کر بیٹھ جاتا ہے جو بھی جذبہ پیچھے ہو اور اس کے طور وطریق سے متاثر ہو کر کچھ لوگ ساتھ ہو جاتے ہیں، وہ اپنے خلوص کی وجہ سے قرب خداوندی حاصل کر لیتے ہیں اور مرشد۔ جو مخلص نہیں تھا بناوٹی تھا وہ محروم و خالی رہتا ہے جب کہ اس کی وجہ سے دوسرے ولی بن گئے۔

ان مخلصین نے جو اولیاء کاملین میں ہو چکے تھے اپنے پیر و مرشد کے مقام کو سمجھنے کی کوشش کی تو عالم روحانیت میں وہ کسی مقام پر نہیں ملے اور وہ تھے خلوص کے پیکر تو اپنی کوتاہی و کمی کو تو سوچا مرشد کی کمی و نالائقی کو نہیں۔ اپنی کمی یہ کہ ہمارے مرشد کا مقام بہت بلند ہے اور ہم ان سے فر وتر ہیں اس لئے تلاش نہ کر سکے اور پھر حاضر خدمت ہو کر جب بصد اخلاص عرض کیا کہ حضرت اب آپ ہی اپنی بابت کچھ فرمائیں تو مریدین با صفا کے خلوص نے گریہ طاری کر دیا اور صاف اقرار کر لیا کہ میں تو بناوٹی اور ڈھونگی تھا اور ہوں اور پھر ان مریدین با صفا کے خلوص و کمال نے مرشد کو بھی کامل بنا دیا۔

یہ سب باتیں لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ کتابوں میں بہت کچھ لکھا ہے، روایات میں بہت سی باتیں آئی ہیں ان کو پڑھ کر دل و دماغ میں بہت سے خیالات و تاثرات آتے ہیں، لیکن نہ کتابوں کے سارے مندرجات کا دوسروں کے سامنے اور منظر عام پر لانا درست ہے اور نہ اپنے دل و دماغ کے تمام خیالات و تاثرات کو برملا کرنا درست ہے۔

پہلے یہ سوچنا ہوگا کہ ہمارے اس اظہار کا ردعمل کیا ہوگا؟ کہیں کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوگی اور کوئی غلط ردعمل تو سامنے نہیں آئے گا؟ یا یہ کہ امت میں کوئی فتنہ و انتشار تو سامنے نہیں آئے گا؟ کچھ لوگ اس سے غلط استدلال کر کے اس سے غلط فائدہ تو نہیں اٹھائیں گے؟

ہمارے فقہاء کو حق تعالیٰ جزائے خیر دے کہ بعض مسائل کو بیان کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا ہے: ھذا مما یعلم ولا یفتی بہ وھذا ما یدرك ولا یفتی بہ اور ساتھ میں کہیں کہیں یہ بھی کہہ دیا ہے کہ کیلا یتجاسر الظلمة۔

(درمختار ورد المحتار باب العشر من الزکاۃ وباب العشر والجزیۃ من الجہاد)

حجاج بن یوسف نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ معلوم کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سخت ترین سزا کبھی کسی کو دی ہے وہ بتایئے، انہوں نے ایک معروف واقعہ کا تذکرہ کیا، جس میں یہ آیا ہے کہ کچھ لوگ لوٹ، قتل اور ارتداد ان سارے امور کے مرتکب ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ہاتھ و پیر کاٹ دیئے اور آنکھوں میں لوہے کی سلائیاں گرم کرا کے پھروائیں اور ان کو مدینہ کے باہر ایک میدان میں پھینکوا دیا۔ (طبرانی المعجم الوسیط، یہ واقعہ بخاری وغیرہ میں متعدد جگہ مذکور ہے)

حضرت حسن بصری و عمر بن عبدالعزیز رحمہما اللہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ حضرت انس نے حجاج سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے تو فرمایا کہ حضرت انس کو ایسا نہ کرنا چاہئے تھا۔

(طبرانی۔ المعجم الاوسط وغیرہ)

نیز یہ بھی آتا ہے کہ بعد میں حضرت انس کو بھی اس کا احساس ہوا۔

(ابن کثیر۔ المائدۃ۔ آیت ۳۳)

اس لئے کہ حجاج بن یوسف کا مقصد اپنے ظلم و ستم کی تائید کے لئے ایسی باتوں کا معلوم کرنا اور استعمال کرنا تھا کہ انسان کی فطرت کچھ اسی قسم کی ہے چنانچہ بعض روایات میں مذکور بھی ہے کہ حجاج بطور دلیل اس واقعہ کا تذکرہ کیا کرتا تھا۔ (ابن کثیر۔ آیت ۳۳)

فتح مکہ کا واقعہ معلوم ہے کہ یہ سفر، ایک خاص مقصد اور خاص حالات میں کیا گیا تھا جو حرم مکی کے حق واحترام میں احرام کے بجائے پورے طور پر ہتھیاروں اور جنگ کی تیار کے ساتھ تھا کہ نہ جانے کیا صورت پیش آئے اور کچھ نہ کچھ پیش آئی بھی۔

فتح مکہ کے اگلے ہی دن نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے خطاب فرمایا جس میں واضح طور پر ذکر فرمایا کہ اے لوگو سنو یہ اللہ کا حرم محترم ہے اس کا بہت بڑا حق ہے، اس کی بے حرمتی کہ یہاں جنگ کے نظام وارادوں اور ہتھیاروں کے ساتھ آیا جائے یہ کسی کے لئے جائز نہیں۔

نہ مجھ سے پہلے یہ جواز کسی کے لئے تھا، نہ میرے بعد کسی کے لئے، یہ جیسے کل حرم محترم تھا آج بھی ہے۔

اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اگر کوئی یہ کہے کہ میں نے ایسا کیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اس طرح مکہ میں آئے تو اس سے کہہ دینا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اللہ نے اس کی اجازت دی تھی اور وہ بھی بس تھوڑی دیر کو اور تم کو کس نے اجازت دی۔

(بخاری، مغازی، بیان فتح مکہ)

آپ نے یہ بات انسانی ذہن ومزاج کی اسی بات کو سامنے رکھ کر فرمائی تھی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ لوگوں سے ان کی عقل ودماغ کے مطابق بات کیا کرو کہ جس کو سن کر وہ سمجھیں اور ہضم کرسکیں، ان سے ان کے لئے ناقابل تحمل باتیں مت کرو کہ جس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے وہ ان باتوں کو جھٹلائیں گے تو اللہ ورسول کو جھٹلانے کی نوبت آئے گی۔ (بخاری۔ کتاب العلم حدیث ۱۲۷)

حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اپنے بلند ترین مقامات اور عظمتوں کے باوجود انبیاء کی طرح معصوم نہیں تھے، اگرچہ محفوظ ضرور تھے، ان سے کچھ ایسی باتیں ضرور ہوئیں جو ان کے شایان شان نہیں تھیں اور ان چیزوں میں بھی بڑی حکمتیں رہیں کہ ان سے امت کو بہت سے احکام بھی ملے، لیکن حضرات صحابہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دین لے کر آگے بڑھانے کی جو ذمہ داری تھی اور انہوں نے اس ذمہ داری کو جس طرح پورا کیا علماء امت نے اس کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا کہ حضرات صحابہ سے صادر ہونے والے ایسی چیزوں کا تذکرہ نہ کیا جائے کسی بھی عنوان وبہانے سے اور یہ اس لئے کہ ان کے شایان شان ان کا احترام وعظمت امت کے دلوں میں قائم وبرقرار رہے جیسے انبیاء کو عصمت کا مقام دے کر اس سے بڑھ کر ان کے احترام وعظمت کو محفوظ فرمایا ہے۔

اب اگر صحابہ کی کمزوریوں کو کسی بھی عنوان سے تحقیقی ہو یا کچھ اور تحریر وتقریر کا موضوع بنایا جائے گا اور اس کا برملا اظہار کیا جائے گا، کتابوں میں، رسالوں میں، جلسوں میں اور آج کے دور میں جب کہ نشر واشاعت کے ادارے وذرائع آج ہر ہاتھ میں ہیں تو یہ باتیں عوام کے درمیان پہنچ کر امت کو کیا پیغام دیں گی۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ آج عوام میں وہ پڑھے لکھے وہ ذی شعور لوگ بھی داخل ہیں جو دین کے بنیادی مسائل واحکام کا مضبوط اور تفصیلی و تحقیقی علم نہں رکھتے، انگریزی تعلیم یافتہ ہوں یا آج کے عام فضلاء مدارس جو عموماً نا پختہ ہوتے ہیں اور جو معروف علماء واساتذہ کو بڑی عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اوران کی باتوں پر اعتماد کرتے ہیں۔

ایسی باتیں کوئی اچھا پیغام نہیں دیتیں، بلکہ فتنہ کا باعث ہوتی ہیں، عوام کا دین وایمان خراب ہوتا ہے، اپنے مقتداؤں سے ان کا اعتماد اٹھتا ہے۔

علماء امت نے جس موضوع پر اپنی زبان وقلم کو پابند کیا، اس سے متعلق عوام بحث ومباحثہ کرتے ہیں اس کا نتیجہ کیا ہوگا ظاہر ہے

ایسی چیزیں دین وایمان کو خراب کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کرتیں، اسی لئے احادیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تقدیر سے متعلق بحث کرنے سے منع کیا ہے۔ (ترمذی / القدر حدیث ۲۱۳۳)

حق تعالیٰ کی ذات سے متعلق بحث کرنے سے منع کیا ہے (حلیۃ الاولیاء ۶ / ۶۶)

ایک معروف حدیث میں آیا ہے:

اقرئوا القرآن ما ائتلفت قلوبکم فاذا اختلفتم فقوموا منه)

(بخاری، فضائل القرآن حدیث ۵۰۶۰ و ۵۰۶۱)

(قرآن اسی وقت تک پڑھو جب تک تمہارے دلوں میں جمعیت ہو وا تفاق ہو اور اختلاف ہونے لگے تو قرآن پڑھنا بند کردو)

اور فتنہ۔ ایسا فتنہ جو مسلمانوں کے درمیان انتشار پیدا کرنے والا نیز دین وایمان کو خراب کرنے والا۔ ہی نہیں بلکہ اس سے محروم کرنے والا ہو یہ ایسی چیز ہے کہ حضرات صحابہ نے بھی اس کا لحاظ کیا ہے، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب حج کے موقع سے مکہ مکرمہ میں چار رکعت پڑھنے کا سلسلہ شروع کیا تو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ نے اس پر انکار کیا مگر جب حج کیا تو ان کے ساتھ اوران کے پیچھے چار ہی رکعت پڑھی اور جب ان سے عرض کیا گیا کہ آپ تو اس کو غلط کہتے ہیں تو فرمایا: ایسے مواقع میں اختلاف کا اظہار شر و فتنہ ہے، الخلاف شر

(جامع الاصول بحوالہ صحیحین وغیرہ/ حدیث/ ۴۰۲۰ وحدیث ۴۰۲۷)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کا لحاظ فرمایا ہے اور اس کے لحاظ میں نہ صرف یہ کہ آپ نے ایک بڑی خواہش بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک بڑی ضرورت بھی تھی، پوری نہیں کی، بلکہ اس کا تذکرہ بھی زبان مبارک پر عمومی طور پر صحابہ کی عام مجلس میں یا اس طرح نہیں فرمایا کہ وہ بات لوگوں کے درمیان عام ہو، بلکہ صرف حضرت عائشہؓ سے اس ذکر فرمایا کہ انہوں نے بھی اس کو عام نہیں کیا، یہ بہت اہم بات ہے جس کو صحیح بخاری کی روشنی میں سمجھنے اور دیکھنے کی ضرورت ہے۔(بخاری۔ الصلاۃ ابواب تقصیر الصلاۃ /حدیث ۱۰۸۰ والحج /حدیث ۱۶۵)

اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو اس نسبت سے ایک اصولی بات ذکر فرمائی جس کا تذکرہ گزر چکا ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح کتاب العلم میں اپنے ذوق ومزاج کے مطابق بہت سے ابواب قائم کئے ہیں، ایک باب یہ بھی ہے۔باب من ترك بعض الإفتاء مخافة أيقصر فهم بعض الناس فيقعوا في أشد منه (بعض پسندیدہ چیزیں اس لئے چھوڑی جائیں کہ لوگ صحیح طور پر نہ سمجھیں گے تو اس سے سخت بات میں پڑ جائیں گے)اور ایک باب یہ بھی قائم کیا باب من خص بالعلم قوما دون قوم کراھیۃ لایفھموا (بعض باتیں بعض کو بتانا اور دوسروں کو نہیں اس ڈر سے کہ وہ سمجھ نہیں سکیں گے)اس باب کے تحت امام بخاری نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا نیز ایسی احادیث کا تذکرہ کیا ہے جن میں یہ آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض باتیں عام صحابہ کو بتانے سے منع کیا کہ لوگ غلط مطلب وتاثر لیں گے۔

اور پہلے باب کے تحت امام بخاریؒ نے حضرت عائشہ کی اسی حدیث کو ذکر کیا ہے جو صحیح بخاری ودیگر کتب حدیث میں حسب موقع مختصر ومفصل آئی ہے۔

پوری بات کچھ یوں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خواہش تھی کہ بیت اللہ کے اندر نماز ادا کریں جہاں کافی ازدحام وکشمکش کی صورت ہوتی تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حطیم میں نماز پڑھائی اور فرمایا کہ یہ بھی بیت اللہ ہی کا حصہ ہے، اور فرمایا کہ قریش جب بیت اللہ کی تعمیر کر رہے تھے خرچ کم پڑنے کی وجہ سے اس حصہ کو بیت اللہ کی عمارت سے باہر کر دیا۔

اس پر حضرت عائشہ نے عرض کیا کہ اب آپ اس کو بیت اللہ میں شامل فرمادیں (کہ اب تو یہ ممکن ہو گیا ہے) اس وقت آپ نے جو فرمایا تھا وہ تھوڑا بہت فرق واختلاف کے ساتھ روایات میں آیا ہے مگر حاصل ایک ہے:

جی تو یہی چاہتا ہے کہ عمارت کے ایک دروازہ کی جگہ دو دروازے کرادوں۔ (ایک اندر جانے کا اور دوسرا داخل ہو کر دوسری طرف سے باہر نکلنے کا۔ اور دروازہ کی سطح فرش زمین کے برابر کردوں (کہ فی الحال دروازے کی سطح کافی اونچی ہے کہ آسانی سے اندر جانا نہ ہو سکے) لیکن بس خیال یہ ہے کہ قریش وعرب کے دلوں میں بیت اللہ وکعبۃ اللہ کی عظمت انتہائی درجہ میں رچی بسی ہے اور ابھی مکہ کی فتح اور پوری قوم کو اسلام لائے زیادہ وقت نہیں ہوا ہے تو ڈر یہ لگتا ہے کہ نیک نیتی اور اہم مصالح کے تحت بیت اللہ کی عمارت کو ہاتھ لگانے۔ اس کو منہدم کرنا اور نئے سرے سے نئی شکل میں بنانا، ۔ اس سے کہیں یہ بھڑک نہ جائیں، اور اس کے نتیجے میں ان کی بددلی کی کوئی بری شکل نہ پیش آجائے۔ (جو خدانخواستہ ارتداد کو بھی پہنچ سکتی تھی) (جامع الاول بواسطہ صحاح ستہ۔ حدیث ۶۹۰۷ و حدیث ۱۵۱۸)

آپ کے اس ارشاد وخواہش کا علم حضرت عبداللہ بن زبیر کو حضرت عائشہؓ سے ہو گیا تھا، چنانچہ جب حجاز وغیرہ میں ان کی حکومت قائم ہوئی تو انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خواہش کی تکمیل کردی، لیکن ان کی شہادت کے بعد حجاج بن یوسف نے بیت اللہ کو حسب سابق تعمیر کروایا جس میں اس کا بھی دخل تھا کہ عام طور سے صحابہ وتابعین وغیرہ کو اس کا علم نہیں تھا بعض حکمرانوں کے سامنے میں بات آئی تو انہوں نے یہ کہا اب ابن زبیر کے عمل وتصرف کی وجہ سے مسجد میں آگئی، مگر اس کے بعد بھی کسی نے کچھ ردوبدل نہیں کیا، معروف ہے کہ امام مالک سے معلوم کیا گیا تو امام مالک نے منع فرمایا۔

خلاصہ یہ کہ داعیان دین وخادمان دین کو اپنی تحریر وتقریر میں حکمت ومصلحت کا بھی لحاظ رکھنا ضروری ہے، ایسی باتیں اور ایسا انداز درست نہیں جو نہ صرف دوسروں کے لئے مضر ہو بلکہ خود اپنے لئے بھی نقصاندہ ہو، اس اعتبار سے کہ اپنا اعتبار واعتماد بھی لوگوں کے درمیان مجروح ہو۔

OOO